جلد (۳) اپریل ۱۹۰۲ء نمبر (۱)

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہواری مجموعہ



مضامین نثر

مضامین نظم

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبد القادر بی۔ اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

...رسالہ ہر انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور مضمون نگاروں کے علاوہ ایک معقول تعداد نئے اور ہونہار اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کے پاس ہوئے اصحاب جن کو آج تک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا۔ شوق سے اسکے بنانے میں شریک ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کی طرف سے ہوں۔ مضامین علمی دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کیجاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں ہو۔ رسالہ کا حجم ۱۸×۲۲ کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ صفحہ کا ہے۔ **قیمت** عمدہ دبیز ولائتی کاغذ پر بلا محصول تین روپیہ ۔ اور دوم درجے کے کاغذ پر دو روپیہ ہے۔ اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی چھپائی اور لکھائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں پایا جاتا۔ محصول ڈاک دونوں صورتوں میں ۶ آنے ... درخواست خریداری کے ساتھ ... کی قیمت ... پیشگی ... ایل کی اجازت آنی چاہئے۔ مابعد کا کوئی ... نمونہ کے پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ ... آنے چاہئیں۔ (شیخ عبدالقادر)

شرح اُجرتِ اشتہارات

مخزن اشتہارات کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ اسکے خریداروں کی لمبی فہرست میں پنجاب کے علاوہ ... بھی ہیں۔ اور صوبجات متحدہ و اودھ کے بھی۔ اضلاع دکن ... حیدرآباد میں بھی بکثرت بکتا ہے۔ اور وہاں کے روسا کی ایک کثیر تعداد اسکے قدردانوں میں ہے۔ شمالی ہندوستان کے بھی معزز ترین مسلمانوں کے اسمائے گرامی اس فہرست میں شامل ہیں۔ اس لئے اسکے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیت اشتہار کا اندازہ کر سکینگے۔ ایک سہ ماہی کے لئے آزما کر اگر فائدہ نظر آئے تو سال بھر کا معاہدہ کریں۔ اُجرت اشتہارات فی صفحہ (سال بھر کے معاہدہ کے واسطے) ۳۰ ششماہی کے لئے ۱۶ اور سہ ماہی کے لئے ۹ روپیہ فی نصف صفحہ سال بھر کے واسطے ۱۶ روپیہ ششماہی کے واسطے ۹ اور سہ ماہی کے لئے ۵ ... اتفاقی اشتہارات کے لئے ۲ آنہ ... اس شرح میں کمی کی گنجائش نہیں۔ (شیخ عبدالقادر مالک و ایڈیٹر)

جامع سکندری

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

زمین اُسوقت سے آج تک آفتاب عالمتاب کے گرد پورے پانچسو ساٹھ چکر لگا چکی ہے۔ ... عالم کا شیخ خطۂ کشمیر دلپذیر میں ایسے عجیب غریب طریقہ پر ہوا جس کی حقیقت افسانے ... دلچسپی سے کم نہیں۔ ایک شخص مسمّٰی ریچن شاہ صغر سنی میں ملک تبت سے یہاں آیا ... ہمت کی بلندی اور طبیعت کی دلاوری سے ایسا چڑھا کہ اورنگ سلطنت پر قدم رکھ کے ... ملک دُنیا سے فارغ ہو کر عالم عقبیٰ کی تسخیر کا شوق اُس کے دل میں گد گدایا۔ پہلے ... مائل ہوا کہ ملک آخرت کی کوئی راہ بتائیں۔ مگر یہ لوگ اُسے ہیچ اور نو دولت ... کر نہایت تنگ دلی اور تنگ مزاجی سے پیش آئے تھا ایک صاحب نامی پنڈت ... اپنے زمانہ کا مشہور کشمیری ودیادان تھا اس نے قسم کی درخواست سنے ایسا برافروختہ ... ہو گیا کہ نئی دُنیا کی راہ بتانے کے ایک تیشہ اُٹھا کر اُس کے پاؤں پر رسید کیا کہ اس دنیا ... کے کام کا بھی نہ رہے۔

قدرتِ الٰہی کا اتفاق دیکھئے کہ ایک روز نو ... تڑکے وہ اپنے محل سے جھانک رہا ... تو دریا پار ایک فقیر کو قبلہ رو کھڑے نماز صبح میں مصروف پایا۔ پہلے تو اس کے عجیب غریب ... ہیئت کو تعجب سے تکتا رہا پھر آدمی دوڑا کر طلب کیا۔ اُن ایام میں مذہب اسلام ترکستان اور ... و تبت کی حدود میں آپہنچا تھا اور ان ممالک سے کوئی نہ کوئی شخص بھولا بھٹکا کشمیر میں ... آپہنچتا تھا۔ چنانچہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شخص بلبل شاہ جو ایک خدا رسیدہ ... قلندرانہ وضع کا آدمی تھا اور بلبل سے بہت محبت رکھتا تھا اور اسکو اپنے سر پر بٹھا چھوڑتا ...

تھا۔ کاشغر کی طرف سے مع چند مریدوں کے کشمیر جنت نظیر کی سیر کو آنکلا تھا۔ جانبین کے حالات کھلنے پر رینچن شاہ نے اپنا سوال پیش کیا کہ مجھے بھی عالم جاودانی کا راستہ بتا ئیے یہاں کیا دیر تھی بسم اللہ کہکر اُسے بھی اپنے حلقۂ مریدانِ خاص میں شامل کرلیا اور اس طرح شاہ کی ارادت مندی اور گدا کی روشنضمیری سے اسلام کا بیج اس سرزمین میں بویا گیا۔

خدا کے دین کا موسٰے سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ بیج قابل زمین میں پڑا تھا کہ اُسکا پودا موافق آب وہوا کے اثر سے ایسا بڑھا اور بچہ کہ دو پشتیں بھی گذرنے نہ پائی تھیں۔ کہ نئے مذہب کے پیرؤں کے لئے ایک عظیم الشان عبادت گاہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور جامع سکندری کا ظہور ہوا۔ اس شاندار بنا کا سہرا سلطان سکندر (جس کو سکندر ثانی اور سکندر بُت شکن* بھی کہتے ہیں) کے سر رہا۔

یہ عمارت کشمیر کی ایک بڑی مشہور زیارت گاہ ہے اور اپنی مضبوطی اور کہن سالی کے ضرب المثل ہو گئی ہے۔ یہ شہر ہری پربت کے قریب جس پر ایک خوشنما قلعہ بنا ہوا ہے واقع ہے۔ آج کل اس پر ایک اُداسی کا عالم ہے کہ نظارہ بین آنکھ کو نگاہ اوّل میں مطمئن ہونا مشکل ہے۔ مگر اس میں بہت سی خوبیاں ہیں جو نظر غائر کی محتاج ہیں اور جنکی قدر سوائے درد آشنا دلوں کے کوئی نہیں جانتا۔ جنوبی دروازے سے اندر داخل ہو کر معلوم ہوتا ہے کہ مسجد ایک بڑے وسیع مربع [illegible] صورت میں ہے جسکے اندر ایک اور مربع رکھا ہوا ہے جو اسکا صحن ہے دونو مربعوں کے درمیان تعمیر ہے جسکے اطراف شمالی وجنوبی ۳۶۰ فیٹ لمبے اور ۱۲۰ چوڑے ہیں۔ اطراف شرقی وغربی ۲۵۴ فیٹ طولانی ہیں مگر شرقی کا عرض ۲۶ فیٹ اور غربی کا ۶۰ فیٹ ہے۔ اضلاع شمالی وغربی کا بیرونی طول ہیں۔

* سلطان سکندر سنہ ۱۳۸۶ء میں تخت نشین ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کے زمانہ میں بہت سے مندر اور بتخانے مسمار کئے گئے اور بہت سی عمارتیں منہدم کی گئیں۔ جس سبب سے اسکا نام بھی محمود غزنوی کی طرح بُت شکن ہوگیا +

رو بھی تخمینہ کیا جو ۱۴۵ اور ۱۵۰ گز پایا گیا - اِس تمام وسعت میں کئی کئی فیٹ کے فاصلے پر ۲،۲ نہایت سڈول اور پہلودار ستون نفیس اور مصفا سنگ سلیمانی کی چوکیوں پر استادہ ہیں جو ایک بھاری چھت کو کوئی دوسو پچاس سال سے اپنے سر پر اُٹھائے ہوئے ہیں - طول ہر ایک کا ۱۰ گز شرعی اور عرض سوا گز شرعی ہے ان میں سے ۳۴ ستون جو چار طاقوں میں ہیں ساڑھے ساٹھ فیٹ سے کم نہ ہونگے - انکی خموش صفوں کی صفیں دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح سے پیشتر کی اُمت کے چیدہ چیدہ گراں ڈیل اور قوی ہیکل جوانوں کی باقاعدہ فوج ہے کہ ایک سکوت کے عالم میں کسی پُر رعب جرنیل کے حکم کے انتظار میں مُہر بہ دہان کھڑی زبان حال سے انگشت شہادت کی طرح وحدانیت - اطاعت اور راستی کی گواہی دے رہی ہے - سقف کی شہتیریاں چار پہلو ہیں اور اس صفائی سے ان عمودی ستونوں پر چسپاں کی گئی ہیں کہ جوڑ دکھائی نہیں دیتا اور ہر طرف زاویہ قائمہ کی قطاروں کی قطاریں بنتی چلی گئی ہیں - یہ شہتیریاں اور ستون دامن ہمالیہ کے نازپروردہ دیوداروں کے ہیں اور ستون اس صناعی سے اپنے اپنے قالب میں نصب کئے گئے ہیں کہ باوجود سالہا سال گذرنے اور صدہا زلزلوں کے انکے مرکز ثقل میں سر مو فرق نہیں آیا - جو انکے صناعوں کی کاریگری کا بین ثبوت ہے - ایک مشہور سیاح مسٹر مارکروفٹ اپنے سفرنامہ کشمیر میں سنہ ۱۸۲۰ء میں تحریر کرتے ہیں کہ باوجود ایک سو برس گذرنے کے کوئی ستون ایک ذرا بھی اپنے عمود سے نہیں سرکا اور نہ کسی کو گھن یا مکھی نے چاٹا ہے - آج اس پر ایک صدی اور گذر چکی ہے مگر یہ دیوداروں کے دیو سا لخت جگر اُسی دم وخم میں نظر آتے ہیں اور اُنکے بشرے سے کسی پر بھی ذرا ماندگی اور تکان کے آثار نمایاں نہیں گو گذشتہ ڈھائی صدیوں سے کسی نے انکی خبر گیری تک نہیں کی -

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا میرا نہ اک تارِ کفن بگڑا

دیواریں بڑی سادہ مگر مضبوط اور پختہ - نیچے سے پتھر اور اُوپر سے ریختہ کی ہیں بعض

لوگوں نے شکوک پیدا کئے ہیں کہ ستونوں کے پاداوں اور مسجد کے بناؤ میں شکستہ مندروں کا مصالحہ صرف ہوا۔ ستونوں کے لئے تو خود ایک مشہور انگریز سیاح نے جواب دیدیا ہے کہ ان کی چوکیوں کی وضع اور ساخت اس قسم کی ہے کہ مندروں کے پتھروں سے انکی موجودہ صورت پیدا نہ ہوسکتی مگر دوسری بات کا نہ کوئی ظاہری ثبوت ہے اور نہ کوئی جواب۔ چھت کشمیری وضع کی ڈھلوان ہے جس پر بھوج پتر ڈال کر مٹی سے مضبوط کرتے ہیں۔ جس پر گھاس اور دوسری خودرو پیداوار بہار کے دنوں میں ایک سبزہ زار کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ گنبد بھی اس مصالحہ کا ہے اور اس کی ترکیب عجیب ہے۔ جو اس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ لکڑی کا ایک مربعہ چوکھٹا لیں اور اس پر ایک دوسرا مگر ذرا چھوٹا چوکھٹا اس طرح رکھا جائے کہ موخر الذکر کے بیرونی پہلو اول الذکر کے اندرونی پہلوؤں سے مطابق ہوں علےٰ ہذا القیاس چوکھٹے پر چوکھٹا رکھے چلے جائیں تاوقتیکہ ایک مخروطی قبہ سا تیار ہوجائے۔ اس پر ایک لمبا ستون استادہ کرتے ہیں جسکے سر پر ایک سنہری کلس کاسہ واژگوں کی طرح معلق کرتے ہیں۔ اس سے یہاں کی تمام بڑی بڑی مساجد اور مقابر مزین ہیں۔ ان قبوں سے انکی ہیئت چین کے معبدوں سے بہت کچھ مشابہ ہوجاتی ہے اور ہندوستان کی مساجد سے ایسی غیر مشابہ کہ اگر کوئی مسافر بے پوچھے دن بھر مسجد کی تلاش میں بھٹکتا پھرے تو مشکل سے اُسے کوئی ملیگی اگرچہ کوئی کوچہ بھی ایسا نہیں جس میں ایک دو مسجدیں نہ ہوں۔

زمانہ کے حوادث اور وقت کی غارتگری کا ہاتھ ایسا زبردست ہے کہ اس سے کسی چیز کو بھی امان نہیں اور اس لئے کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ اس قدر قوی دیوار دلہا اور بوجھل چھت میں بھی جابجا قدرتی جھروکے اور روشندان پیدا ہوگئے ہیں جن میں سے برف وباران بے روک ٹوک بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہوتی ہیں اور مسجد کی رہی سہی رونق پر بھی پانی پھیر دیتی ہیں۔ زمانہ کی دست برد کے علاوہ یہاں کئی ایک اسباب عمارتوں کی غارت کے ہیں۔ جن میں سے سب سے قوی دشمن زلزلہ ہے۔ جس کے ہاتھوں اس ملک میں

زیادہ تر لکڑی کی عمارت کا رواج پا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ نایاب عمارت اس قسم کے لاجواب ستونوں سے سجائی گئی ہے۔ مگر لکڑی کی دشمن آگ ہے اور چونکہ ہر متنفس کے پاس اس کا مصالحہ کانگڑی کے وجود میں ہر وقت موجود رہتا ہے جس کو یہاں کے لوگ تعویذ کی طرح گلے کا ہار بنائے پھرتے ہیں۔ اس لئے آتش زدگی کی وارداتیں عام ہیں اور یہی باعث ہے کہ یہ خانۂ خدا بھی اپنا خرمنِ زندگانی متواتر کئی بار اس بلائے ناگہانی کی نذر کر چکا ہے۔

سلطان سکندر کے عہد حکومت میں قریب سنہ ۱۴۱۵ء میں بنا ہو کر یہ مسجد اپنے عروج کمال کو سلطان زین العابدین کے زمانہ میں (سنہ ۱۴۲۲ تا سنہ ۱۴۹۲ء) جو بلحاظ اقبال مندی اور انصاف پسندی کشمیر کا اکبر کہلانے کا مستحق ہے اور جس نے لوگوں کے دلوں پر بڈشاہ یعنے بڑا بادشاہ ہونے کا سکہ بٹھایا ہے پہونچی۔ اس بادشاہ اعظم کو آنکھ بند کئے چند ہی سال ہوئے تھے کہ بسم اللہ ہوئی اور جمعہ مسجد جلکر خاک ہو گئی۔ اس کے پوتے حسن شاہ نے جو اس وقت کشمیر میں حکمران تھا بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر سوائے مشت خاک کے اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ اس کے عہد میں مسجد کی بنا از سرنو رکھی گئی مگر پوری تکمیل کو قریب قریب سنہ ۱۵۰۳ء میں جب سلطان محمد شاہ دوبارہ سلطنتِ کشمیر کا مالک ہوا۔ پہونچی۔ کوئی ستر بہتر سال اور گذرے ہونگے کہ عہد مغلیہ میں بادشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں ایسی جہاں سوز آگ بھڑکی کہ ۱۲ ہزار گھر مع مسجد جامع اور دیگر عمارات کے جلکر راکھ ہو گئے۔ یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ دیار کشمیر گو سرد سیر ہے وہاں کے کسی نہ کسی شاعر کی طبیعت بھڑک نہ اٹھتی۔ چنانچہ نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

نخستیں شد بنائے مسجد از اسکندرِ ثانی ولے آنرا عمارت سوخت از تقدیرِ ربانی
پس از سالے حسن شاہ آنکہ بود از نسلِ پاکِ او بشد بانیِ ایں مسجد ہم از توفیقِ یزدانی

یعنے پہلی آتشزدگی سے ایک دو سال بعد۔

وے از ہر دو جانب بے ستون آراست بے نقش کہ از ابراہیم احمد ماگرے شد راست تا دانی

زہجرت نہ صد و نہ بُود تا دورِ محمد شاہ کہ این جنت سراشد زینتِ دینِ مسلمانی

دوبارہ جلنے کے لئے روز بھی عید سعید کا وقع ہوا اور کیوں نہ ہو عید کی عید اور آتشبازی کی آتشبازی

بتاریخ ہزار و بست و نہ از ہجرت سیّد بروزِ عید روزہ سوخت در نوبتِ ثانی

ملک حیدر رئیس الملک در عہد جہانگیری نہادہ نو بنائش باز روز عید قربانی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان بھی کسی زمانہ میں ایسے دست و پاشکستہ نہ تھے جیسے آج کل ہیں۔ ایسی عالیشان عمارت کا جلنا اور ڈھائی مہینہ میں پھر از سرِ نو بنیاد کی پتھر کا رکھ دینا کوئی آسان بات نہیں۔

آخری دفعہ ۱۰۹۳ھ ہجری میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دورانِ سلطنت میں پھر ایسی عالمگیر آگ پھیلی۔ کہ محلہ کاوڈارا کی مع ہزار ہا گھروں اور جامع سکندری کے صفائی ہوگئی اس واقعہ کے بعد فوراً ہی جامع مسجد نے پانچویں دفعہ تودہ خاک سے سر اٹھایا اور اُس کے گنبد کا نشانِ ہلالی کرہ ہوا میں لہرایا۔ چونکہ تاریخ میں اس کے تین دفعہ جلنے اور عہد عالمگیر میں پانچویں دفعہ تعمیر ہونے کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت چار بار جلی ہوگی اور ایک بار کا حال کسی وجہ سے قلم انداز ہوگیا ہوگا۔ یہ آخری عمارت ابتک صحیح سلامت ہے آج ہماری پُر اشتیاق پتلیوں کی زیارت گاہ ہے اور اسکا سنگ سنگ اہل دل کے دلوں کا سویدا ہے۔ صحن کے عین وسط میں جہاں اور مساجد میں عموماً تالاب ہوا کرتا ہے۔ ایک مختصر سی موزون بارہ دری ہے جو خطیب کی خاطر بنائی گئی ہے کہ چاروں طرف کے لوگ صدائے اللہ اکبر بآسانی سُن سکیں۔ کیونکہ اس جامع میں پورا ساٹھ ہزار آدمی نماز گذار سکتا ہے اور اس انبوہ کثیر کو آواز سُنانا کچھ آسان کام نہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جب فتح پنجاب سے فارغ ہوا تو تسخیر کشمیر کا رُخ کیا۔ اس وقت سے اُس نے حکم دیدیا کہ کوئی مسلمان اس مسجد میں گھسنے نہ پائے اور اُسکو چاروں طرف سے مقفّل کردیا کہ اہل اسلام کو جمعیت کرنے کا موقعہ نہ ملے اس طرح یہ عبادتگاہ سالہا سال تک بغیر خبر گیری کے بند پڑی رہی۔ اور اہل اسلام ایک گونہ

اس کی غور و پرداخت کی فکر سے سبکدوش ہو گئے۔ سے

نہ لٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا ‏ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

تھوڑی مدت گذری جب اسے کھلوایا گیا تو جس قابلِ رحم حالت کو یہ پہنچ چکی تھی وہ ان حروف سے ظاہر ہو گی جنکو میں جنوبی دروازہ کے بائیں طرف کے کتبہ سے اخذ کرتا ہوں۔

"تا ہم اینکہ از مدت بسیار سال بسبب مرورِ زمان و برف و باران قریب بہ انہدام رسیدہ بود۔ چوں سقفہا و باہہائش تمام خراب و منہدم بودند بلکہ چندیں ستونہائے سقفش افتادہ کسے در پرداختِ آں نشدہ بود"۔ اسیوقت کوئی ایک لاکھ روپیہ بذریعہ چندہ وصول کیا گیا جس میں مہاراجہ بشیر سنگھ سرگباشی نے بھی اپنی فیاضی سے چند ہزار روپیہ عطا فرمایا اور اپنے محکمہ تعمیرات کے ملازموں کی خدمات مفت سپرد کر دیں اور شکستہ مقامات کی ترمیم کی گئی۔ اگرچہ لاکھ روپیہ بڑی بروقت امداد تھی مگر مسجد کی عمارت کے مقابلہ میں اسکی حقیقت اونٹ کے منہ میں زیرہ کی مثال سے کچھ زیادہ نہ ہوئی ٭۔ اس کام کو سرانجام ہوئے قریب بیس سال ہو چکے ہیں۔

اب میں اس چیز کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسکا بیان باقاعدہ طور پر سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا کیونکہ اندر داخل ہوتے وقت پہلی چیز جو نگاہ کو اپنا گرویدہ بناتی ہے یہی ہے۔ جنوبی پھاٹک کے باہر دائیں جانب سنگ موسیٰ کے مجلا قد آدم آئینہ پر ایک دلنشین تحریر فارسی ایسی خوشخط اور جلی حروف میں کندہ ہے کہ بلحاظ ظاہری و معنوی۔ آنکھوں سے ملنے اور دل میں نقش کرنے کے قابل ہے۔ یہ شاہجہان کا ایک فرمان ہے جو بنا پر اطلاع خاص و عام بطور اشتہار اس مرجع خلائق مقام پر نصب کیا گیا تھا۔ شاہجہان نہ رہا مگر اشتہار آج بھی برابر آنے جانے والے پر اپنے مشتہر کی شان و شوکت اور طرزِ حکومت کا اعلان کرتا ہے اور ان ایام کے اندازِ حکومت اور طرز معاشرت پر ایک عجیب روشنی ڈالنے کے علاوہ یہ بھی ہم خو

٭ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب کے وقت اس کی تعمیر ۱۱ سال تک جاری رہی۔ گر یہ مبالغہ سے خالی نہیں تو اسی سے اصلی مصارف کا اندازہ ہو سکتا

ایک ایسی نادر چیز ہے کہ یہاں اسکا بالتفصیل درج نہ کرنا جامع کشمیر کی اس شبیہہ کی نصف قیمت پر پانی پھیر دینا ہے ۔

اللہ اکبر

شاہ جہان بادشاہ عادل غازی

نقل فرمان سعادت نشان حضرت سلیمان مکان صاحب قران ثانی کہ بتاریخ ہفتم اسفندیار غرہ ماہ الٰہی حسب التماس کمترین خانہ زادان احسن اللہ المخاطب بظفرخان در باب برطرف نمودن بعضے امور کہ در زمان صوبہ دار سابق در بلدہ دلپذیر کشمیر شدہ بود و باعث خرابی رعایا و سکنۂ این دیار بود شرف ورود دریافت :—

چوں ہمگی ہمت والانہمت مصروف و معطوف بر رفاہیت خلق است بنابرین بعض امور کہ در خطۂ دلپذیر کشمیر باعث آزار سکنۂ آں دیار مے شد حکم فرمودیم برطرف باشند۔ از جملۂ آں نقمات یکے آن است کہ وقت چیدن زعفران مردم را بعنف مے بردند کہ زعفران بچینند و قلیلے نمک بعلت اجورۂ آں باں مردم مے دادند ازیں جہت باں جماعت آزار بسیار میرسید۔ حکم فرمودیم کہ تکلیف چیدن زعفران اصلا بکسے نکنند۔ آنچہ تعلق بخالصہ شریفہ داشتہ باشد مزدوران را رضی ساختہ اجورۂ واقعی بدہند و آنچہ تعلق بجاگیردار داشتہ باشد گل زعفران را بجنس حوالہ جاگیردار نمایند تا بہر طریقے کہ خواہند بچینند۔ مقدمہ دیگر آں است کہ در زمان بعضے از صاحب صوبہائے کشمیر بر سر خروار شالی دو دام بعلت ہیزم مے گرفتہ اند و در عمل اعتقاد خان چہار دام باں علت بر سر خروارے گرفتہ مے شد۔ چوں ازیں جہت آزار بسیار برعایا مے رسید بنابرین حکم فرمودیم کہ بالکل رعایا را بطلب ایں وجہ معاف دارند۔ و بعلت ہیزم ہیچ چیز نگیرند۔ مقدمہ دیگر آں است کہ دہے کہ جمع آں زیادہ از چہار صد خروار شالی بودہ باشد ازاں دہ دو گوسفند حکام آنجا ہر سالہ مے گرفتہ اند و اعتقاد خان در ایام صاحب صوبگی خود بجائے گوسفند بر سر ہر گوسفندے شصت و شش دام مے گرفتہ

چوں ازیں جہت نیز بر رعایا آزار تمام میرسید بالکلیہ حکم فرمودیم کہ برطرف باشد نہ گوسفند بگیرند
نہ نقد بایں علت۔ و رعایا را از گرفتن ایں وجہ معاف دارند۔ دیگر اعتقاد خاں در ایام صاحب
صوبگی خود سر اسری نمودہ بر سر ہر تلاے خواہ جوان خواہ پیر خواہ خورد سال ہفتاد و پنج دام
مے گرفت و معمول قدیم آں بودہ کہ بر سر جوانے شصت دام و بر سر پیرے دوازدہ دام و
بر سر خورد سالے سی و شش دام میگرفتہ اند۔ حکم فرمودیم کہ بدستور سابق را معمول داشتہ
بہ عینے کہ اعتقاد خاں کردہ برطرف دانند و بہ مقتضائے آں عمل نکنند۔ مقدمہ دیگر آں است کہ
صاحب صوبہا در وقت میوہ در ہر باغ و ہر باغچہ کہ میوہ خوبی کہ گمان داشتہ اند کسان خود را
تعین مے نمودہ اند کہ آں میوہ را بہ جہت آنہا محافظت نمایند و نمے گذاشتہ اند کہ صاحبان
آں باغہا و باغچہا آں میوہ را متصرف شوند زیں جہت آزار بسیارے بآں جماعہ مے رسید
چنانچہ بعضے ازاں مردم درختہائے میوہ را در و ساختہ اند حکم فرمودہ ایم کہ ہیچ صاحب صوبہ
فرق میوہ باغ و باغچہ کسے نکند۔ مے باید کہ حکام کرام و دیوانیان کفایت فرجام و عمال حال
و استقبال صوبہ کشمیر ایں احکام جہاں مطاع را مستمر و ابدی دانند و تغییر و تبدیل بآں راہ
ندہند و ہر کس کہ تغییر و تبدیل راہ دہد بہ لعنت خدا و بغضب بادشاہی گرفتار خواہد شد۔ فی تاریخ
بیست و ششم درماہ آلہی"۔ تاریخ قدیم کے طالب علم کے لئے خاص دلچسپی کی باتیں دروازہ
شرقی کی طرف ایک ٹوٹی پھوٹی باولی اور شکستہ نہر کے آثار ہیں دکھائی دیتی ہیں جو خس و خاشاک
سے پُر اور مٹی پتھروں سے بھرپور ہیں۔ نہر کو سلطان زین العابدین نے جس کا مختصر سا اشارہ
اُوپر آچکا ہے پہلے پہل مسجد میں آب رسانی کی غرض سے تعمیر کیا۔ اس با اقبال بادشاہ
نے نالہ سندھ کو کاٹ کر گاندربل کی پہاڑی کے دامن میں پھر آیا جو یہاں سے قریب ۱۵ میل
کے فاصلہ پر واقع ہے اور پھر نالہ کی سیدھ صحن جامع میں لاکر چھوڑا۔ اور یہاں کی قدرتی نشیب
و فراز زمین میں جہانتک ممکن ہوسکا اُسکو ایک خط مستقیم سے ادھر اُدھر نہیں ہونے
دیا۔ دو رویہ کناروں کو پتھروں اور ریختہ سے مضبوط کیا جسکے قلابے ابتک نسیم باغ اور اسکے

نواح میں موجود ہیں۔ اس پر ایک لاکھ روپیہ کے مصارف ہوئے اور اس سبب سے اُس کا نام لکھی ندی پڑ گیا۔ مدتوں تک ارد گرد کے گھر اس سے سیراب ہوتے رہے مگر اب عہد رنجیت سے چشم بخیل کی طرح بند پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۲۹۸ہجری میں مسجد کی آخری مرمت ہوئی تو اس میں سے بھی کچھ کوڑا کرکٹ صاف کیا گیا ہوگا۔ جیسا کہ قطعہ ذیل سے ظاہر ہے

از لطف حق سید حسین آورد جو کوشش ۔ چون شاہ زین العابدین زینسان بدین طالع رسید
سرکشیدہ آب جو خضر خرد تاریخ گفت ۔ نہر از حسین منطقی در مسجد جامع رسید

سید حسین قادری منطقی وُہ صاحب ہیں جنکے سپرد اس مسجد کی آخری مرمت ہوئی تھی اور افواہ ہو کہ بہ حیثیت منطقی ہونے کے بیت المال میں سے جیب خاص پُر کرنے میں اُس نے کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔

لکھی ندی کے بعد باولی کا ذکر چھیڑنا باولا پن سے کم نہیں اور یہی وجہ ہو کہ عموماً مورخوں اور سیاحوں نے اس سے چشم پوشی کی ہے۔ مگر کیا بلحاظ عمارت اور کیا بلحاظ فیض رسانی اس نے اپنے وقت میں کم خدمت نہیں کی۔ کیونکہ جب برف کے موسم میں یخ بستہ ہو کر نہر کا خون سفید ہو جاتا ہوگا تو اس کا شیر گرم پانی آب حیات سے کم نہ ہوگا مگر آج کل اس نے بھی اپنے ہمنشین جوئے آب کو سرد ہوتے دیکھ کر کلیجہ پتھر کر لیا ہے اور اس کی یاد میں رو رو کر آنکھ موندلی ہے۔ محلہ کا کوڑا کرکٹ سالہا سال سے اس میں ڈالا جاتا ہے اور تعجب کا مقام ہے کہ آج تک پُر ہونے میں نہیں آئی۔ یہ بھی ایک مربع نما ہشتی تعمیر ہے آج جس کی گہرائی کا پتا لگانا مشکل ہے۔ اس کے شمالی ضلع کی طرف پتھر کی عمدہ سیڑھیاں ہیں جو سطح آب تک برابر جاتی تھیں۔ اسکے ہر ایک ہشت ضلع کا طول ۱۰ فٹ ہے۔ دو منزلیں نمودار ہیں جنمیں ۲۶ خوبصورت اسلامی شکستہ محراب موجود ہیں۔ اور سیڑھیاں جہاں تک گئی پائی جاتی ہیں مسجد میں گشت کرتے ہوئے ایک پرانا شکستہ پتھر جو کسی نے یہاں سے اکھیڑ کر وہاں ڈال دیا ہے۔ میری نظر پڑا۔ اس پر اس کی بنا کا قطعہ کندہ ہے جس سے اس چاہ کے بنانے والے کا پتا اور اس کی انگلیاں

کے متی میں ملنے کا اچھی طرح پتہ چلتا ہے۔ اس کا بانی اسم بامسمّے کوئی شخص محمود نامی ہے۔

برآمد چشمۂ فیضِ الٰہی — بحسنِ سعیِ مشتِ خاکساراں
بتوفیقِ خدا ایں کارِ محمود — گرفت انجام و مشکل گشت آساں
خلوصِ نیت و صدقِ ارادت — شدہ صرفِ بنائش از دل و جاں
ازیں خوش چشمہ بانی چشم دارد — کہ یابد شستشو طومارِ عصیاں
گناہِ خلق گیرد شستہ زیں آب — کہ باشد منبعش دریائے غفراں
بود وجہ کرایہ از دکاکیں — پئے ترمیم حوضِ فیضِ احساں
چو نامم در ازل محمود کردی — الٰہی عاقبت محمود گرداں
بدریائے تفکر رفتہ آگاہ — پئے تاریخ ایں فرخندہ بنیاں
۱۱۵۲ھ
خرد گفتا کہ جاری فیض ما باد — ہمیں تاریخ بنویس اے سخنداں

سو سال سے سیّاح آتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں پُرافسوس کلمات کہکر چلے جاتے کہ ایسی مفید اور فرد یادگار لوگوں کی کوتاہ دستی۔ بے توجہی اور لاپرواہی سے ایسی کس مپرسی اور ردی حالت میں پڑی ہے ہمیں اس پر صرف اس قدر زیادہ کرنا ہے کہ ایسی پرانی عمارتوں میں عموماً کبوتروں کے نشیمن ہوتے ہیں جو انسان کی عوض خدمت ہونیکی حیثیت میں حق کی صداؤں کی گونج کو برقرار رکھتے ہیں۔ مگر حیرت ہے اسکی بوسیدہ چھت میں کوّوں نے آبستی ڈالی ہے اور کسی کے آنے پر بجائے خائف ہوکر اُڑ جانے کے اُس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں کہ ارے تم ہمارے امن عامہ میں خلل انداز ہوتے ہو؟ اگر شخصی افعال کی بھلائی برائی ہمنشینوں سے کھلتی ہے تو قومی عروج و زوال عمارتوں سے روشن ہوتا ہے۔ پس اس قسم کی خستہ اور شکستہ عمارتیں ہماری قوم کی خستہ حالی کی بولتی چالتی تصویریں ہیں اور ہم نے ایک زندہ قوم کی زندہ یادگاریں [illegible] دیکھنے کے بجائے ایک مُردہ قوم کی مُردہ نشانیاں بنا رکھی ہیں*

صادق [illegible]

طلسمِ خیال

پندرہ برس کی عمر میں مجھ کو اپنے وطن سے کوئی سو میل کے فاصلہ پر ایک گانو میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اُس گانو میں پہنچکر اگلے دن صبح کے وقت میں ٹہلتا ٹہلتا جنگل میں چلا گیا۔ ستمبر کا مہینہ تھا مگر اُس صبح میں گرمی اور روشنی ماہ جولائی کی صبح کی سی تھی۔ جنگل میں شاہ بلوط کے درخت چند اخروٹ کے درختوں کے ساتھ ملے جُلے کھڑے تھے اور میرے سر پر اُن کا نہایت گنجان سایہ تھا۔ زمین سخت اور ناہموار تھی اور اس پر جھاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے کم سن درختوں کے جُھنڈ چھائے ہُوئے تھے اور صرف ڈنگروں کے رستے ہی ان جھاڑیوں میں سے جاتے تھے۔ جس رستے اتفاق سے میں گیا وُہ ایک شفاف چشمے پر پہنچا۔ جس کے کنارے پر ہری ہری گھاس کا حاشیہ تھا۔ اِس گھاس میں صبح بہار کی سی شاداب سبزی تھی۔ چشمے پر شاہ بلوط کے ایک بڑے تناور درخت کے تنے کا سایہ تھا۔ سُورج کی ایک کرن اکیلی نیچے آئی اور پانی میں سنہری مچھلی کی طرح کھیلنے لگی۔

بچپن ہی سے مجھے چشموں کے دیکھنے کا بڑا شوق رہا ہے۔ یہ پانی ایک گول ظرف میں کھڑا تھا۔ یہ ظرف چھوٹا سا تھا مگر گہرا۔ اس کے اندر پتھر جمے ہُوئے تھے۔ بعض پتھر ہری ہری کائی سے ملبوس تھے بعض بالکل برہنہ مگر طرح طرح کے رنگوں کے۔ سُرخی مائل۔ سفید اور بھورے۔ تہ پر موٹا موٹا ریت تھا جو اُس اکیلی کرن کی روشنی میں چمکتا تھا اور چشمے کو غیر مستعار روشنی سے منور کرتا تھا۔ ایک جگہ پانی کا اُمنڈنا ریت کو سخت حرکت میں لاتا تھا لیکن اس طرح کہ چشمہ تاریک نہ ہوتا تھا اور نہ اُس کی سطح کی آئینہ وار صفائی میں فرق آتا تھا۔ مجھے ایسا خیال ہوا کہ گویا کوئی زندہ مخلوق جو شاید اس چشمے کی پری ہو ایک حسین نوجوان نازنین کے روپ میں پانی کی کائی کا باریک لباس پہنے ہُوئے۔ قوس قزح کے

پتھروں کی ٹیک لگائے ہوئے۔ اپنا بے مہر ۔معصوم - اور بے جذبہ چہرہ دکھاتی ہوئی نکلنے کو ہے۔ اگر وُہ اِن پتھروں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی اپنے گورے گورے پاؤں ننھی ننھی لہروں میں ملتی ہوئی اور پانی کو اُچھال کر دُھوپ میں چمکاتی ہوئی نظر آئے تو دیکھنے والا مسرت اور خوف سے کس قدر کانپے! جہاں کہیں وُہ سنہرے پھولوں پر اپنے ہاتھ رکھدے گی وُہ فوراً شاداب ہوجائینگے گویا اُن پر صُبح کی شبنم پڑگئی ۔ پھر وُہ ایک چتر کرہستن کی مانند کام میں مصروف ہوکر مُرجھائے ہُوئے پتے - کالی دار لکڑی کے ٹکڑے پُرانے شاہ بلوط کے پھل اور اناج کے دانے جو ڈنگروں کے مُنہہ سے پانی پیتے پیتے گرگئے ہیں چشمے سے نکال ڈالیگی حتیٰ کہ چمکتا ہوا ریت روشن پانی میں ہیروں کے خزانے کی مانند دکھائی دینے لگیگا ۔لیکن اگر تماشائی بہت ہی قریب آجائیگا تو اُس کو صرف موسم گرما کے مینہہ کے قطرات ہی اُس جگہ پڑے چمکتے ہُوئے ملینگے جہاں اُس نے اُس نازنین کو دیکھا۔

جہاں اس شبنمی پری کو ہونا چاہیے تھا وہاں سبزے کے حاشیے پر لیٹ کر میں آگے کو جھکا اور پانی کے آئینے میں دو آنکھیں میری آنکھوں سے چار ہوئیں ۔ یہ میری آنکھوں کا عکس تھا ۔میں نے پھر جو جھانکا تو ایک اور چہرہ نظر آیا۔ یہ میرے اپنے عکس سے پرے کو چشمے کی گہرائی میں تھا ۔ سارا چہرہ صاف نظر آتا تھا اور تاہم خیال کی مانند دھندلا تھا ۔اس نظارہ کی شکل ایک سنہری گیسوؤں والی حسین نوجوان لڑکی کی سی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں مسرت آمیز تبسم کی جھلک تھی اور تمام دُھندلے چہرے پر اس تبسم سے گڑھے پڑے جاتے تھے ۔یہاں تک کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر یہ چشمہ دُھوپ میں بخوشی انبساط سے رقص کرنے لگے اور رقص کرتے کرتے ایک عورت کی شکل اختیار کرلے تو بالکل ایسی شکل ہو ۔رخساروں کی نفیس اور دُھندلی گلابی رنگت میں سے بھورے بھورے پتے ۔ کالی دار شاخیں ۔شاہ بلوط کے پھل ۔ اور چمکیلا ریت جھلک رہا تھا۔ وُہ پیلی کرن سُنہری بالوں میں پھیلی ہوئی تھی اور نکل کر ان بالوں کی چمک بن جاتی تھی

اور اُس خوبصورت سر کے گرد ایک بارِ عظمت ڈالتی تھی۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ کیسے یکایک یہ چشمہ آباد ہو گیا اور کس قدر جلد ویران ہو گیا میں نے ایک سانس لیا تو وہ چہرہ موجود پایا۔ میں نے سانس روکا اور وہ چہرہ چل دیا۔ ہیں! یہ غائب ہو گیا یا معدوم ہو گیا؟ مجھے یہاں تک شک ہو گیا کہ وہ چہرہ کبھی تھا بھی یا نہیں۔

پیارے ناظرین: جہاں یہ نظارہ مجھے دکھائی دیا اور مجھ سے چھپ گیا وہاں میں نے کیا مزے سے خواب کے سے عالم میں ایک گھنٹہ صرف کیا! دیر تک بالکل بے حرکت اسی انتظار میں بیٹھا رہا کہ وہ صورت دوبارہ نظر آئے اور ڈر رہا تھا کہ مبادا ذرا سی حرکت یا میرے سانس کی جنبش اُس صورت کو آتے آتے ڈرا کر بھگا دے۔ اسی طرح میں اکثر کوئی دلکش خواب دیکھتا دیکھتا چونک اُٹھا ہوں اور پھر اس اُمید پر خاموش رہا ہوں کہ شاید وہ خواب پھر آ جائے۔ میں اس ہوائی وجود کی نوعیت اور صفات کے بارے میں بہت غور و خوض کرنے لگ گیا۔ کیا ہی اسے عدم سے وجود میں لایا تھا؟ کیا یہ میرے خیال کی کرتوت تھی اور اُن عجیب و غریب شکلوں کی قسم سے تھی جو بچوں کی آنکھوں کے پپوٹوں کے اندر آ کر جھانکنے لگتی ہیں؟ کیا اس کا حسن مجھے لمحہ بھر خوش کر کے فنا ہو گیا؟ کیا یہ اس چشمے کے اندر کوئی پانی میں رہنے والی پری تھی یا جنگل کی دیوی تھی۔ جو میرے کاندھے پر سے میرے پیچھے کھڑی جھانک رہی تھی یا کسی ایسی دوشیزہ کا ہمزاد تھا جس سے کسی نے بے وفائی کی تھی اور وہ عشق کے ہاتھوں جان پر کھیل گئی اور ڈوب کر مر گئی؟ یہ حقیقت میں ہی ایک پیاری لڑکی گرم جوش دل والی اور ایسے ہونٹوں والی جن کا چومنا احاطۂ امکان سے خارج نہیں ہے۔ چپکے سے دبے پاؤں میرے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی اور اپنا عکس چشمے میں ڈال رہی تھی؟

میں اسی انتظار میں بیٹھا دیکھتا رہا۔ لیکن پھر وہ نظارہ دکھائی نہ دیا۔ میں اُٹھ کر

چلا آیا مگر مجھ پر کچھ ایسا جادو سا ہو گیا تھا کہ اسی روز سہ پہر کو میں اس چشمے پر پھر گیا۔ وہی پانی اُمنڈ رہا تھا وہی ریت چمک رہا تھا اور وہی سورج کی کرن ٹمٹما رہی تھی۔ وہاں وہ نظارہ نہ تھا۔ وہاں اس عزلت آباد کا راہب ایک بڑا سا مینڈک موجود تھا اور اس نے فوراً اپنی داغدار تھتھنی کو ہٹا لیا اور سوائے اپنی لمبی ٹانگوں کے سارے کا سارا ایک پتھر کے نیچے غائب ہو گیا۔ مجھے وہ شیطان کی صورت دکھائی دیتا تھا اور میں اُسے یہ سمجھ کر مار بھی ڈالتا کہ یہ کوئی جادوگر ہے جو اس عجیب و غریب نازنین کو اس چشمے میں قید کئے ہوئے ہے۔

افسوس اور غم کے عالم میں میں گانو کو واپس آ رہا تھا۔ میرے اور گرجا کے مینار کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی پر درختوں کا ایک جھنڈ باقی تمام جنگل سے علیٰحدہ تھا۔ مغرب کی طرف کی کچھ روشنی ان درختوں پر بھی منڈلا رہی تھی اور مشرق کی طرف ان کا سایہ بھی اکیلا ہی پڑتا تھا۔ چونکہ دن بہت ڈھل گیا تھا دھوپ پر اُداسی سی چھائی ہوئی تھی اور سایہ کے چہرے پر بشاشت تھی۔ عظمت اور تاریکی اس دھیمی روشنی میں ملی جلی تھی گویا کہ دن اور شام کے ہمزاد اُن درختوں کے نیچے دوستوں کی طرح آ ملے اور ایک دوسرے کو اپنا ہم جنس پایا۔ میں نگاہِ تحسین سے اس نقشہ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک نوجوان لڑکی کی شکل دکھائی دی۔ میرا دل اس کو پہچان گیا۔ یہ وہی نظارہ تھا۔ لیکن وہ اس قدر دور اور ہوائی۔ اس دنیا سے اس قدر نرالی۔ اور جس جگہ وہ کھڑی تھی اُس جگہ کی اُداس عظمت سے اس قدر بہرہ ور معلوم ہوتی تھی کہ میرا دل پہلے سے بھی زیادہ اُداس ہو کر بجھ گیا۔ یہی خیال آیا کہ اس تک کیونکر میری رسائی ہو سکتی ہے!

میری نظر ادھر محوِ تماشا تھی کہ یکایک اُن درختوں کے پتوں پر ٹپر ٹپر بارش ہونے لگی۔ ایک دم میں ہوا روشنی سے معمور ہو گئی۔ مینہ کی ہر ایک بوندیں برستے ہوئے دھوپ کا کچھ

حصہ منعکس ہوا - اور یہ تمام باریک باریک بارش دھندسی معلوم ہونے لگی - جس میں صرف اسی قدر سکت تھی کہ روشنی کے بوجھ کو برداشت کرلے - ہوا میں قوس قزح نمودار ہوئی اس کا رنگ اس قدر شوخ تھا جیسا آبشار نیاگرا کی قوس قزح کا ہوتا ہے - اس کا جنوبی سرا ان درختوں کے آگے آکر زمین کو چھوتا تھا - اور اُس نظارہ کو اس طرح اپنا لباس پہناتا تھا کہ گویا آسمانی رنگ ہی اُس کے حُسن کا شایان لباس ہے - جب قوس قزح غائب ہوئی تو وُہ نازنین بھی جو اس قوس قزح کا جزو معلوم ہونے لگی تھی کافور ہوگئی "- کیا اس مہ جبین کی ہستی قدرت کے اس نہایت پیارے ظہور میں جذب ہوگئی یا اُس کا نفیس جسم اس رنگا رنگ روشنی میں گھل گیا ؟ مگر میں اُس کے پھر نظر آنے کی آس نہ توڑ دوں گا کیونکہ قوس قزح کا لباس پہن کر وُہ اُمید کی تصویر بن گئی ہے "-

اس طرح سے مجھے یہ نظارہ چھوڑ گیا - اور اس جُدائی کے لمحے کے بعد بہت سے پُراندوہ دن آئے - مَیں نے اُس نازنین کو جب وُہ میری نظروں سے غائب ہوگئی چشمے کے پاس - جنگل میں - پہاڑی پر - گانوں میں - پُرشبنم صُبح کو - تپتی ہوئی دوپہر کو - اور غروب آفتاب کے جادو بھرے وقت - غرض بہت ہی ڈھونڈا مگر کچھ پتہ نہ ملا - ہفتے گذر گئے مہینے گذر گئے مگر وُہ دکھائی نہ دی - مَیں نے اپنا بھید کسی کو نہ بتلایا - اِدھر اُدھر پھرتا تھا یا تنہا بیٹھا رہتا تھا - گویا مجھے خلد بریں کی ایک جھلک دکھا دی گئی تھی - اور اب اس دنیا میں دل نہیں لگتا تھا - مَیں ایک اندرونی دنیا میں جا بسا - وہاں میرے خیالات کی بستی تھی اور وُہ نظارہ اُن خیالات کے ہمراہ رہتا تھا - مَیں خود بخود بلا ارادہ کے ہی گویا ایک عشقیہ فسانے کا ہیرو بن گیا - رقیب بھی خیال ہی خیال میں پیدا ہوگئے - واقعات بھی ہونے لگے اپنے اور دوسروں کے کارنامے بھی دکھائی دینے لگے اور عشق کے تمام تغیرات اور انقلابات کا مجھ کو تجربہ ہونے لگا حتےٰ کہ رشک اور یاس کا انجام راحت ہوا - آہ ! اگر مجھے اسوقت جوانی کی سی آتش خیز قوت متخیلہ اور کہولت کا بے جوش عطیہ یعنے قوت بیان دونو

ہال ہوں تو پیاری نازنینو! تمہارے دِل میرے فسانے کو سُنکر تڑپ ہی تو اُٹھیں!

ماہ جنوری کے وسط میں مجھ کو گھر سے بلاوا آگیا۔ گھر کو روانہ ہونے سے ایک دِن پہلے جو اُن مقاموں میں گیا جنکو اُس نظارہ نے میرے لئے مقدس بنادیا تھا۔ تو دیکھا کہ چشمے کا سینہ منجمد تھا اور قوس قزح والی پہاڑی پر سوائے برف اور موسم سرما کی دھوپ کے اور کچھ نہ تھا۔ مَیں نے سوچا" مجھے اُمید قائم رکھنی چاہئے۔ ورنہ میرا دِل ایسا ہی برف سا ٹھنڈا ہوجائیگا جیسا یہ چشمہ ہے اور تمام دُنیا ایسی ہی ویران سُنسان دکھائی دیگی جیسی یہ پہاڑی ہے۔ دِن کا اکثر حصہ سفر کی تیاری میں گذر گیا۔ کیونکہ اگلی صبح کو چار بجے چلنا تھا۔ شام کو کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ بعد جب سب تیاری ہوچکی میں اپنے کمرے سے اُتر کر نشست گاہ میں گیا تاکہ پادری صاحب اور اُنکے کُنبے سے جنکے گھر میں میں رہتا تھا رخصت ہولوں۔ مَیں جو دروازے میں سے گذرا تو ہوا کے ایک جھونکے نے میرا لیمپ گل کردیا۔

تمام کُنبہ حسب معمول نشست گاہ میں بیٹھا تھا اور سوائے اس روشنی کے جو چولھے سے آتی تھی اور کوئی روشنی نہ تھی۔ چونکہ اس نیک دِل پادری کی قلیل تنخواہ اُسے ہر قسم کی کفایت شعاری پر مجبور کرتی تھی اس لئے اُس کے ہاں آگ کی بنیاد ہمیشہ موٹی موٹی چھال ہوتی تھی جو صبح سے رات تک سلگتی رہے اور خفیف گرمی پیدا کرے اور شعلہ نہ نکلے۔ اس شام کو چھال کا تودہ نیا ہی لگایا گیا تھا۔ اور اُس کے اُوپر شاہ بلوط کی تین گیلی شاخیں اور خشک چیڑھ کی چند ٹکڑے تھے جو ابھی سُلگے نہ تھے۔ روشنی بالکل نہ تھی سوائے اُس کے جو دو نیم سوختہ لکڑیوں سے آتی تھی جس سے انگیٹھی کے سرے بھی روشن نہ ہوتے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ بڈھے پادری کی آرام کُرسی کہاں ہوتی ہے اور اُس کی بیوی کہاں بیٹھ کر جرابیں بُنا کرتی ہے اور اُس کی دو لڑکیوں سے کیونکر کترانا چاہئے جن میں سے ایک تو موٹی دیہاتی لڑکی ہے۔ دوسری مرض سل کی کھائی ہوئی ہے۔ اندھیرے میں ٹٹولتا ٹٹولتا میں پادری

کے بیٹے کے پاس جا بیٹھا۔ یہ ایک کالج کا فاضل تھا اور سردی کی تعطیل میں گانو میں مدرسہ پڑھانے آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اور اس فاضل کی کرسی کے درمیان معمول سے کم جگہ تھی
چونکہ لوگ اندھیرے میں ہمیشہ خاموش رہا کرتے ہیں میرے وہاں پہنچنے سے کچھ دیر بعد تک ایک لفظ تک بھی نہ بولا گیا۔ خاموشی میں سوائے بڑی بی کے جراب بننے کی ٹِک ٹِک کے اور کوئی آواز خلل انداز نہ ہوئی۔ کبھی کبھی آگ ایک دھندلی سی روشنی ذرا سی دیر کے لئے ڈال دیتی تھی۔ جو بڑھے کی عینک پر ٹمٹماتی تھی۔ اور ہمارے حلقے کے گرد کچھ شک کے سے عالم میں منڈلاتی تھی لیکن اس قدر دھندلی تھی کہ ہمارے مجمع کے افراد کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی تھی۔ مجھے خیال ہوا "کیا ہم روحوں کی مانند نہیں ہیں؟ یہ منظر خواب سا تو ہے ہی مگر کیا جس طرح مرنے والے جنہوں نے دنیا میں ایک دوسرے کو جانا اور چاہا ہے ابدالآباد عاقبت میں ملینگے اس کی یہ ایک مثال نہیں ہے؟ ہم اس وقت ایک دوسرے کی ہستی سے آگاہ ہیں مگر نہ نظر کے ذریعے سے۔ نہ آواز کے ذریعے سے۔ نہ چھونے سے۔ بلکہ ایک باطنی آگاہی کے ذریعے سے۔ کیا خفتگانِ خاک میں بھی ایسا ہی نہیں ہوتا"؟
اس خاموشی کو اس سِل زدہ لڑکی نے توڑا اور اس نے اس مجمع میں کسی سے ایک بات کہی جس کو اس نے "رشل" کہکر پکارا۔ اس کی کانپتی ہوئی اور مریل آواز کا جواب ایک ہی لفظ سے ملا جس کو سنکر میں چونک اٹھا اور اس طرف کو جھک کر دیکھنے لگا۔ جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ "کیا میں نے کبھی یہ میٹھی میٹھی دھیمی دھیمی آواز سنی ہے؟ اگر کبھی نہیں سنی ہے؟ تو اس کے سننے سے اس قدر پرانی یادیں یا یادوں کے ہمزاد اور آشنا لیکن نامعلوم چیزوں کے سائے کیوں تازہ ہوتے ہیں؟ اور کیوں اس کے چہرے کی بے ترتیب تصویروں سے میرا دل بھرا جاتا ہے اگرچہ وہ اس نشست گاہ کی تاریکی میں غائب ہے؟ میرے دل نے کس کو پہچان لیا کہ اس طرح دھڑکنے لگا"؟ میں اس کے پاس سانس کی آواز سننے کے لئے متوجہ ہوا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ ہم ہی

...کی جو دکھائی نہ دیتی تھی تصویر کھینچوں ۔

یکایک خشک چیڑ لیو جل اُٹھا ۔ آگ سُرخ شعلے سے جلنے لگی اور جہاں پہلے اندھیرا تھا وہاں وہ نظر آئی یعنی اُس چشمے والا نظارہ ! وہ محض ایک نُور کی رُوح تھی کہ قوس قزح کے ساتھ غائب ہوگئی تھی ۔ اور اب آگ کی روشنی میں شاید اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ شعلے کے ساتھ فوراً کی ذرا چمکے اور کافور ہو جائے ۔ مگر اس کا رُخسار گلابی اور انسانوں کا سا تھا ۔ اور اُس کا چہرہ اس کمرے کی گرم روشنی میں اُس سے بھی زیادہ پیارا اور محبت آمیز دکھائی دیتا تھا جیسا میری یاد میں سمایا ہوا تھا ۔ وہ مجھے جانتی تھی ! ۔ وہ بشاشت آمیز تبسم جو اُس کی نگاہوں میں تھا اور جس سے اُس کے چہرے پر (جب میں نے اُس کے نازک حُسن کو چشمے میں دیکھا تھا) گڑھے پڑے جاتے تھے ۔ اب بھی اُسی طرح موجود تھا ۔ ایک لمحے کے لمحے ہماری نگاہیں چار ہوئیں ۔ دوسرے لمحے میں جلتی ہوئی لکڑی پر چھال کا ڈھیر آگرا ۔ اور تاریکی اُس نُورانی نژاد کو مجھ سے چھین لے گئی ! ۔

حسین نازنینو ! یہ کہانی یہیں ختم ہے ۔ کیا یہ سیدھا سادہ راز بتلا ہی دُوں؟ سائشل اس گاؤں کے رئیس کی بیٹی تھی اور جس روز میں گاؤں میں پہنچا تھا اُس سے اگلی صبح کو گاؤں سے ایک مدرسے کو چلی گئی تھی اور میرے گاؤں سے روانہ ہونے سے پہلے دن واپس آگئی تھی ۔ اگر میں نے اُسے فرشتہ بنا دیا ہے تو یہ نقشہ تو ہر نوجوان عاشق اپنی معشوقہ کا کھینچتا ہے ۔ میری کہانی کا عطر یہی ہے ۔ پیارے نازنینو ! تم کو فرشتہ بننے کے لئے بہت ہی کم ہو لینے کی ضرورت ہے !

(ترجمہ)

نیرنگ

متروک الفاظ

کسی زمانہ میں اُردو میں سینکڑوں ایسے الفاظ مستعمل تھے جو کانوں کو اچھے نہ معلوم ہوتے تھے مثلاً "سے" کو "ستی" اور "کو" کو "کوں" کہا کرتے تھے لیکن بعد کو شائستگی زبان کی ترقی کے ساتھ اِس قسم کے الفاظ کا استعمال بھی کم ہوتا گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے شاہ حاتم نے بہت سے الفاظ کی فہرست اپنے دیوان کے دیباچہ میں درج کی اور اُن کے استعمال سے حتی الامکان پرہیز کیا۔ اور رفتہ رفتہ اس اصلاح زبان نے یہانتک ترقی کی کہ ناسخ و آتش کی زبان ایسی ہوگئی جس میں اب مدت تک تبدیلی مزید کی نہ اُمید ہے نہ گنجائش۔

اِس میں شک نہیں کہ شعرائے دَورِ آخر خصوصاً شعرائے لکھنؤ نے زبانِ اُردو پر بہت بڑا احسان کیا کہ بہت سے الفاظ غیر مناسب و ثقیل کو ترک کر کے اُسے ایک مستند و باقاعدہ زبان بنا گئے۔ لیکن بعض بعض صورتوں میں اس معاملۂ ترکِ الفاظ میں اُنہوں نے بغایت سختی کی جس کے باعث سے بہت سے عمدہ الفاظ صرف اس وجہ سے متروک ہو گئے کہ شعرائے قدیم کے کلام میں وُہ اکثر نظر آتے تھے۔

بیشک اُن الفاظ کو ترک کر دینا بجا ہے جنکی جگہ نئے اور اُنسے عمدہ الفاظ پیدا ہو گئے ہیں لیکن ایسوں کا ترک کرنا جنکے ہم معنے الفاظ پیدا نہیں ہوئے ہیں محض غلطی ہے۔ مثلاً لفظ "سو" جسکا مفہوم کسی اَور ایک لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ بعض ایسے الفاظ کا ترک کرنا بھی قابل اعتراض ہے۔ جنکے ہم معنے الفاظ تو پیدا ہو گئے ہیں اور عام طور پر رائج بھی ہیں لیکن پھر بھی اکثر اوقات خصوصاً نظم میں کچھ انہیں کا استعمال بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً "کسو" بجائے "کسی" اور "آئے ہے" "جائے ہے" بجائے "آتا ہے" "جاتا ہے"۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ تقریباً ہر زبان کی نظم کا یہ دستور ہے کہ اُس میں بمقابلہ نثر ہمیشہ پرانے

الفاظ و رسوم و حکایات کا زیادہ تر ذکر ہوتا ہے اور لوگ انہیں پسند بھی کرتے ہیں۔ مثلاً نظم زبان انگریزی میں یونان و روم کے قدیم دیوتاؤں کے حالات (باوجودیکہ انہیں صحیح کوئی بھی نہیں جانتا) اس وقت تک بڑے شوق سے لکھے جاتے ہیں اور اکثر ایسے الفاظ کا استعمال نظم میں جائز ہے جنکا نثر میں لانا کوئی بھی گوارا نہیں کرتا۔ اور یہی حال نظم اردو کا ہے جس میں لیلیٰ و مجنوں کے افسانے اور شراب و کباب و بہار کے مضامین آجتک رائج ہیں حالانکہ کئی شعرا شراب کی بو سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔

لیکن تعجب ہے کہ اس قدامت پرستی کے ساتھ الفاظ قدیم سے کسی قدر رعایت کیوں نہیں کیجاتی۔ انہیں چند خیالات کے باعث سے میں چاہتا ہوں کہ اُن الفاظ متروک کے متعلق کچھ لکھوں جنکا میری رائے میں ترک کرنا نامناسب ہے یا جنکا پھر رائج کرنا بہتر ہے۔

لفظ "سو"

اس کے استعمال کی بہت سی صورتیں ہیں مثلاً

"(۱) "جو" کے ساتھ "سو" کسی زمانہ میں بہت عام تھا اور اب بھی کبھی کبھی آتا ہے۔ اس "سو" کی بجائے "وہ" لکھ سکتے ہیں۔ لیکن "سو" میں کچھ ایسی سادگی پائی جاتی ہے کہ اس کی بجائے "وہ" کا استعمال طبیعت کسی طرح گوارا نہیں کرتی۔

مثلاً جرأت لکھتا ہے:۔

جو راہِ ملاقات تھی سو جان گئے ہم ۔ اے خنجرِ تصور تیرے قربان گئے ہم

میر فرماتے ہیں:۔

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قرین تھا ۔ آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا
اب کوفت سے ہجراں کے جہاں تن پہ رکھا ہاتھ ۔ جو درد تھا دل میں سو کہے تو کہ وہیں تھا

میر محمدی بیدار کہتے ہیں:۔

جس دن تم آپکے ہم سے ہم آغوش ہوگئے ۔ شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہوگئے

شیخ ناسخ نے بھی اس قسم کے سو کا جا بجا استعمال جائز رکھا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں ؎

شب چمن میں کس کف پا سے یہ نور افشانیاں جو ترا نقش قدم تھا سو گل مہتاب تھا

(۲) "سو" صرف بمعنے "وہ"۔ اس صورت میں بھی "سو" میں "وہ" سے کچھ زیادہ بات نکلتی ہے۔ مثلاً میر جعفر علی حسرت استاد جرأت فرماتے ہیں۔ ؎

رہنے دے مے کو ساقی ہم تو چلے یہاں سے قسمت میں جسکی ہوگا "سو" جام پی رہیگا

منیر فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

واعظ نے قیامت کی اک بات بنائی ہے کہتے ہیں جسے محشر "سو" روز جدائی ہے

میر تقی میر کہتے ہیں۔ ؎

ہو جائے یاس جس میں "سو" عاشقی ہے ورنہ ہر درد کی دوا ہے ہر رنج کو شفا ہے

ناسخ لکھتا ہے۔ ؎

ذکر نزاکت بتاں ہے جو چمن کے درمیاں موج نسیم ہے زباں گل "سو" بہ رنگ گوش ہے

مومن کہتا ہے۔ ؎

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا "سو" مرے خاک میں ملانے کو

ان دو آخری شعروں میں یہ بھی بتانا مشکل ہے کہ "سو" کا مفہوم واقعی (لفظ سے تو در کنار) کس جملے سے ادا ہو سکتا ہے۔

"وہ" کے آخر میں ہائے ہوز ساکن کی موجودگی اس بات کو صاف بتاتی ہے کہ یہ لفظ نظم کے لئے "سو" کے مقابلہ میں موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ جس شعر میں اس قسم کے الفاظ آجاتے ہیں۔ اس کی سلاست و روانی میں یقیناً فرق آجاتا ہے۔ مثلاً مرقومہ بالا اشعار میں "سو" کی بجائے "وہ" رکھ کر دیکھ لیجئے کہ اس کے تلفظ میں کس قدر تکلف ہوتا ہے اور بعد کا لفظ گویا از سر نو شروع کرنا پڑتا ہے (میر کے شعر میں "سو" کی بجائے "وہ" رکھنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جائیگی) پس جبکہ اس ثقل کے دور کرنے کے لئے اسکا تلفظ اکثر بجائے "وہ"

سے "دو" کیا جاتا ہے تو کیا سبب ہے کہ ہم اس کی جگہ "سو" بروزن "دو" نہ لکھیں درآنحالیکہ "سو دو" سے ہر صورت میں افضل ہے۔

(۳) "سو" معنے "وہ" برائے اظہار ازدیاد محرومی بر محرومی و ناکامی بر ناکامی۔ ایسے مواقع پر بھی اسکے بجائے کوئی دوسرا لفظ نہیں لایا جاسکتا ہے۔ مثلاً میر فرماتے ہیں ؎

کتنے دنوں میں آئی تھی اس کی شب وصال   باہم رہی لڑائی سو وہ رات بھی گئی

یعنی اول تو وصل کی رات ہی مدت میں آئی تھی اس پر آفت یہ ہوئی کہ وہ بھی جنگ شکوہ و شکایت میں گذر گئی۔ مرزا غالب کہتے ہیں۔ ؎

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے   ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

یعنے آرزوئے مرگ میں بھی ناکامی حاصل ہوئی حالانکہ وہ خود نتیجۂ محرومی تھی۔

نیز فرماتے ہیں۔ ؎

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی   سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

یعنے دل کا ایک قطرۂ خون ہونا ہی کیا کم قابل افسوس تھا کہ اس پر اس کا "باندازِ چکیدن" سرنگوں رہنا اور طرہ ہوا ہے۔

جرأت لکھتے ہیں ؎

جان کر رکھا تھا جس کو عندلیبِ نغمہ سنج   "سو" وہ مرغِ دل تو کوئی سخت غوغائی ملا

(۴) کسی امر خلاف امید و آرزو کے بیان کرنے کے لئے۔ اس صورت میں بھی ہم "سو" کے بجائے دوسرا کوئی ایک لفظ اسکے ہم معنے نہیں لا سکتے۔ مثلاً میر فرماتے ہیں ؎

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا   موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

نیز کیا خوب کہا ہے ؎

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت   "سو" التفات کم ہے دل آزاریاں بہت

مومن اپنی مشہور غزل میں لکھتے ہیں ؎

سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا تم نے ایک جو وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۵) "سو" بیانیہ جس میں کہیں کہیں سبب یا نتیجہ کے بھی معنے نکلتے ہیں اور اس قسم کے "سو" کا بھی مفہوم کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ میر کہتے ہیں ؎

تھی لاگ اُس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے
دونوں کو معرکہ میں گلے سے ملا دیا

اس میں ایک واقعہ کی ابتدا "سو" سے کی ہے۔ نیز کہتے ہیں ؎

میر اُس کی آنکھیں دیکھیں ہم نے سفر کو جاتے
عین بلا ہوا ہے سو اب سفر ہمارا

یعنے ہم نے وقت سفر محبوب کی آنکھیں دیکھ لی تھیں" "اس کے سبب" یا "اسکا یہ نتیجہ ہے" کہ ہمارا سفر عین بلا ہوا ہے۔ عین بلا میں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

مومن کہتا ہے اور خوب کہتا ہے ؎

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

یہاں بھی حالت بیکسی و مجبوری کی ابتدا "سو" سے کی گئی ہے جس نے پورے شعر میں قیامت کی دلچسپی پیدا کر دی ہے اور جو بلحاظ جامعیت ایک پورے جملے یعنے "لیکن قیامت تو یہ ہے" کے برابر ہے۔

(۶) علاوہ مذکورہ بالا صورتوں کے اور بھی کئی متفرق طریقے "سو" کے استعمال کے ہیں۔ مثلاً ناسخ کہتا ہے ؎

خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں
سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

یہاں "سو" کی بجائے اگر ایک پورا جملہ "لیکن وائے قسمت کہ" لکھا جائے تو شائد کسیقدر اسکا مفہوم ادا ہو سکے۔

خواجہ میر درد فرماتے ہیں ؎

زاہد کیا کرے ہے وضو گرچہ روز و شب
چاہیے کہ دل سے دھوئے کدورت سو دھو سکے گا

یہاں "سو" کے جو معنے لئے گئے ہیں اسکے مقابل کا کوئی لفظ اردو زبان میں موجود نہیں

غرضکہ لفظ "تسو" کا استعمال نہایت ہی دلچسپ ہو اور بعض بعض مقامات پر عجیب۔ کیونکہ ہم اس کے مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ادا نہیں کر سکتے اور اس حالت میں صاف ظاہر ہے کہ اس کے مقابل کا کوئی لفظ اُردو میں موجود نہیں ہو سکتا۔

اس لئے نہایت مناسب ہے کہ بجائے اِس لفظِ جامع کو ترک کرنے کے ہم اس کو دانستہ زیادہ رواج دیں۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے تو اِس کی وجہ بتائیں اور اُردو زبان میں کوئی اسکا ہم معنے لفظ دکھائیں جو اس سے بہتر بھی ہو۔

حسرت موہانی (از علیگڈھ)

دریائی پریاں - ایک انگریزی شاعر اُن پریوں کو جنکو زبان انگریزی میں "نمف" کہتے ہیں اور جنکی نسبت اکثر انگریزی فسانوں میں ذکر آتا ہے۔ کہ سمندر میں آباد ہیں یُوں خطاب کرتا ہے:-

"ای قدیم زمانہ کی خوبصورت یادگارو! تم صفحۂ ہستی سے کیوں مٹ گئی ہو۔ جنگل اور پہاڑ اور ساحلِ دریا کے چٹان تمہارے نُور سے منور تھے مگر اب تم عقیدت کی آنکھ سے کیوں پنہاں ہو گئی ہو اور کیا سبب کہ سوائے لبِ شاعر کے کوئی زبان تمہارا نام نہیں لیتی۔ آفتاب بدستور سمندر پر اپنی زرّین شعاعیں ڈالتا ہو۔ اور لہر اپنوالی موجیں چاندی کی سی چمک دکھاتی ہیں۔ ریگِ ساحل ہموار ہو اور سنگریزے چمکیلے ہیں۔ چٹان اب سرسبز ہیں اور کاہی کی جھاڑیاں ہوا کے جھونکوں سے جھکی جاتی ہیں۔ مگر یہ کیا ہوا۔ اے زینتِ افسانہائے زمانہ! تم نظر نہیں آتیں؟

ای دریائی پریو! عقیدت کا دل تم سے پھر گیا۔ اور وُہ اب تمہیں حقارت سے دیکھنے پر ناز کرتی ہے۔ صرف شاعر کی رُوح سنگتراش کی تخیل۔ اور نقاش کی قوتِ واہمہ اب تمہاری قدر دان ہیں۔ اور باقی دُنیا کے نزدیک تمہاری ہستی نیست کے برابر ہو۔ جس کرنا کی آواز سنکر تم جمع ہو جاتی تھیں وُہ اب خاموش ہو اور اُسکی خموشی کے ساتھ پُرانی دُنیا کی آواز آدھی خموش ہو گئی ہو۔

مذاہبِ شکل سابق خود نما ہیں۔ نیند میں بدستور خواب نظر آتے ہیں۔ زمانۂ حال اُسی طرح خوشی اور غم۔ محبت اور عداوت کا مرکب ہو۔ جیسے زمانۂ ماضی تھا۔ حق بدستور پردوں میں چھپا ہوا ہو اور دانائی کا پہلے کی طرح فقط نام ہی نام ہے۔ زندگی موت کی طرف اُسی طرح دوڑی جاتی ہو اور تاریک مستقبل سے ویسی ہی دھندلی روشنی کی جھلک پڑتی ہو پھر اے کوہ و دریا کی حسین و جمیل مخلوقات! تم کیوں غائب ہو۔ تم بھی پھر انسان کی آنکھوں میں سما جاؤ۔ پیار کرو اور پیار کئے جاؤ"

مجاز و حقیقت

ظاہر میں ہم فریفتۂ حُسنِ بتاں کے ہیں
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

واعظ - ہاں یہی محراب و منبر پر جلوہ کرنے والے واعظ۔ چاہے کچھ ہی کہیں بُت پرستی کے چرچے ہوتے ہی رہینگے - یہ چرچے بعض دفعہ وعظ سے زیادہ اشاعتِ مذہب کرتے ہیں - کفر کی کالی کالی گھٹاؤں میں کسی کا چاند سا مکھڑا نورِ ایمان پھیلاتے کس نے نہیں دیکھا - اور بڑے بڑے پتھر دلوں کو کسی کی کافرادائوں کا کلمہ پڑھتے کس نے نہیں سُنا۔ حسن - ہر چند کہ "لَا نَبِیَّ بَعْدِی" - ایک پیغمبر ہے - اور عین کفر میں تلقینِ ایمان اسکا مشن ہے حسن عشق کے سہارے - عشق جو بقول میر نیرنگ آئینۂ ہستی میں حُسن کا اپنا ہی عکس ہے کعبۂ دل میں اپنا مندر بناتا ہے - اور اُس کے فدائیوں کی ارادت اُس کی مُورت کے قدم چُومنے کو دمبدم اُسی اشتیاق - اسی سوز و گداز سے کھنچی جاتی ہے جو ایک خدا پرست مسلمان کو حج کے دنوں میں مقدس حجر اسود کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے - یہ اشتیاق یہ سوز و گداز حسن نے عشق یا سچی محبت کی پاکیزہ برقی طاقت کے ذریعے پیدا کر دیئے ہیں اور پھر یہ سوز و گداز اپنی اس جلن کی محویت میں معبودِ حقیقی کے جلوے کبھی گل اندام محبوب کی موہنی صورت - کبھی ننھے ننھے معصوم بچوں کی بھولی بھولی شکل - کہیں علم و ہنر کے معجز نما کرشموں اور کہیں موسیقی کی میٹھے میٹھے زمزموں کی روانی میں دیکھ رہے ہوتے ہیں اور دل ہی دل میں اس لذتِ نہاں کے مزے لیتے ہیں - یہ لذت بھی عجب شے کی ہوتی ہے اور اُس کے ڈھنگ نرالے ہیں اگر مذاق صحیح ہو تو اُس حظ کی جو اس سے نصیب ہوتا ہے - کوئی حد نہیں - بچوں سے پیار کی باتیں - نازنینوں کی طرف اُلفت کی نگاہیں

موسم بہار کے ولولے۔ خزاں کے صدمے۔ دستِ قدرت کی شانہ ارسوج افزائیاں اور حضرت انسان کے ہنر کی دلاویز مسرت آفرینیاں سب کی سب ساتھ ہی ساتھ ہیں بتا رہی ہوتی ہیں کہ حسن و عشق کے ناپید اکنار سمندر میں اٹھتی ہوئی پانی کی ایک لہر سے زیادہ نہیں۔ ہمارے جذبات عین جوش شباب میں بیان کے منہ پر مہر خاموشی لگا دیتے ہیں اور ہماری محبت کا دریا اُمڈا ہوا طغیانی کے زور میں منزلِ مقصود سے کہیں پرے نکل جاتا ہے اور میدان جنا سے تجاوز کرتا ہوا حقیقت کے بحر بے پایان میں ناپید ہو جاتا ہے۔

ان معنوں میں بُت پرستی حق پرستی ہے۔ حسنِ بتاں موسیقی کے دلکش نغموں کی طرح ظاہر کے تاروں سے باطن کے پردے ہلاتا ہے۔ اس کی اداؤں میں بھی رہی جادو کے سے راز ہیں اگر کوئی گانا چاہو تو کان لگاؤ۔ دیکھو تو کس جادو کے انداز سے مست ترانوں کی ہوش ربا سریلی آواز ہمارے دل کی ناسپردہ پیچ در پیچ راہوں میں سے ہوتی ہوئی اپنی اٹکھیلیوں سے اس کے نازک سے نازک پردوں کو چھیڑتی جاتی ہے اور اپنی اس سحر اثر چال سے ہماری موجودہ اور گذشتہ زندگی کے تاروں میں ایک خاموش حرکتِ یگانگت پیدا کر رہی ہے۔ اسکے تھوڑے سے چھیڑنے سے آن کی آن میں ہماری عمر بھر کی سوز و اُلفت کی چنگاڑیاں جو محنت و کلفت کے سالوں میں بکھری پڑی تھیں ہمارا دل گداز کئے دیتی ہیں۔ اور ہاں! اس کی مقناطیسی کشش مروت و ایثار کے لوہے کے چنے جو وقت پر چبانے وبالِ جان ہو رہے تھے ہماری زندگی کی چاروں طرف سے اکٹھے کر کے تسلیم و رضا کی علو ہمتی کے ہاتھوں موم کرتی نظر آ رہی ہے۔ اور یہ ساری کشمکش ہماری اس وقت کی راحت کو پہلی کلفتوں میں اور اس لحظہ کی کلفت کو پہلی راحتوں میں ملا کر ایک لطف پیدا کر رہی ہے۔ جسکے مزے زبان قلم کو مجال کہاں کہ بیان کرے۔ ان سحر اثر ترانوں سے اس طرح متاثر ہونا کسی مذہب میں عجیب نہیں۔ اور نہ یہ ہمیں کسی قسم کی کمزوری کے الزام کا مورد بنا سکتا ہے۔ اس میں ہمارے ان واعظوں کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔

حسن بھی ماہ جبینوں کے روئے روشن میں اُنکی سُرخ و سفید مٹی سے کہیں ارفع و اعلےٰ چشمۂ نور کی تجلیاں دکھاتا ہے۔ البتہ ان تجلیوں کے دیکھنے کے لئے روشن ضمیری درکار ہے اور اگر یہ ہو تو پھر ماہرویوں کے تیرہ جسم کی مانگی ہوئی ضیا میں چہرہ پرداز جہاں کا نقش جما ہوا دیکھ لینا کوئی مشکل امر نہیں۔

یہ نعمت اہلِ دل کے سوا دُوسرے کو میسر بھی نہیں۔ وُہ دیکھ سکتے ہیں کہ جادو جو تسخیر قلوب کے لئے اعلیٰ علیین سے آکر بتوں کی آنکھ میں جاگزین ہوا ہے اپنی فسوں سازیوں سے (اور اُن فسوں سازیوں کی زبان اپنی فصاحت و بلاغت سے کچھ تائید غیبی بھی لئے ہوتی ہے جو ہماری بیخودی کے پیدا کرنے میں حکمی اثر رکھتی ہے) ہماری محویت کو مجاز کے رنگ میں صورتِ حقیقت دے رہا ہے۔ نرگس چشم اور بوٹا سا قد ہمیں باغ باغ کئے دیتے ہیں اور اس لئے کہ یہ اُسی بوستانِ اُلفت و محبت کے گل اور بوٹے ہیں جس کی خوشگوار ہوا میں ہمارا اپنا اور ہمارے ہمجنسوں کا غنچۂ دل کھلا۔ ہم اور ہمارے ہمجنس پھلے اور پھُولے۔ پھل اور پھُول رہے ہیں۔ جسکا پانی ہماری زندگی اور جس کی شادابی ہماری سرسبزی کا باعث ہو۔

احمد دین

تین کارآمد نقشے - مولوی محمد انشاء اللہ صاحب ایڈیٹر اخبار وطن و مالک حمیدیہ ایجنسی - لاہور نے دفتر مخزن کو تین کارآمد نقشے ارسال فرمائے ہیں۔ جو اُن حضرات کے لئے جو معاملات ترکی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ نہایت مفید ثابت ہونگے۔ ایک نقشہ یورپی رُوم کی تمام ریل کی لینیں اور اُن کے مشہور مقامات دکھاتا ہے اور دوسرا ایشیائی رُوم کی ریلوں کا آئینہ ہے۔ تیسرے میں مجوزہ حجاز ریلوے لین کا ایک خاکہ ہے۔ چونکہ ریلیں اب روم میں ترقی کر رہی ہیں اور اخبارات میں آئے دن اُنکے متعلق خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ اس لئے یہ نقشے اُن خبروں کے ذہن نشین ہونے میں بہت مدد دینگے۔ تینوں ایک روپیہ میں ملتے ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ شائقین اپنے مطالعہ کے کمروں میں انہیں لٹکائیں۔

کیا رسمِ ستی بند ہو گئی ہے؟

در محبت چوں زنِ ہندی کسے مردانہ نیست سوختن بر شمعِ مردہ کارِ ہر پروانہ نیست

ہندوستان کی درسی کتابوں میں اکثر زور کے ساتھ اُس زمانہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب سایہ برطانیہ نے سرزمینِ ہند سے رسمِ ستی کی بیخ کنی کر دی۔ مُردہ خاوند کی لاش کے ساتھ بیوی کا جل مرنا قانوناً جُرم قرار دیدیا۔ اور اس فعل کی امداد و اعانت کو بھی جُرم ٹھہرایا۔ لیکن معلوم نہیں کتنے لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہے۔ کہ رسمِ ستی فی الحقیقت مسدود بھی ہو گئی یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ظاہری جل مرنے کا تعلق تھا وُہ تو رُک گیا ہے۔ مگر ایک اَور جل مرنا ہے جو ابھی جاری ہے اور جس کے انسداد کی کوئی صُورت جلدی بنتی نظر نہیں آتی۔ اور ہندوستان کی عورتوں کو اس جلا کر راکھ کر دینے والی آگ سے بچانیوالا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ستی بذاتِ خود ایسی بُری رسم نہ تھی کہ اُسے جرم کہا جا سکے۔ اُسکو معیوب اس بات نے بنا دیا۔ کہ عورتیں جلنے پر مجبُور کیجانے لگیں۔ ورنہ باختیارِ خود جوشِ محبت کے اثر سے آگ میں کُود پڑنا مجنونانہ حرکت ہو تو ہو محض وحشیانہ حرکت نہ تھی۔ بلکہ انسانی طبیعت کے ایک بردست جذبہ کا پرزور ظہور تھا۔ ہندوستان کی بیشمار ستی ہونے والی بیواؤں میں کئی ایسی نیک نہاد اور پاک طینت عورتیں ہونگی۔ کہ اُنکی مردانگی کی یادگار زمین بُتِ سیمیں بنائے جائیں۔ شعر مندرجۂ عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایرانی شاعر کے دِل پر ہندوستان کی اس رسم کا کیا اثر ہوا۔ اور اُس نے جل مرنے کو ایسا فعل قرار دیکر جو رضا و رغبت سے کیا گیا ہو۔ ستی کی کیسے خوبصُورت الفاظ میں تعریف کی ہے۔ اور ہندوستان کی عورتوں کی بہادری کی کیا بیساختہ داد دی ہے۔ افسوس کہ وہ چتا میں کود کر جلنا گو ختم ہو گیا۔ مگر تمام عمر آتشِ غم پر کباب ہونا نہ گیا۔ اُس آگ میں اگر اسّی فیصدی مجبُوراً کودتی تھیں۔ تو یہاں نوے فیصدی

مجبوراً کڑہ کڑہ کر مرتی ہیں۔ اُس میں جو بیس فیصدی سچے جوش سے اپنے آپ کو قربان کرتی تھیں۔ کم از کم اُن کی داد تو ملتی تھی۔ اُنکی قسمت پر ہمارے ایرانی شاعر جیسے آنسو بہانے والے تو پیدا ہوجاتے تھے۔ اور یہاں نہ کوئی خوشی سے بقیہ زندگی تلخ کر لینے والیوں کی داد دیتا ہے۔ نہ مجبوراً جل بجھنے والیوں کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ ہندوستان کے ہر گھر میں۔ اور ہر گھر میں نہیں۔ تو ہر گلی میں۔ اور ہر گلی میں نہیں تو ہر محلے میں ایسا بھاڑ موجود ہے۔ جس میں کوئی باعصمت خاتون بیگناہ جل رہی ہے۔ مگر غضب یہ ہے۔ کہ دھواں تک نہیں اُٹھتا اور اگر اُٹھتا ہے تو کوئی دیکھتا نہیں۔ اور اگر کوئی دیکھتا ہے تو آگ بجھاتا نہیں۔ وُہ جلنا ایک آدھ گھنٹے کے لئے تھا۔ یہ جلنا ایک آدھ عمر کے لئے ہوتا ہے۔ اُس جلنے پر لوگ کف افسوس ملتے تھے۔ اِس جلنے کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اُس جلنے کے بعد راکھ قدر و منزلت سے اُٹھاکر دریائے رواں کے صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی میں بہادیتے تھے اور اس راکھ کے ذروں کو پانی برسوں اپنی ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ یہاں راکھ ہونے کی نوبت آنے سے پہلے کچھ ایسے سامان ہوتے ہیں جو آگ پر تیل کا کام دیں۔ اور تیل بھی وُہ تیل جو چُپکے چُپکے آتش کو تیز تو کرتا جائے۔ مگر بھڑکنے نہ دے۔ یہ سب اِمتیاز چھوڑ کر اُس ستی اور آجکل کی ستی میں بڑا فرق یہ ہے۔ کہ وُہ قربانی خاوند کے مرنے کے بعد کرنی پڑتی تھی اور اِس قربانی میں کئی ایسی نیک بخت عورتیں بھی ہیں جو خاوندوں کے جیتے جی چتا پر ہیں۔ شاعر نے فی الواقع بڑا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ اور نہایت نفیس پیرائے میں زنانِ ہند کو قربانیٔ نفس کے بارہ میں دُوسری عورتوں پر ترجیح دی ہے۔ مانا کہ عشق میں بڑی قوت ہے اور عورت خاوند کی محبت میں یُوں جان دیدے جیسے پروانہ شمع پر نثار ہوکر مرجاتا ہے۔ اور ایسی مثالیں ہر ملک میں نظر آئیں۔ مگر ایسا پروانہ اور کہاں ملتا ہے جو بجھی شمع کے گرد پھرے۔ اور بجھی شمع پر فدا ہو جائے یہاں بجھی شمع پر فدا ہونیوالیاں آج بھی موجود ہیں۔ ایک تو وُہ جو خاوند کے مرنے سے حسب رواجِ مُلک زندہ درگور ہیں۔ اِن کی حالت کی پُردرد کہانی چھیڑنے کے قابل نہیں۔ کلیجہ

منہہ کو آتا ہے۔ اِن کو چھوڑکر ذرا اُن کی حالت پر نظر ڈالیئے۔ جو خاوندوں کے جیتے جاگتے مصیبت میں ہیں۔ کئی گھر ایسے ملینگے جہاں خاوند کے دل میں محبت کی آگ یا تو جہاں تک بیوی کا تعلق ہے کبھی بھڑکی نہیں یا کبھی تو بجھ چکی ہے۔ مگر بیوی کے دل کو ٹٹولو تو اُسی بجھے شعلے کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ جو اُلفت پہلے تھی وُہ اب بھی ہے۔ جو خدمت کا شوق اوّل میں تھا وُہ آخر تک پایا جاتا ہے۔ جو ایثار آغاز میں تھا۔ وہی انجام تک ہے۔ جو وفا بچپن میں سیکھی تھی وُہ ہاتھ سے نہیں گئی۔ اندر ہی اندر تن من جلا دیا۔ مگر ظلم پر اُف تک نہیں کی۔ یہ وُہ ستی ہے جس میں زنِ ہندی آج تک ستی سے بڑھ کر مردانگی دکھا رہی ہے۔ گو آج اس کی بہادری کی قدر مفقود ہے۔ مگر یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اِس صفتِ خاص میں دُنیا بھر کی عورتوں میں ہندی عورت اپنا جواب نہیں رکھتی +

اِنسان کا فرض۔ آدمی کا سب سے بڑا فرض خُدا کی شان کا مشاہدہ اور اپنی اطاعت کے ذریعہ سے اُس شان کا بلند کرنا ہے۔ اگر وُہ اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ تو اس کا میرے نزدیک کوئی مصرف نہیں۔ جو کچھ اس فرض کے پُورا کرنے میں مدد دیے وُہ حقیقت میں ہمارے واسطے اِس زندگی میں مفید ہے۔ مگر تعجب ہے کہ اس کام کاج کی محبت کے زمانے میں لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کہ گویا صرف گھربار۔ زمینیں۔ اسباب خورد و نوش۔ اور لباس ہی مفید ہیں۔ اور بینائی۔ قوتِ خیال اور قوتِ تعریف سب بے سود ہیں۔ یہی لوگ گستاخی سے اپنے آپ کو فائدہ پرست (یوٹیلی ٹیرین) کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ اور جس چیز میں ان کی محدود بینائی کو ظاہری فائدہ نظر نہ آئے۔ اسے بیکار قرار دیتے ہیں۔ اگر ان حضرات کا بس چلے تو وُہ خود اپنے وجود کو اور بنی نوع انسان کے وجُود کو ساگ پات میں بدل کر مفید بنا لیں۔ یہ سمجھتے ہیں (اگر سمجھنے کا اطلاق ایسے لوگوں پر ہو سکتا ہے) کہ خوردن زیستن سے زیادہ ضروری ہے اور لباس جسم سے بیاپہ ہے۔ یہ زمین کو ایک بڑا اصطبل اور اس کے میوجات اور پیداوار کو حیوانوں کا چارا جانتے ہیں۔ انگوروں میں سے شراب نکالنے والے اور کاشتکار اپنے انگوروں کو اور غلّہ کو زیادہ محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن فرشتوں کے لائق باغوں سے اُلفت نہیں رکھتے جنہیں جنّتِ عدن کہا جاتا ہے۔ لکڑہارے اور سقے اس گمان میں ہیں کہ جو لکڑیاں وہ کاٹتے ہیں اور جو پانی وہ کنوؤں سے نکالتے ہیں۔ وُہ اُن عالیشان سربفلک درختوں سے جو قدرت نے پہاڑوں پر کھڑے کئے ہیں اور اُن دریاؤں سے جو ہمیشہ رواں رہتے ہیں بہتر ہے۔ افسوس کہ یہ سب سخت غلطی میں مبتلا ہیں +

(رسکن)

نظم

میر نذیر حسین احمد صاحب بی۔ اے جن کے کلام سے ہمارے ناظرین آشنا ہیں۔ یہ مختصر سا مضمون ماہیت نظم کے متعلق لکھتے ہیں۔ غور کرنے والوں کو اس میں نئے خیالات اور مفید اشارات ملیں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ انگریزی مذاق کے موافق نظم ہمارے ہاں کی نظم کی طرح قیود ردیف و قافیہ میں غلامانہ طور پر جکڑی ہوئی نہیں ہے:۔

ا۔ کسی کو باتیں کرتے سنتے ہیں ہمیں نہ صرف اس کی آوازیں سنائی دیتی ہیں بلکہ ایک ہیئت اور بھی ذہن میں آتی ہے جس سے اس کا رنجیدہ خوش یا سنجیدہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس شخص کی نقل کرنی منظور ہو (یہ کام اکثر ضروری ہوتا ہے) تو اس کی حرکات و سکنات اور الفاظ کو نقل کر دینا کچھ مشکل کام نہیں۔ البتہ اس کے لہجے کی تمام و کمال نقل دکھانا بڑا دشوار کام ہے۔ اور یہ یا تو ممکن ہے ان لوگوں سے جن کے ضمیر ایسے ہیں کہ کسی کی کوئی حالت دیکھ لیتے ہیں تو وہی اثر اور اتنا ہی اثر ان پر ہو جاتا ہے (یا اختصاراً یوں کہئے جنکا ضمیر تمام عالم کا ضمیر ہے) اور یا ممکن ہے ان لوگوں سے جنہوں نے ان استادوں سے مختلف انسانی حالتوں کے تاثرات کی نقل سیکھ کر یاد کر لی ہے۔ قوتِ حافظہ کا خاصہ ہے کہ جو باتیں زیادہ پیاری ہوں ان کو بہت جلد قابو میں کر لیتی ہے اور دیر تک قابو میں رکھتی ہے۔ استاد حکما نے اسی لئے تاثرات نقل کو بالکل مطابق اصل نہیں کیا بلکہ اس کو تناسب (Symmetry) اور وزن (Cadence) سے مربوط کیا کہ نہایت عامیانہ مذاق بھی مزید خوشی کو تو کیوں نہ پسند کریگا۔ رنج کی حالت میں بھی لطف اٹھا سکتا ہے۔ اور اسی لئے انکو بخوبی یاد رکھ سکتا ہے۔ یہ وہ علم و فن ہے جسکو موسیقی کہتے ہیں جو تاثرات اصلی کا فوٹو مگر رنگین فوٹو ہے۔ رنگین اس لئے کہ اس میں تناسب اور وزن کا رنگ ہے جسکو خط و خالِ اصلی سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس زیادتی کا یہ فائدہ ہوا کہ خوشی مضاعف ہو گئی اور رنج شکر منڈھی کڑوی گولی ہو گیا۔ اگرچہ اصلیت خالص نہ رہی۔ یہ زیادتی نہ ہوتی تو خوشی کی

نقل یاد رکھنا تو خیر آسان تھا۔ رنج کی نقل یاد رکھنا بہت مشکل ہوتا۔ اور ان دونوں کی پوری نقل قریب قریب ناممکن ہی ہوتی۔ کیونکہ یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں کہ جب چاہیں بیوجہ خوش ہونے لگ جائیں۔ اور جب چاہیں رنجیدہ ہونے لگیں۔ پس تاثر کی نقل کے لئے ضرورت ہوا کہ یا تو وہ وجدانِ عالمگیر میسر ہوا اور یا موسیقی آتا ہو۔ پہلی بات محال ہو اور دوسری میں وہ پسندیدہ رنگ ہے جسکو موزونیت کہتے ہیں۔ لہٰذا کلام کو موزون کیجئے اور نغمے میں لیجائیے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ نثر کو بلا موزونیت نغمہ میں نہیں لا سکتے؟ بیشک نہیں۔ کیونکہ جب موسیقی خود موزون ہو تو کلام ناموزوں کو اس میں کھپانا دائرے میں مربع کا چسپاں کرنا ہو۔ جن صاحبوں نے قرآن کی لحنی قرأت کو اور مجالس عزا کی حدیث خوانی کو غور سے سُنا ہے وہ اس بات کو خوب سمجھینگے۔ یہ ہوا نظام کا اصلی موضوع یا (*Function*)۔

۲۔ اسپر ردیف و قافیہ (جنکی ہم آہنگی واقعی خوشی پیدا کرتی ہی) کی زیادتی کیجا سکتی ہو جو رنج کے تاثر میں تازگی بخشنے اور خوشی کے تاثر کو بڑھانے کا کام دیگی۔ یہ اصلیتِ خالص کو اور بھی مرغوب کرنے کی مگر سنگدلوں کو پھانسنے کی ترکیب ہے۔ جو لوگ اس خاص زیادتی کو پسند نہ کریں۔ رنگ پر رنگ چڑھانا نہ چاہیں۔ انکو اختیار ہو اور وہ غلطی پر نہیں۔ یہ زیادتی بہت خطرناک ہو اس لئے کہ اکثر حالتوں میں بعض نفیس نفیس مضامین کو آنے نہیں دیتی۔ اسکی پابندی وہاں تک مناسب ہے کہ نفس مضمون کو مضرت نہ پہنچے نہ یہ کہ پرائی ساری کے پیچھے اپنی آدھی بھی ہاتھ سے جاتی رہے۔

۳۔ حالت سنجیدہ کے لئے موسیقی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ تاثر سے عاری ہو اگر (تاکید) خوبصورتی درکار ہو تو کلام کو موزون کریں۔ ردیف و قافیہ بھی جائز حد تک بڑھائیں اور نغمہ میں بھی لیجائیں۔

۴۔ مضمون مسلسل کہنا منظور ہو تو ردیف قافیہ جہاں تک ممکن ہو آسان لائے جائیں۔ اس لئے کہ زمین سنگلاخ ہوگی تو اُگے گا کیا؟ مضمون غیر مسلسل کہنا ہو تو قافیہ کیسا ہی ہو۔ تاہم اس بات کی کوشش کیجائے کہ قافیہ ہر جگہ اس طرح بندھے کہ نثر منظوم ہو جائے اور نثر کا نظام جہاں تک ممکن ہو کم بگڑے۔ ہنر ناظم کا یہاں دیکھا جاتا ہو۔

۵۔ نظم کے لئے کوئی ایک بحر نہیں۔ موسیقی میں بہت لئیں ہیں اور وُہ جذبات و تاثرات کی کمی زیادتی کے موافق بنائی گئی ہیں۔ خوشی میں وزن کی روانی جتنی چاہیں تیز ہو سکتی ہی لیکن سنجیدگی میں اسقدر کہ زیادہ فکر طلب مضامین اُسکے لُطف میں سمجھ سے باہر نہ ہو جائیں۔ رنجیدگی میں ذا اگر زیادہ تر رنجیدگی کا اثر درکار ہو (روانی اسقدر تیز ہو کہ رنج مبدل بہ خوشی نہ ہو جائے کیونکہ عمق آواز رنج کا نشان ہی اور اس کا خلاف خوشی کی علامت پس گہرے سُر کو جلد ادا کیجیئگا تو اسکی گہرائی کم ہو جائیگی یہی وجہ ہی کہ نیچے سُر زیادہ تر رنجیدہ معلوم ہوتے ہیں اور اُونچے خوش۔ اور اس طرح تیز ہو کہ تال دبی دبی رہے۔ ورنہ یہ اظہار موزونیت اور خوشی پیدا کریگا اور وُہ حالت ہوگی جیسے کوئی کسی کو قہقہے لگا کر رو دے۔ اگر رنجیدگی کا اثر کم درکار ہے اُن لوگوں کے لئے جنکو رنج سے نفرت ہوتی ہے تو لے بھی بڑھائے اور تال بھی دکھائے۔

۶۔ مقفّٰے یا غیر مقفّٰے نظم کی صورتیں یہ ہو سکتی ہیں:۔

(الف) ابیات غزل یا قصیدہ۔ غیر مستزاد یا مستزاد (مضمون مسلسل ہو یا غیر مسلسل)۔

(ب) بند۔ مثنی۔ مثلث۔ مربع۔ مخمس۔ مسدس۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند (مضمون مسلسل یا غیر مسلسل)۔

(ج) وُہ بند جس میں بڑے اور چھوٹے بیت ملے ہوں۔

غیر مسلسل مضامین میں ردیف و قافیہ کا منصب یہ نہیں کہ مضمون کے یکساں ہونے یا مشابہت کی طرف اشارہ کریں۔ بلکہ وُہی منصب ہم آہنگی جو بیان ہوا۔

۷۔ جو نظمیں مقفّٰے یا غیر مقفّٰے (رنج و خوشی کی یا سنجیدگی کی بھی) موسیقی کے لئے لکھی جائیں انہیں فقرے کا ایک بیت پر ختم ہونا ضروری ہی تاکہ گانے میں اگر کہیں سانس لیں تو وقفہ بدنما نہ ہو اور وقفہ ہمیشہ اخیر میں بھلا لگتا ہے جو سنجیدہ مقفّٰے یا غیر مقفّٰے نظمیں موسیقی کے لئے نہ لکھی جاتی ہیں اُن میں یہ شرط نہیں۔

۸۔ نظم کے لئے کسی خاص قسم کے مضامین کی پابندی نہیں ہیں۔ معمولی معقول باتیں (نامعقول بھی ہو سکتی ہیں جب مسخر منظور ہو) بیان کیجیے یا شعر فرمایئے۔ شعر سے میری مراد وُہ موزون کلام نہیں جسکو قائل بالارادہ کہے (معاف کیجئے یہ تعریف غلط ہی) بلکہ وُہ باریک بات وُہ نکتہ جس میں شعور کا کرشمہ ہو خواہ وُہ نظم میں ہو خواہ نثر

ہو ۔ "انّ من الشعر لحکمۃ۔ الشعراء تلامذۃ الرحمٰن"+

نذیر حسین، احمد (انبالوی)

ناوکِ جگردوز

سنسکرت کی مشہورِ زمانہ کتاب "رامائن" میں ایک نہایت دردناک روایت ہے۔ جس کا ترجمہ منشی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے نے ہمارے لئے کیا ہے۔ راجہ جسرتھ اپنی زندگی کا ایک افسوسناک واقعہ بیان کرتا ہے۔ کہ ایک دفعہ اُس سے نادانستہ ایک اندھے جوگی کے اکلوتے بیٹے کو تیر لگ گیا۔ اور اُس جوگی کی بددُعا تھی کہ اُسے بھی بیٹے کا غم کھا جائے۔ کوئی نرم دل شخص اس قصہ کو بغیر چشم تر کئے نہیں پڑھ سکے گا :-

ہوا ایک دن ابرِ تر قطرہ بار کیا صاف جس نے زمیں کا غبار
گھر گھر سے بادل اُگلنے لگا خوشی سے مرا دِل اُچھلنے لگا
شجر اور حجر کو جلاتا ہوا ڈھلا مُنہ کو سورج چھپاتا ہوا
دمِ سرد بھرنے لگی اب صبا تمازت کا چہرہ اُترنے لگا
خوشس آئند تھا بادلوں کا سماں تنے سر پہ تھے جابجا سائباں
چکور اور مینڈک تھے صرفِ طرب ہرن محو تھے شادمانی میں سب
پرندوں کے بھیگے تھے پانی میں پر تاہم اُن کا دامن تھا باراں سے تر
وُہ بیٹھے ہوئے سب سرِ شاخسار پر اور بال لپٹے رہے تھے سنوار
نظر آتے تھے مینہ کی بوچھاڑ سے تل اور کوہ پانی کے انبار سے
یہاں تک کہ پہلو سے اُنکے رواں ہوئے سیل کرتے خروش و فغاں
چلے پتھروں کو بہاتے ہوئے قوام آب و گل کا ملاتے ہوئے
ہر اک سیل یُوں پیچ کھاتا چلا کہ لہرائے جیسے کوئی اژدہا
یہ ساعت کچھ ایسی طرب خیز تھی ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی کچھ ایسی چلی

کہ آیا مرے جی میں بے اختیار — کروں جا کے جنگل میں سیرِ شکار
لیے ہاتھ میں اپنا تیر و کماں — میں بن کو چلا خرّم و شادماں
مری ہر طرف پڑ رہی تھی نظر — سرِ شام پایا کوئی جانور
مگر گھاٹ پر پانی پینے کو آئے — گذرتا ہوا میرے رستے سے جائے
یکایک دھندلکے میں میں نے سُنا — کہ ندی سے قلقل کی اُٹھی صدا
یہ سُنتے ہی میں نے کماں کو سنبھال — لیا اپنے ترکش سے تیر اک نکال
کماں میں وہیں میں نے جوڑا اُسے — اور آواز کے رُخ پہ چھوڑا اُسے
چلایا تھا اٹکل سے میں نے۔ مگر — قضا بن گئی تیر کی راہبر
کسی نے بھری آہ اک دردناک — کیا جس نے میرے کلیجے کو چاک
رشی کوئی تھا بن میں مسکن گزین — یہ لختِ جگر اُس کا تھا بالیقیں
جسے میرا پیکان جا کر لگا — جو ندی میں مجروح ہو کر گرا
یہ لڑکے نے بیتاب ہو کر کہا — "مجھے آہ مجروح کس نے کیا
میرا باپ بیچارہ ہے اک رشی — نہ دی جس نے ایذا کسی کو کبھی
میں آیا تھا ندی کے اس گھاٹ پر — کہ گاگر میں جل بھر کے لیجاؤں گھر
یہ کس نے کیا مجھ کو زخموں سے چور — کیا میں نے تھا کیا کسی کا قصور
نہیں مجھ کو افسوس اپنا ذرا — مجھے ہے خیال اپنے ماں باپ کا
وہ ہیں ناتوان و ضعیف و حزیں — نظر اُن کو آنکھوں سے آتا نہیں
میں اُن بھولی آنکھوں کا تھا رہنما ایک — بڑھاپے کا اُنکے سہارا تھا ایک
گذر اُن کا ہوگا اکیلے محال — خدا جانے کیا اُن کا اب ہوگا حال
نہیں اک مجھے ہی لگا ہے یہ تیر — گیا بلکہ اُن کا بھی پہلو سے چیر"
یہ سُن کر میں ششدر تھا۔ کہ جس کا کبھی — نہ نشانہ تھا اور نہ نیت نہ تھی

کہ مجھ سے کسی کو بھی پہونچے ضرر — لگا خوف سے کانپنے سربسر
سُنا جب کہ وہ نوحۂ جاں گسل — پھٹی میری چھاتی - ہلا میرا دل
کھڑا رہ گیا میں جہاں کا تہاں — گرے ہاتھ سے میرے تیر اور کماں
گیا لڑکھڑاتا میں آخر وہاں — جہاں میرا بسمل تھا نالہ کناں
میں کیا دیکھتا ہوں کہ طفل اک حسین — مسیں جس کی اب تک تھیں بھیگی نہیں
پڑا ہے سسکتا ہوا خاک پر — ہے لبریز حسرت سے اُسکی نظر
ہے بکھری ہوئی اُسکی بھوری جٹا — وہ ہے خاک اور خوں میں لتھڑا ہوا
گھڑا ایک مٹی کا ٹوٹا ہوا — قریب اُس کے ہے اک طرف کو پڑا
جگر تھام کر میں نے دیکھا اُسے — اور اُس نے نظر بھر کے دیکھا مجھے
میرا دل ہوا رنج و غم سے کباب — کیا جب کہ یوں اُس نے مجھ سے خطاب:-
"تیرا میں نے - راجہ - بگاڑا تھا کیا — مجھے آہ کیوں تُو نے گھائل کیا
بھلا اُس پہ کیوں تُو نے ڈھایا ستم — لیا گھور ہتیا کے ہو جس نے جنم
جگر ماں کے بیٹے کے اور باپ کے — کیے تو نے چھلنی اس اک تیر سے
میری ماں کو اور باپ کو انتظار — میرا کر رہا ہوگا اب بیقرار
اُنہیں لگ رہی ہوگی اسوقت پیاس — بندھی ہوگی میرے گھر آنے کی آس
میرے باپ کے پاس اب جلد جا — یہ بپتا میری اُسکو ساری سُنا
سراپ اُس نے ورنہ تجھے گر دیا — بھسم جل کے تو راجہ ہو جائیگا
مگر پہلے ہے تجھ سے میرا سوال — یہ پیکاں سینے سے میرے نکال
کہ جانِ حزیں میری نکلے کہیں — قرار آئے مجھ کو دمِ واپسیں"
یہ کہکر نظر اُس کی پتھرا گئی — گراں اُس پہ تھا عالمِ جاں کنی
بہ آہستگی کھینچ کر میں نے تیر — نکالا - وہی اُس کا دم تھا اخیر

کیا تھا جو بھولے سے مَیں نے گناہ　　خیال اُس کا تھا سخت ہی رُوح کاہ
میرا دِل تھا پامالِ رنج و تعب　　کہ مَیں نے کیا کیا ستم کیا غضب
کھڑا تھا مَیں اِس فکر میں سرنگوں　　تلافی مَیں اِس جُرم کی کیا کروں
اِسی بات کو رہ میں پھر سوچتا　　رشی کے مکاں کی طرف مَیں چلا
نظر مجھ کو آیا پہنچ کر وہاں　　کہ بیٹھے ہیں لڑکے کے باپ اور ماں
ہیں دونوں کو دونوں وہ کور اور ضعیف　　بہت ناتواں اور نہایت نحیف
وہ دو ایسی چڑیوں کے مانند تھے　　جنہیں پر کتر کر کوئی چھوڑ دے
نہ اُن کا کوئی آسرا تھا وہاں　　نہ اُن کا کوئی رہنما تھا وہاں
اُنہیں اپنے بیٹے کا تھا انتظار　　وہ یاد آ رہا تھا اُنہیں بار بار
سُنی پاؤں کی میرے آہٹ جو نہیں　　ہُوا اُس کے آنے کا اُن کو یقیں
رشی میری جانب مخاطب ہُوا　　ملامت کے لہجے میں کہنے لگا :—
"لگائی کہاں تو نے دیر اِس قدر　　تو مصروف تھا کھیلنے میں مگر
ہمیں جلد اک گھونٹ پانی پلا　　ذرا پیاس بیٹا ہماری بجھا
بڑی دیر سے تیری دُکھیاری ماں　　ہے فکر اور چنتا میں بیٹھی یہاں
گھر آ پیارے جلدی اُٹھا کر قدم　　لگائیں تجھے اپنی چھاتی سے ہم
ہماری ملامت کا گر ہو خیال　　اگر تجھ کو اِس سے ہُوا ہو ملال
کہ ماں باپ نے دی ہے جھڑکی تجھے　　تو دِل سے بھلا اپنے بیٹا اُسے
سکھاتا ہے تیرا دھرم یہ تجھے　　کہ بدلا بُرائی کا نیکی سے دے
ہے ہم بے پناہوں کی تُو ہی پناہ　　ہے ہم بے نگاہوں کی تو ہی نگاہ
ہے چُپ چاپ کس واسطے کچھ تو بول　　خُدا کے لئے پیارے مُنہ کو تو کھول
ہے تو ہی فقط اِک ہماری خوشی　　ہماری ترے دم سے ہے زندگی"

میں سکتے کے عالم میں سہما ہوا
یہ باتیں جگر دوز سنتا رہا

سکت بات کرنے کی مجھ میں نہ تھی
زباں میرے مُنہہ میں نہ تھی کام کی

بصد رنج و اندوہ و درد و عذاب
دیا میں نے آخر اُسے یہ جواب :-

"نہیں افسوس بیٹا نہیں ہوں ترا
میں راجہ ہوں کمبخت اس مُلک کا

شکار آج میں کر رہا تھا ادھر
ہوا ایک ندی پہ میرا گذر

وہاں پانی بھرتا تھا بیٹا ترا
لگا تیر بھولے سے اُس کو مرا

بس اب اور کیا اے رشی میں کہوں
فقط تیری کرپا کا محتاج ہوں"

مری اس حکایت نے ڈھایا ستم
نہ تھی کچھ یہ بجلی کے گرنے سے کم

رشی نے جب اس ماجرے کو سُنا
تو غش کھا کے دھم سے زمیں پر گرا

بہت دیر میں ہوش آیا اُسے
وہیں میں نے جھک کر اُٹھایا اُسے

اِک آہِ جگر سوز اُس نے بھری
جھڑی اشک کی اُس کے منہہ پر لگی

دیا یہ جواب اُس نے آخر مجھے
ٹپکتی تھی یاس اُس کے ہر لفظ سے :-

اگر خود بخود تو نہ آتا یہاں
اور اِس ماجرے کو نہ کرتا بیان

تو اس خونِ ناحق کا بارِ گراں
مٹاتا زمانے سے تیرا نشاں

مجھے باور آیا کہ تیرا گناہ
دکھایا ہے جس نے یہ روزِ سیاہ

نہیں تجھ سے دانستہ سرزد ہوا
نہیں اس میں کچھ بھی کسی کی خطا

نہ اے راجہ تو ورنہ بچتا کبھی
تری نسل برباد ہوتی سبھی

ہمیں لے کے چل اب وہاں جلد تر
وہ سویا پڑا ہے جہاں بے خبر

وہ ہے گرچہ آغشتۂ خاک و خوں
اجل نے کیا اُس کو پست و زبوں

مگر دل کا ارماں نکالیں گے ہم
اُسے آخری بار دیکھیں گے ہم"

غرض مار کر دھاڑیں روتے ہوئے
جگر تھامتے جان کھوتے ہوئے

وہ پہنچے میرے پیچھے پیچھے وہاں ۔۔۔ مرا اُن کا بیٹا پڑا تھا جہاں
گرے لاش پر دونوں تفتہ رواں ۔۔۔ ہوا باپ اس طرح نوحہ کناں:۔
"نہیں کرتے کیوں مجھ کو بیٹا سلام ۔۔۔ ہے کیوں میرے پیچاتنے میں کلام
پڑے ہو یہاں کس لئے خاک پر ۔۔۔ خفا ہو گئے ہم سے بیٹا مگر
گئے بھول یا تم وہ آگے کی پیت ۔۔۔ نہیں دل میں باقی ہماری پریت
نہ اتنا بھی روٹھو اٹھو میری جاں ۔۔۔ کھڑی ہے تمہارے منانے کو ماں
سدا حکم تم مانتے تھے مرا ۔۔۔ کبھی تم نے ٹالا نہ ماں کا کہا
نہیں اُٹھ کے لگتے گلے کس لئے ۔۔۔ نہیں بولتے چالتے کس لئے
مرے پاس تڑکے اب آئیگا کون ۔۔۔ مجھے شاستر اب سنائیگا کون
پھل اور پات اب بن سے لائیگا کون ۔۔۔ مجھے لا کے کھانا کھلائے گا کون
تری بوڑھی اور دکھیا ماں کو بھلا ۔۔۔ میں اندھا اپاہج سنبھالونگا کیا
ابھی مرگ کو پیارے تو مت سدھار ۔۔۔ نہیں کر ابھی اور اک دن قرار
چلینگے ترے ساتھ ہم بھی تو کل ۔۔۔ پڑے گا نہ چین اب ہمیں ایک پل
جدا ہم سے بیٹا ہمارا ہوا ۔۔۔ نہ جنگل میں کوئی سہارا رہا
روانہ ہوا اپنا ساماں تو ۔۔۔ سدھارینگے اب ہم بھی بیکنٹھ کو"
غرض کرکے یہ نوحہ پُر الم ۔۔۔ کیا اُس نے بیٹے کا کریا کرم
میں مبہوت و بیخود کھڑا پاس تھا ۔۔۔ پلٹ کر رشی نے یہ مجھ سے کہا:۔
"میرا ایک ہی تھا یہ لختِ جگر ۔۔۔ مگر تو نے مجھ کو کیا بے پسر
اب اے راجہ مجھ پر بھی کر ایک وار ۔۔۔ کہ غم سے رہا ہو یہ جانِ نزار
مگر تیری قسمت میں بھی ہے لکھا ۔۔۔ کہ بیٹے کا غم تجھ کو لے جائیگا"۔

ظفر علی خاں

کمالِ نقص

میں تو بے شبہ ہوں سراپا نقص — دیکھیں اہلِ کمال اپنا نقص
ماہِ کامل میں ہے کلف کا عیب — مہرِ روشن میں ہے گہن کا نقص
ذرّہ ذرّہ سے صاف صاف عیاں — ایک پر ایک کا ہے بالا نقص
چار دن کی ہے چاندنی کی بہار — صاف روشن ہے جیسے تارا نقص
ہات کا میل زر کو کہتے ہیں — سب نے زر ہی کا سنے آشکارا نقص
روزِ روشن کے واسطے شبِ تار — روشنی کے لئے اندھیرا نقص
داغِ افلاس مفلسوں کے لئے — اہلِ دولت کو زر کا توڑا نقص
ہے عجب دھوپ چھاؤں کا عالم — ہنر اس کا جو ہے وُہ اُس کا نقص
نازکی عیب پہلوانوں کا — پہلوانی پری رُخوں کا نقص
حُسن بے ناز بے نمک یکسر — ناز بے حسن انتہا کا نقص
خامشی بے سبب سراسر عیب — سخن بے محل سراپا نقص
زندگی سے جہان میں سب کچھ ہے — اسکو بھی ہے اجل کا کھٹکا نقص
نشے کو بھی خمار لازم ہے — عیش کو ہے یہ حیرت افزا نقص
جرم کا ہے جواہرات پہ جُرم — جوہری پر یہ ہے ہویدا نقص
ہے ہنر کو کساد بازار — کس غضب کا یہ ہے خدایا نقص
علم سے قدرِ اہلِ علم و ہنوز — اس کو ہے مال کا نہ ہونا نقص
سود کو ہیں زیاں کے سو کھٹراگ — نفع کے واسطے ہے گھاٹا نقص
فتح کو ہے شکست کا دھڑکا — رنج کا ہے خوشی میں آنا نقص

دولتیں سب کی سب زوال پذیر
ہائے پیشِ نظر ہیں کیا کیا نقص

اس جہاں میں ثبات ہے کس کو
بے ثباتی بھلا ہے کم کیا نقص

گُل بے خار اس چمن میں نہیں
پھول کے واسطے ہے کانٹا نقص

کہیں اس کے خلاف ہو تو ہے شاذ
شاذ ہونا ہی کیا ہے تھوڑا نقص

آدمی کی خطا سے ہے ترکیب
ڈھونڈنا ہی ہے اُس کا بیجا نقص

نارسا ذہن ناتمام خیال
عقل ناقص ہے اس کا پیدا نقص

کوئی نقصان سے نہیں خالی
کہیں اتنا کہیں ہے اُتنا نقص

ہاں مگر ذاتِ واحدِ مطلق
جس میں حقّا نہیں ہے اصلا نقص

لیکن اے دوست امرِ حق ہے یہی
ق نقص پر ہے نگاہ کرنا نقص

اوّلاً ہوگی یہ غلط بینی
کیونکہ وُہ کم ہے یا زیادہ نقص

سب ہے مخلوقِ خالقِ مطلق
اس کی خلقت میں کچھ دکھانا نقص

نقصِ خلّاق ہے معاذ اللہ
کیوں کہ ناقص ہی سے ہویدا نقص

ثانیاً نقص ہے دلیلِ کمال
کہ اگر مجھ میں کچھ نہ ہوتا نقص

قدرِ اہلِ کمال کیا ہوتی!!
بحقیقت نہیں یہ میرا نقص

ایک فرقِ مجاز ہے ورنہ
کیسا نقصان اور کہاں کا نقص

ناقص آزاد ہر نظر کیوں ہے
آپ کا یہ کمال ہے یا نقص

آزاد عظیم آبادی

تصویرِ عبرت

ہمارے الطاف فرما جناب مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی - رئیس بھیکن پور - المتخلص بہ حسرت جو علیگڈھ کالج کے ٹرسٹی اور مجلس ندوۃ العلما کے سربرآوردہ رکن ہیں - مندرجہ ذیل نظم مخزن کو عنائت کرتے ہیں - وہ حال میں لاہور میں بتقریب جلسہ انجمن حمایت اسلام تشریف لائے تھے - اثنائے قیام میں جو نورجہاں کے شکستہ مقبرہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا - تو عبرت کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی - اسی کو اب انکے قلم جادو رقم نے کاغذ پر اُتارا ہے - اس نظم میں خوبی یہ ہے کہ شاہ جہانگیر کی زبانی وہی خیالات ظاہر کئے گئے ہیں - جو اُس جیسے غیور بادشاہ کی زبان سے نکل سکتے - اور نورجہاں کے وہی اوصاف باندھے ہیں - جو اُس کی خصائل کے زیور تھے :-

بزم اک* لاہور میں ہے خادمانِ قوم کی
جنکے دل سے لگ رہی ہے فکر شانِ قوم کی

رات دن سرگرم سب کے سب اسی کوشش میں ہیں
جس طرح سے بن پڑے اسلام کی خدمت کریں

حسرتِ بیدل بھی اب کے شاملِ محفل ہوا
رنگِ محفل سے سرورِ بیکراں حاصل ہوا

بلبلانِ قوم کے جب چہچہے سب سن لئے
شہرِ خاموشاں میں جا نکلا میں عبرت کے لئے

پھرتے پھرتے مرقدِ نورجہاں آیا نظر
مقبرہ تھا وہ کہ تھا تصویرِ عبرت سر بسر

کل تھا جس کی شان پر عالم کا دل آیا ہوا
آج عالم بیکسی کا اُس پہ ہے چھایا ہوا

جس کے رتھ کو ہانکتا تھا بادشاہِ روزگار
گردشِ گردوں سے یوں تاراج ہوا اُسکا مزار

چوٹ سی دل پر لگی - اُجڑی وہ حالت دیکھکر
جان ہی پر آبنی - بگڑی وہ صورت دیکھکر

دل کی آنکھیں کھل گئیں غفلت کا پردہ اُٹھ گیا
بیخودی نے مجھ کو دکھلایا تماشا اک نیا

شکل اک آئی نظر استادہ بافرِ شہی
جو عجب حسرت سے روضہ کی طرف تھی دیکھتی

اُس کی پیشانی سے رعبِ سلطنت تھا جلوہ گر
اُس کی چتون سے برستا تھا غضب کا کرّ و فر

دل نے آہستہ کہا یہ ہے جہانگیرِ غیور
مقبرہ میں سونے والی اُس کے دل کی تھی سرور

دیر تک تو ضبط بیتابیٔ دل کرتی رہی ۔ جوشِ بیتابی سے وہ مجبور آخر ہو گئی
آہ کھینچی ایک اُس نے ، دل اندوہگین ۔ یوں کیا اظہارِ دردِ دل بآوازِ حزیں
کیا اُسی بیگم کا یہ ہے خوار خستہ مقبرا ۔ برسوں ڈنکا جس کا ملکِ ہند میں بجتا رہا
میں نے جس کے سر پہ قرباں چترِ شاہی کر دیا ۔ جس کی جوتی کے تلے اورنگِ شاہی دھر دیا
جسکے قدموں پر فدا کر دی تھی میں نے سلطنت ۔ جسکے آگے سر جھکا دیتے تھے اہلِ مکنت
جس کی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی ۔ جسکی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی
آہ وہ ایامِ عشرت اور وہ لیل و نہار ۔ بلبلِ آمل* چہکتا دیکھ کر جن کی بہار
جس کی رنگیں بزم رشکِ روضۂ فردوس تھی ۔ بیکسی سے اُسکے روضہ کی ہے کیا صورت بنی
ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں ۔ کونسا گوشہ ہے تربت کا کہ جو توڑا نہیں
بذلہ سنجی سے خجل ہوتی تھی جس کے پھلجھڑی ۔ حیف وہ خاموش آغوشِ لحد میں ہے پڑی
قصر میں بچھتا تھا جسکے فرشِ دیبا و حریر ۔ آہ فرشِ خاک پر سوتی ہے وہ ماہِ منیر
جمگھٹے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر ۔ آہ اُس کی قبر پر اب بیکسی ہے نوحہ گر
سیج پر پھولوں کے سوتی تھی کبھی جو نازنیں ۔ پھول دو سوکھے بھی اُسکی قبر پر چڑھتے نہیں
جس کی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر ۔ خشک† کانٹوں کا پڑا ہے ڈھیر اسکی گور پر
حُسن جس کا تازگی بخشِ گل و گلزار تھا ۔ آہ قسمت میں لکھا اُس کی لحد کے خار تھا
قصر میں جلتی تھیں جس کے شمعہائے عنبریں ۔ حیف روشن اک دیا بھی قبر پر اُسکی نہیں
نام روشن ہے جہاں میں آہ جس کا سر بسر ۔ نام کو بھی روشنی آئے نہ اُس کی قبر پر
کر دیئے جس نے بہت سے صاحبِ طبل و نشاں ۔ اِس شکستہ مقبرہ میں وہ پڑی ہے بے نشاں
جس نے صد ہا خلعتِ دیبا و اطلس دے دیئے ۔ حیف تر ہے اُس کی تربت ایک چادر کے لئے
لونڈیوں پر جسکے تھی پوشاک کل زربفت کی ۔ آج دیواریں ہیں اُس کے روضہ کی ننگی کھڑی

* مراد ملک الشعرا طالب آملی ۱۲ † جب راقم نے نورجہاں کی قبر دیکھی تو اُس پر ببول کے کانٹوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا ۱۲

اتنا کہہ کر ہو گئی خاموش دم بھر کے لئے
تیکھی چتون سے ادا پھر اُس نے یہ کلمے کئے

مانا مرقد پر ترے اِک لو بھی پیدا نہیں
نقش نام نیک لوح دل سے مٹ سکتا نہیں

نیکناموں کے نشاں باقی رہینگے حشر تک
کیا ہوا اگر دورِ گردوں نے مٹا دی قبر تک

گر نہیں ہے گور پہ اُس کے دیا تو کیا ہوا
ہے جہاں میں نور اُس کے نام کا پھیلا ہوا

حسرت شروانی

وقت

اے وقت! وقت پیارے! پچھتا رہی ہیں کھو کر
ممکن نہیں جو ہو تو مر کر بھی اب میسر

کیا تیری خوبیوں کا اظہار ہو کسی سے
قیمت نہیں ہے تیری انمول ہے جواہر

وہ غفلتوں کا پردہ ہم پر پڑا ہوا تھا
دیکھا نہ ہم نے تجھ کو کھولی نہ آنکھ دم بھر

تعریف کی صفت کی پہچان تیری کچھ بھی
آئی نہ ہم کو ہرگز۔ افسوس! بیخودی پر

لیکن عزیز تجھ کو جس جس کسی نے سمجھا
گھوڑے اُڑا رہے ہیں وہ آجکل ہوا پر

ذی فہم آج وہ ہیں اقبال ہے انہیں کا
قسمت انہیں کی اچھی وہ ہی تو ہیں سکندر

ڈنکے بجے ہوئے ہیں عالم میں اب انہیں کے
اُنکی خوشی کے نعرے ہیں چرخ چنبری میں

یورپ کی دھاک ساری دنیا میں بندھ گئی ہے
یورپ کا ذکر جاری ہر ایک کی زباں پر

وقعت ہے گر تو انکی شہرت ہے گر تو انکی
کیا وجہ؟ کیوں ہوا یہ؟ اس کا سبب بھی آخر

یہ اس لئے کہ یہ سب تیری عنایتیں ہیں
ممتاز جانتے تھے تجھ کو یہ سب سے بڑھ کر

اِک اِک منٹ کی قیمت تھی جان سے زیادہ
ایک ایک گھڑی کے بدلے تھا آبرو کا منبر

کچھ بھی ہوا بلا سے کچھ بھی گیا بلا سے
جو کام آج کا تھا چھوڑا نہ اُس کو کل پر

جب ہی تو آج انکا ثانی ڈھونڈے سے بھی نہ پایا
جب ہی تو وہ ترقی امکان سے ہے باہر

اک قوم ہے ہماری جو محض بے خبر ہے — عشرت پسندیوں نے چھوڑا اسے مٹا کر
تجھ سے نہ اسکو اُلفت واقف نہ ملک سے یہ — دونوں سے ہاتھ دھوئے قربان یکرخی پر
ہوتے نہ یوں پشیماں کرتے نہ یوں تاسف — یوں ٹھوکریں نہ کھاتے پھرتے نہ ہائے دردر
گر قدر جانتے ہم کرتے نہ ہم تکاہل — گر بات مان لیتے چھوٹے بڑوں کی سُنکر
ہوتے ذلیل ایسے ہوتے نہ خوار ایسے — روتے نہ ہم کسی پر۔ ہنستا نہ کوئی ہم پر
گر اب بھی ہوش آئے کچھ بھی نہیں ہے بگڑا — کرنا ہے جو وہ کرلیں۔ اُٹھیں بڑھیں سنبھل کر
دیکھیں ہوا کدھر کی عالم میں چل رہی ہے — سمجھیں یہ کس طرف کو بہتا چلا سمندر
وُہ کام اب نکالو جو نام لے کے نکلے — وُہ جام اب پیو تم جو ہوش کا ہو ساغر
انساں کو چاہئے یہ سب کام وقت پر ہوں — کل پر نہ رکھے کوئی ہرگز کبھی اُٹھا کر
جس نے کہ وقت پیارے تجھ کو عزیز جانا — وُہ کامیاب نکلا دیکھا گیا ہے اکثر
یہ تھی صدا اثر کی یہ تھا بیان اُس کا — کرتا ہے نظم اپنی اب ختم وُہ دعا پر
توفیق دے الٰہی پہلی سی پھر وُہ ہم کو — جو نام پھر ہمارے دُنیا میں ہوں منوّر

احمد اللہ بیگ (اثر)۔

ہمہ اوست

(ترجمہ از کاؤپر)

مجھ کو وُہ وقت خوب یاد ہے۔ جب میں نے ایک ابتدائی درجہ میں کاؤپر کی دلچسپ نظم "گاڈ اِن نیچر" کا سبق پڑھا تھا۔ اِس نظم نے میرے دِل پر نہایت گہرا اثر کیا اور یہ امر میرے ذہن نشین ہوگیا کہ اگر خدا کا فضل شاملِ حال ہو تو بشر کو تیرہ و تار مقام میں بھی صراطِ مستقیم کے شاہراہ کا سُراغ مل سکتا ہے اور ظلمت کی مہلک تاریکی میں بھی چشمۂ حیوان کی جھلک نظر آسکتی ہے۔ یہ نظم توصیف توحید باری تعالےٰ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور خواہ کچھ ہی ہو اِس میں

شک نہیں کہ اس کا مصنف اچھا خاصہ موحد تھا۔ اس نظم کے ساتھ مجھ کو ہمیشہ دلبستگی رہی اور میرا دیرینہ اشتیاق اپنے شوخ ہاتھوں سے اسکا اردو ترجمہ پیش کش کرتا ہو (مترجم)۔

ہر شے میں جلوہ گر ہے اِک پاک ذات پیارے
ساری ہی جسم و جان میں کرتی ہے کام سارے

مخلوق ہے اُسی کی کل کائنات صحرا
سنسان جنگلوں میں جلوہ ہے اُسکا پیدا

یہ نخلہائے رنگیں جو فخرِ باغباں ہیں
املاک میں اُسی کے آثار خود عیاں ہیں

نیچر کی زینتیں ہیں فیض و کرم سے اُسکے
ترتیبِ سال و مہ بھی دستِ کرم سے اُسکے

سرما کے واسطے ہے ایک خاص حد مقرر
بڑھنے نہ پائے آگے تا اس سے وہ قدم بھر

جاڑے کی اس لئے یہ کم کی گئی ہے شدت
خنکی سے اُس کی پہنچے مخلوق کو نہ کلفت

تخموں کو اس طرح سے محفوظ کر رکھا ہے
پہنچے جو نہ کو اُس کی کوئی مجال کیا ہے

اِک فصلِ گل گذرنے پائی نہیں کہ فوراً
پھولوں سے دوسری کے آراستہ ہے گلشن

پروردگارِ عالم - ہے سب میں جلوہ افگن
رُوحِ رواں ہے اُس کی یہ جسم و جان ہیں روشن

معلول گر ہے فطرت علت وہی خدا ہے
یکتا ہے - لم یزل ہے - مختار دوسرا ہے

ہر پھول میں شجر میں - ہر برگ میں - ثمر میں
نقش و نگارِ قدرت مضمر ہیں مستتر ہیں

پھولوں کی شوخ رنگت اور بھینی بھینی خوشبو
چشمانِ مست و نیگوں - جملہ میں مستغرق ہو

دانوں میں شکل ریزہ اشکال ہیں جو پنہاں
اُن سے زمیں کو کرتا آباد ہے وہ ذیشاں

ہے مقدم جو اس کے دلشاد بس وہی ہو
معمور ہے جو اس سے آباد بس وہی ہے

اوراقِ گل ہوں محی یا بوئے نسترن ہو
شمشاد ہو سہی ہو یا سبزۂ چمن ہو

دلبستگی ہے گل سے - رکھتی ہے اسکو ہر آں
ان سب کی دید و بینش یادِ خدا میں رقصاں

محی الدین صدیقی (از لکھنؤ)

کچکول

ضد تو دیکھو کیسے کیا وہ سست پیماں ہو گیا | ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

(دانشمند ہوشیار پوری)

دریا میں تیرے تیر مژہ کا پڑے جو عکس | سوراخ ہو ہر اک گہر آبدار میں

(رر) (گویا)

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرت ماہ | ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے | تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

تیرے کوچہ کا ہے مائل دل مضطر میرا | کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب | سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

(رر) (غالب)

نظر لگے نہ کہیں انکے دست و بازو کو | یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

(رر) (رر)

انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق | وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(رر) (رر)

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا | زہر غربت شکر فروشوں کو ملا

جب لخت جگر کھانے لگی پیاس منیر | کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

(رر) (منیر)

میری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے | کوئی لادے در پیر مغاں سے

کہ انکو جوڑتے ہی توڑ ڈالوں | پھر اک جام شراب ارغواں سے

(رر) (مجروح)

اب ایسا دل کہاں سے لاؤں انکی نذر کرنیکو — نہ جس میں کوئی ارماں ہو نہ جس میں کوئی حسرت ہو
وہ شب آئے کہیں تم شرم کے پتلے بنے چپ ہو — ستاتے ہوں تمہیں ہم کوستی ہم کو نزاکت ہو

(معلوم) — (ریاض)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

(محمد سعید احمد) — (غالب)

اب تو ہر بات پہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

(میر) — (ذوق)

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں — پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے
قیامِ روح پہ قالب میں اعتبار نہ کر — کچھ اعتبار نہیں میہماں رہے نہ رہے
بس شباب ہے کیا اعتبارِ جمعِ حواس — کہ ایک شب میں سوا کارواں رہے نہ رہے

(میر) — (امیر مینائی)

وہی ہے آہ کی کثرت سے دل کی کیفیت — ہوا کے وقت جو حالِ حباب ہوتا ہے

مرقع عالم

رند مشرب تجھے سنتا ہوں خدا کہتے ہیں — جو تجھے کہتے ہیں محبوب بجا کہتے ہیں
حسن کو لوگ ترے ہوش رُبا کہتے ہیں — میٹھی باتوں کو تری روح فزا کہتے ہیں
ہم ترے در کو صنم دارِ شفا کہتے ہیں — دردِ جاں کی ترے جلوے کو دوا کہتے ہیں
آپ تو ہم کو بُرا صبح و مسا کہتے ہیں — ہم بُرائی کے عوض ہیں کہ دُعا کہتے ہیں
زاہد و شیخ تو کیا جانئے کیا کہتے ہیں — رند رندی میں سبھی کچھ تو روا کہتے ہیں
اک لطف بھی یہ کہو بات بھی کوئی نہ کہو — جانِ عشاق! اسی کو تو جفا کہتے ہیں

یہ لطف میں بھی گانٹھ سے کچھ کھلتا ہے
پھر نہ کہیو کہ ہمیں لوگ برا کہتے ہیں

ہم نے سوزش کے سوا اس میں نہ دیکھا کچھ اور
جی لگانے میں بہت لوگ مزا کہتے ہیں

لوگ مرنے میں بھلا کیونکہ فنا کہتے ہیں
نقل کرتے ہیں مکاں ہم تو بقا کہتے ہیں

یہ تم ہی ہو کہ وہاں آج ہو اور کل تھے یہاں
مر رہے جاء ہیں ہم اس کو وفا کہتے ہیں

پوچھیو کوئی ترا چاہنے والا تو نہ ہو
مر گیا ایک جواں آج قضا کہتے ہیں

مر گئے جب تو کوئی فرق ہی باقی نہ رہا
سبھی اچھے ہیں کسے لوگ برا کہتے ہیں

وہ اگر حال ہمارا کبھی تجھ سے پوچھیں
قاصدا کہیو یہی تم کو دعا کہتے ہیں

(میر نذیر حسین احمد)

شمع و پروانہ

پروانہ تجھ کو کرتا ہے اے شمع پیار کیوں؟
مرتا ہے اپنی جان کو تجھ پر نثار کیوں؟

وہ بات تجھ میں کیا ہے کہ یہ بے قرار ہے؟
جاں در ہوائے لذتِ خوابِ مزار ہے؟

کیوں بے قرار کرتی ہے تیری ادا اسے؟
آدابِ عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟

کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برقِ نگاہ کا!

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہو گیا
شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہو گیا

غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو
اس تفتہ دل کا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو

بے اختیار سوز سے تیرے بھڑک اٹھا
قسمت کا اپنی بن کے ستارا چمک اٹھا

گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے

کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے

تھوڑی سی روشنی پہ فدا ہو رہا ہے یہ
اک نور ہے کہ جس میں فنا ہو رہا ہے یہ

پروانہ کیا ہے؟ اک دلِ ایذا طلب ہے یہ
عینِ وصال و سوزِ جدائی غضب ہے یہ!

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

(سید محمد تقی - وٹرنری اسسٹنٹ)
(اقبال)



رسٹ واچ
ترکی ٹوپیاں
بجلی لیمپ
ہنسی کا آلہ
تمام درخواستیں بنام شیخ رحیم بخش سوداگر متصل انارکلی بازار لاہور آنی چاہئیں



خالص چاندی کے زیورات جو مطابق رسم و رواج اپنے ولایت کے بنوائے گئے ہیں اگر ناپسند ہوں تو واپس کر دیں
انگوٹھی خالص چاندی کی
انگوٹھی چاندی کی
انگوٹھی طلائی کا
خالص چاندی
خالص چاندی کی چمپاکلی
سنہری
سنہری گھنگرو
سفید
بالیاں سفید
جھانجھن سفید
سفید جرمن سلور کی
تمام درخواستیں بنام شیخ رحیم بخش سوداگر متصل انارکلی بازار لاہور آنی چاہئیں

تازہ ترین رائیں

ہم اس سے پہلے **مخزن** کی بابت معزز معاصرین کی رائیں درج کر چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ بوجہ گنجائش کی کمی کے نہ تو اُن سب کے چھاپنے کی نوبت آئی۔ اور نہ جتنی چھپیں مکمل چھپ سکیں۔ گو سال بھر عنایت بھرے الفاظ میں اخبارات نے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔ تاہم حال میں دو ایسے ممتاز۔ عالم اور سخن فہم بزرگوں نے اس رسالہ کو ریویو کی عزت بخشی ہے۔ کہ ہم انکی تعریف کو مایہ ناز سمجھتے ہیں۔ نواب محسن الملک بہادر۔ آنریری ایڈیٹر علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ و نواب عزیز جنگ بہادر ایڈیٹر و مالک رسالہ تکمیل الاحکام حیدرآباد دکن نے اپنے قابل پرچوں میں نہایت قدر افزائی کی رائیں لکھی ہیں جنکے اقتباس حسب ذیل ہیں:۔

اُردو زبان کا نہایت عمدہ اور دلچسپ میگزین جسکا نام مخزن ہے اور جو شیخ عبد القادر بی۔ اے ایڈیٹر آبزرور لاہور کی ایڈیٹری میں لاہور سے شائع ہوتا ہے اس کے متعدد نمبر ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔ یہ رسالہ کیا بلحاظ لکھائی اور چھپائی اور کیا بلحاظ مضامین کی پاکیزگی اور دلچسپی اور انکی تنوع و تنسیق کے ایک ایسا رسالہ ہے جسکو اردو زبان کے موجودہ میگزینوں اور گلدستوں میں خاص امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے۔ غرضکہ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ نہایت مفید اور پاکیزہ و دلچسپ ہے اور اس کی نسبت یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ وہ ادب و علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ ہے۔ ہم کو امید ہے کہ وہ حضرات جو ذوق سخن سے چاشنی گیر ہیں اور جو اردو زبان کی ترقی کے دل سے خواہاں ہیں وہ ضرور اس رسالہ کی قدر کرینگے۔ (علیگڈھ گزٹ مورخہ ۱۷۔ اپریل ۱۹۰۱ء)

اس رسالہ مخزن کا دل سے شکر گذار ہوں جو لاہور سے شائع ہوتا ہے جسکو لائق ایڈیٹر جناب مولوی شیخ عبد القادر بی۔ اے مالک مخزن و ایڈیٹر آبزرور ہیں۔ یہ وہی فخر قوم ہیں جنکی عمدہ قابلیت کی تعریف ابھی ابھی مدراس ایجوکیشنل کانفرنس میں ہز ایکسلینسی لارڈ مدراس نے پبلک مجمع میں کی تھی۔ اس رسالہ کے مضامین سے بہرہ مختصر رسالہ کو بہت بڑی [illegible] ہے جس قابلیت اور اعلیٰ مذاق کے ساتھ اس رسالہ کا ہر ایک مضمون مرتب ہوتا ہے وہ اسکے لائق مؤلف کی جوہر قابلیت [illegible] اس رسالہ کا خط نسخ اور نستعلیق دونوں کی شان کے ساتھ اس کا کاغذ اپنی آپ مثال ہے ٹیٹل پیج کا دل [illegible]

جلد (۳) مئی سنہ ۱۹۰۲ء نمبر ۲



مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی اے

مضامین نثر

مضامین نظم

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے -

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبد القادر بی اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

[illegible] ہر مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مشہور [illegible]

[illegible] اور ہمارا اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں [illegible]

[illegible] شوق سے اس کے بنانے میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں [illegible]

مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے [illegible]

کی تقطیع [illegible] ہر ورق [illegible] ہے۔ **قیمت** عمدہ دبیز ولایتی کاغذ پر [illegible] لکھائی [illegible]

اور دوم درجہ کے کاغذ پر دو روپیہ ہے۔ اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی چھپائی اور [illegible]

ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا۔ محصول ڈاک دونوں صورتوں میں ۴ آنہ سالانہ ہے ۔ درخواست [illegible]

خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنی چاہیئے۔ ابعد کا کوئی حساب نہیں [illegible] نمونہ [illegible]

پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں ۔۔۔۔۔۔ شیخ عبدالقادر ایڈیٹر

شرح اُجرت اشتہارات

مخزن اشتہارات کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ اس کے [illegible]اروں کی لمبی فہرست میں پنجاب کے لوگ بھی
اور صوبجات متحدہ و اودھ کے بھی۔ اضلاع دکن اور حیدرآباد میں بھی بکثرت بکتا ہے۔ اور وہاں کے امرا اور روٴسا
کی ایک کثیر تعداد اس کے قدردانوں میں ہے۔ شمالی ہندوستان کے بھی معزز ترین مسلمانوں کے اسمائے گرامی
فہرست میں شامل ہیں۔ اس لئے اس کے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیت اشتہار کا اندا
کر سکینگے۔ ایک سہ ماہی کے لئے آزما کر اگر فائدہ نظر آئے تو سال بھر کا معاہدہ کریں۔ اُجرت اشتہارات فی صفحہ
(سال بھر کے معاہدہ کے لئے) للعہ ششماہی کے لئے عـہ اور سہ ماہی کے لئے لعہ روپیہ۔ فی نصف صفحہ
کے واسطے عـہ روپیہ ششماہی کے واسطے لعہ اور سہ ماہی کے لئے صہ۔ اتفاقی اشتہارات کے لئے ۲ روپیہ فی [illegible]
اس شرح میں کمی کی گنجائش نہیں۔ **شیخ عبدالقادر** مالک ایڈیٹر

مخزن

تبادلۂ خیالات

(۱)

جناب مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جو مضمون نگاری میں محتاجِ تعریف نہیں ہماری درخواست پر از راہ عنایت یہ سلسلہ مضامین شروع کرتے ہیں۔ امید کہ ناظرین اس سلسلہ کو اُس دلچسپی سے پڑھینگے جسکی مرزا صاحب موصوف کی تحریریں مستحق ہوتی ہیں:۔

کوئی چارہ تھا نہ مجبوری میں کوشش کے سوا
رہنمائے منزل مقصد ضرورت بن گئی

دُنیا میں جو جو واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ لوگ اُنکی وقوعی حالتوں یا تکلیفات کو محسوس کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں ایک حالت دُوسری حالت سے بدل جاتی ہے ایک کیفیت یا ایک حالت کے بعد دُوسری کیفیت یا دوسری حالت آتی اور اپنا رنگ جماتی ہے۔

ان حالات میں یہ کہنا پڑیگا کہ دُنیا میں جو کچھ وقوعہ ہوتا ہے اُس کے آثار باقی رہتے ہیں اور ہر ایک وقوعہ معدوم ہونے سے پہلے اپنا اثر اور اپنا رنگ چھوڑتا ہے۔

مجموعۂ عالم میں جس قدر ترقیاں ہوئیں یا اب ہو رہی ہیں۔ یا جو آیندہ ہونگی اُنکا وجود

یا حدوث مجموعی طاقتوں یا اسباب سے ہوا ہے یا ہوگا۔ اگرچہ بظاہر اسباب دُنیا کا ہر ایک کام فرداً فرداً ہو رہا ہے اور ہر کارکن بجائے خود اپنا ہی بہی خواہ اور اپنا ہی مزدور ہے۔ لیکن درحقیقت ایک فرد دُوسرے کا غلام اور ایک طاقت دُوسرے کی مقید اور پابند ہے۔

ایک بڑھئی یا ایک لوہار اپنے پیٹ کی خاطر یا صرف اپنے واسطے مزدوری کرتا۔ اور طرح طرح کی کاریگریاں دکھاتا ہے مگر حقیقت الامر یہ ہے کہ وُہ اپنے فائدہ کے ساتھ ہے دوسروں کی خدمت بھی کرتا ہے۔ چاہے کوئی شخص کوئی کام کسی ہی نیت اور کسی ہی خودغرضی سے کرے اُس میں دُوسروں کا فائدہ یا نقصان ضرور ہوتا ہے۔

اگر ایک شخص بے وقوفی سے خودکشی کر بیٹھے تو گو وُہ اپنی ہی جان کھوتا ہے لیکن چشم غور سے دیکھو گے تو پتہ لگ جاویگا کہ اُس کی اس بزدلانہ حرکت نے اُسے یا اُس کے خاندان کو ہی ہلاکت میں نہیں ڈالا بلکہ اور افراد پر بھی مہلکانہ اثر کیا ہے بعض پر مالی اثر پڑا ہے۔ اور بعض پر اخلاقی اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ جو کچھ کرتا ہوں اپنی ہی خاطر کر رہا ہوں یا یہ کہ دنیا کے دُوسرے افراد اس کے واسطے کچھ بھی محنت اور کلفت نہیں اُٹھاتے تو یہ اس کی ایک فاش اور عملی غلطی ہوگی۔ زید تمام دُنیا کا خود بھی مزدور ہے اور ساری دُنیا اُس کے واسطے بھی مزدوری کرتی ہے۔

مختلف محنتوں اور کلفتوں کا آپس میں ایک عمدگی کے ساتھ تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور ایک محنت یا کلفت دوسری محنت یا کلفت کی قائمقامی کرتی ہے بعض لوگوں نے اس اندرونی تبادلہ پر غور نہیں کیا اور نہ یہ سمجھا ہے کہ محنت محنت کا معاوضہ کیونکر ادا کرتی ہے۔ اگر ایک نقشہ بناکر دیکھا جاوے کہ محنتیں کیونکر متبادل ہوتی ہیں تو کہنا پڑیگا کہ گو محنت کرنے والوں کو علم نہ ہو لیکن ایک محنت دُوسری محنت سے روز ادلتی بدلتی رہتی ہے اور اس کے سوا گذارہ نہیں۔

وقوعی صورتیں اور عملی کیفیات ہی متبادل نہیں ہوتی ہیں اور یہ مفید رسم ابھی تک

جاری نہیں بلکہ خیالی دُنیا میں بھی یہ سلسلہ جاری اور قائم ہے۔ جس طرح ایک ٹرین ہر دن اور ہر گھڑی ہزاروں سواریوں اور لاکھوں من مال کا تبادلہ کرتی اور شہروں کی رونق یا بے رونقی کا باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح خیالات کی ٹرین لاکھوں خیالات کو تبادلہ کی صُورت میں اِدھر اُدھر ڈھالتی پھرتی ہے۔

گو بہت لوگ تبادلۂ خیالات کی دھیمی اور غیر محسوس رفتار کو محسوس نہ کرتے ہوں اور اُنکے نزدیک دُنیا کی خیالی ٹرین ایک ہی محدود دائرے میں چل رہی ہو مگر درحقیقت ہر لمحہ اور ہر لحظہ خیالات کی ٹرین مختلف لائینوں پر آتی جاتی ہے اور سلسلہ خیالات میں نشو و نما اور کمی بیشی یا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔

اِس تبادلہ پر دنیا کی رونق اور ترقی کا مدار ہے اس کے سہارے یہ دھندا چل رہا ہے اسوقت دُنیا کی منڈی کو جو یہ رونق اور یہ جوبن حاصل ہے اس کا اصلی موجب کیا ہے۔ بس یہی تبادلہ۔

اگر یہ نہ ہوتا تو وُہ بابا آدم والی پورانی کھٹیا اور پٹّوں کی مقدس جلی نظر آتی

ہمیں بامعان نظر دیکھنا چاہیے کہ

(الف) دُنیا کی ترقی کس امر پر موقوف ہے۔

(ب) تبادلہ کیا ہے۔

(ج) اُس کے اقسام کیا ہیں۔

(د) تبادلہ کی سودمندی یا ناسودمندی کا معیار کیا ہے۔

(ہ) تبادلہ کی اعلیٰ غرض کیا ہے۔

(و) بلحاظ ضرورت اور عدم ضرورت کے تبادلہ کا اثر کیا ہے۔

(ز) بالفاظ دیگر تبادلہ کیونکر تعبیر کیا گیا ہے۔

(ا) گو دنیا کی ترقی کا ایک اصُول یا ایک طریقہ نہیں ہے لیکن مشاہدات اور تجربوں نے

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ دنیا کی ترقی اور بہبود کا مدار غالباً مندرجہ ذیل امور پر موقوف ہے۔

اوّل۔ معاشرتی ضروریات کے واسطے جو امور ضروری الاخذ ہیں وہ مہیا کئے جائیں۔

دوم۔ جن امور اور جن کوائف سے معاشرتی اغراض کا تعیّنہ ہوتا ہو وہ موجود ہوں۔

سوم۔ مادی اور معاشرتی مشکلات نہ رہیں۔

چہارم۔ دنیا کی منڈی میں باعتبار معاشرتی اصولوں کے جو جو مواد مہیا ہوچکے ہیں انکو قیام اور جدید مواد کی تکمیل اور ظہور ہو۔

پنجم۔ جو امور اور جو کوائف مخفی ہیں انکا اظہار کیا جاوے۔

ششم۔ جو باتیں اور جو کمالات ایک فرد یا ایک گروہ کو حاصل ہیں۔ دوسرے بھی ان سے مستفید ہوں۔

ھفتم۔ نقص اور خوبی کے اعتبار سے دنیا کے معاملات میں ایک تمیز اور حد فاصل واقع یا حائل ہو۔

قریباً یہی سبعۂ ضروریہ ہیں کہ جس پر دنیا کی ہر ایک قسم کی ترقی کا انحصار اور مدار ہے۔ اور انہی مواد کی تحصیل میں دنیا اور دنیادار سرگردان اور حیران ہیں۔

۲۔ ایک ہستی یا ایک وجود جب دوسری ہستی یا دوسرے وجود کو دیکھتا یا اس سے کچھ سنتا یا پاتا یا حاصل کرتا ہے خواہ وہ عینی ہو یا حسّی یا لمسی یا وہمی تو وہ ایک تبادلہ کرتا ہے۔

یا یوں کہو کہ۔ تبادلہ۔ رویت۔ احساس۔ لمس۔ تخیل۔ وہم۔ تصور تخاطب مکالمت۔ اور تداول کا ایک انتقالی نام ہے۔ یعنی ان کوائف کا انتقال

ایک تبادلہ ہے۔

۳- تبادلہ کی قسمیں حسب ذیل ہو سکتی ہیں۔

(الف) عینی۔

(ب) سمعی۔

(ج) وجدانی۔

(د) حسّی۔

(ہ) لمسی۔

(و) وجودی۔

(ز) خیالی۔

عینی۔ جب انسان یا کوئی اور ذی رُوح دوسری ہستی یا دُوسرے وجود کو دیکھتا یا پاتا ہے تو اس وقت اُس کے عینی ادراک سے اُس کے ذہن اُس کے باطن۔ اُس کے حواس پر ایک نیا اثر ہوتا ہے وُہ اپنے دل اور اپنے دماغ میں ایک حرکت اور ایک جذب محسوس کرتا ہے۔

وہ جذب اور وُہ عینی احساس ایک تبادلہ ہے کیونکہ جس طرح اس کے دل و دماغ پر ایک اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح دُوسری ذات متاثر ہوتی ہے۔ جب ہم ایک جرمنی یا ایک چینی کو دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہیں اپنے دل اور اپنے دماغ میں اُن تازہ معلومات کا ایک ذخیرہ بناتی ہیں اور اُس ذخیرے سے خیالات پر ایک مسلسل اثر پیدا ہو کر نئی نئی صُورتیں وجدانی طور پر متمثل ہو کر ایک جدید راہ اور ایک نیا نقشہ دکھاتی ہیں۔ عام اس سے کہ وُہ جدید راہ یا جدید نقشہ اثر کے لحاظ سے کس حیثیت کا ہو۔

ہم اپنی آنکھوں اور اپنی دوربین نگاہوں کو مفت ہی صرف نہیں کرتے بلکہ

اُن کی بدولت اوروں سے کچھ لیتے ہیں اور خود انکو کچھ بخشتے ہیں قبل اس کے کہ ہم نے کسی جدید وجود یا جدید ذات کا مطالعہ نہیں کیا تھا ہمارے دل یا ہمارے دماغ میں کوئی یا کسی قسم کا علمی اثر نہیں تھا۔ لیکن جوں ہی کہ صورتِ ناظر حائل ہوئی ایک علمی اثر پیدا ہوگیا۔ ہماری نظریں جدا ہوگئیں اور ہماری نگاہوں میں ایک بُعد حائل ہوگیا لیکن ہمارے دلوں میں ایک کیفیت نمودار ہوتی جاتی ہے ہم بہ نسبت پہلے کے اپنے آپ کو ایک سودمندی یا ناسودمندی کی حالت میں پاتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں اور ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے صفحۂ قلب پر کونسا انوکھا نقش یا عکس اُتر رہا ہے۔

نگاہیں جُدا ہوگئیں اور دلوں نے اُن سب کوائف کو دیکھ لیا۔

اشکے کہ مرا زچشم نم دیدہ برفت ۔۔۔ لخت دلِ من بود کہ غلطیدہ برفت

در ہجر تو ایں قدر مرا شد معلوم ۔۔۔ کز دل نرود ہر آنچہ از دیدہ برفت

ہماری نگاہیں آپس میں جو کچھ داد وستد کرتی ہیں گو فی الفور ان کا علم نہ ہو مگر تھوڑی ہی دیر اور وقفہ کے بعد ہمارا قیاس ہمارا ادراک ہمیں جتا دیتا ہے کہ تبادلہ باعتبار سودمندی یا ناسودمندی کے اس درجہ تک ہے۔

ہماری آنکھیں صرف ذی رُوح اجساد سے ہی دادوستد نہیں کرتیں بلکہ غیر ذی رُوح اجسام اور کیفیات سے بھی یہ عمل جاری ہے۔ ہم ایک عجیب پتھر کو دیکھتے ہیں ایک خوشنما جانور ہماری نظروں سے گذرتا ہے ایک دلچسپ پودا دکھائی دیتا ہے ان مشاہدات سے ہمارے دل پر ایک اثر ہوتا اور جدید معلومات کے نمبر میں ایزادی ہوتی ہے گو دوسری جانب کو ہمارا علم کامل ادراک اور تیز شعور کے ساتھ نہ ہو۔ اور ہماری نگاہیں اُنہیں جدتِ معلومات کا کام نہ دیں مگر ہم ان سے بھی اس طریق پر مستفید ہوتے اور اس حیثیت سے سودمند یا ناسودمند تبادلہ کرتے

ہیں کہ جیسے ذی عقل یا ذی رُوح اجساد سے ہوتا تھا۔ پتھر ہمیں اپنی اندرونی صفتوں اور خداداد خوبیوں سے آگاہ کرتا۔ اور ایک خوش آئینہ جانور اپنی رسیلی آوازوں سے جتاتا اور ایک سبز پودا اپنی سرسبزی اور خوشنمائی سے دکھاتا اور ایک بنسری کی دردناک آواز سوجھاتی اور سمجھاتی ہے کہ قدرتی ہاتھوں نے ذی عقل اجساد کے سوائے نباتات اور جمادات میں بھی کیا کچھ ظاہری اور باطنی خوبیاں اور لطائف ودیعت کر رکھے ہیں اُن کی خوبی اور ان کی عمدگی ہمیں اُن سبقوں پر لے جاتی ہے کہ ہم جن سے اپنی معاشرت اپنی خوشی اپنے حظ اپنے معاد کے سودمند معانی اخذ کرتے اور سند کے طور پر سینہ بہ سینہ اُنہیں دلچسپ واقعات کو مختلف نسلوں تک پہنچاتے ہیں۔

یہ نہ سمجھو کہ انسان انسان سے ہی سبق لیتا ہے۔ نہیں نہیں آنکھیں بینا اور دماغ پختہ چاہیئے ان جڑی بوٹیوں سے بھی صدہا مفید سبق مل سکتے ہیں۔

ایک خوش الحان پرند بولتا اور دور پہاڑ کی چوٹی یا کھلے میدان میں ایک لے یا ایک بنسری بجتی ہے۔ ان میں سے ایک بے عقل زندہ اور ایک محض مُردہ ہے پھر دیکھو دونوں کی دردناک آوازیں اور دلربا صدائیں سننے والوں کے دلوں پر کیا کچھ آفت لاتی ہیں انسان چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں اور حیران ہوکر دیکھتے اور گوش توجّہ سے سنتے ہیں۔ دِل لرزتا اور جگر میں ایک جنبش اور دماغ کے اندر ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ گو سرنہ ہے۔ مگر بنسری کی خوش آئند آواز دلوں پر قبضہ کرتی جاتی ہے۔ سخت دلوں کا ذکر نہیں۔ جنہیں خدا نے درد دیا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ کیا نے کا جادو انسان کے جادو اور بنسری کے لب انسان کے لبوں سے زیادہ تر موثر ثابت نہیں ہوتے۔

یہ قصہ جانے دو کہ خوش الحان پرند کیا بولتا اور نے کیا کہتی ہے۔ یہ کہو کہ ان صداؤں

کا اثر دلوں پر کیسا ہوتا ہے۔ اور رگ و ریشہ میں درد خون کی طرح کیسے دورہ کرتا ہے

بچا نہ تیر نظر سے نہ سے شکار کوئی جگر کے پار ہے کوئی تو دل کے پار کوئی

یہ قصہ بھی رہنے دو کہ لب سنے میں یہ بالا کا نرگس کے لب کے وصل سے پیدا ہؤا اور اس سوکھی لکڑی میں کن جان بخش لبوں نے رُوح درد پھونک دی۔ یہ بھی نہ پوچھو کہ بنسری اپنا دُکھڑا روتی ہے یا کسی اور کا۔

ہمارے سامنے لازم نہیں چرچے رقیبوں کے کوئی ذکر اور چھیڑو باتوں باتوں میں نہ نشتر نکلے

سمعی - عینی مشاہدہ یا تبادلہ سے دُوسرے درجہ پر سمعی تبادلہ ہے۔ انسان سنتا بھی ہے اور سُناتا بھی ہے۔ ان دونوں عملوں سے انسان بہت سی باتیں اخذ کرتا ہے۔ اور بہت سی باتیں اُس سے اخذ کی جاتی ہیں۔ ہم ایک بات سنتے ہیں اور سننے کے ساتھ ہی ہمارے دل اور ہمارے دماغ پر ایک اثر ہوتا ہے اُس کے متعلق او جس قدر کیفیات ہوتی ہیں وُہ سب ہماری نگاہوں میں پھر جاتی ہیں۔ اور ہم اندرونی طور پر ایک دُوسرے کے ساتھ واقعات کا تبادلہ کرتے ہیں۔

ہم سُنتے ہیں کہ ایک ملک کے لوگ اس طرح رہتے اور یُوں بود و باش رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا تعلیمی سلسلہ ہے اور یُوں اُن کی معاشرت ہے اُس کے ساتھ ہی ہمارے خیالات میں ایک تموّج پیدا ہوتا اور ایک تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ گو ہم دوسری جانب کو اُس کے معاوضہ میں کچھ نہ دیں یا وُہ خود ہم سے کچھ اخذ نہ کرے مگر ہمارے اوراق سرمایہ میں ایک بیشی ہو جاتی ہے۔ عام اس سے کہ اس کا نتیجہ خوبی ہو یا نقص۔

سمعی تبادلہ کا اثر اور جذب بعض اوقات عینی تبادلہ سے بھی بہت بڑھ کر رہتا ہے۔ دُنیا کی اکثر مخاصمتوں مناقشوں جوش و ولولہ کا ابتدائی سبب اکثر اوقات یہ سمعی تبادلہ ہو جاتا ہے۔ سُنا اور طبیعت میں کچھ کا کچھ رنگ جم گیا۔ سُنا اور دماغ چکرا گیا۔

اور دل میں خیالات کا ہجوم ہونے لگا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

وجدانی ۔ انسانی ادراک نرا بصر اور سمع پر ہی موقوف نہیں۔ وجدان پر بھی انحصار ہے گو وجدانی ادراکات کا بہت حصہ عینی یا سمعی موجبات اور اسباب پر موقوف ہے لیکن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ وجدانی طاقت بھی ذاتی طور پر تبادلہ کرتی رہتی ہے ۔ آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں ۔ حواس محسوس کرتے اور جوارح کام دیتے ہیں ۔ وجدانی طاقت ان سب اسباب سے نتیجہ نکالتی اور پہلے نخیرۂ بن سے پھلوں کا تبادلہ کرتی ہے ۔

جب کبھی انسان اپنے آپ کو چند خیالات کے نرغہ میں بحالت ایک کش مکش اور حیص بیص کے پاتا ہے اور ایک خیال کو بجائے دوسرے خیال کے رکھتا اور پھر اپنی تجویز واپس لیتا ہے تو وہ حالت وہی ہے کہ جسکو دوسرے الفاظ میں وجدانی تبادلہ کہا جاتا ہے ۔ ہم ایک مدعا دل میں قائم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی نفی بھی کر دیتے ہیں ۔ ایک بات کی نفی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے اثبات پر متوجہ ہو جاتے ہیں ۔ یہ کیا ہے ؟ وہی وجدانی تبادلہ اور وہی وجدانی حیص بیص ۔ اس کا تماشا کب کر سکتے ہو ؟ کچھ مشکل نہیں وجدانی آنکھیں کھولو اور اس کا تماشا کرو ۔

یہ راہیں چل اگر فکر بقا ہے نام ہے غافل نظر کر کہہ رہے ہیں سالکوں کے نقش پا تجھ سے

وجدانی تبادلہ کے مشاہدہ سے انسان ایک نشاط پاتا اور سرور حاصل کرتا ہے اور اس پر ثابت ہو جاتا ہے کہ قدرتی مشینیں کس خوبصورتی سے کام کر رہی ہیں +

فنِ اخبار نویسی

(از مولوی ابو الکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ)

یوروپ اور امریکہ نے جو آجکل حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور علوم و فنون ۔ تہذیب و شائستگی میں جو انکا آج طوطی بول رہا ہے اُن میں منجملہ اور اسباب ترقی کے ایک بڑا سبب اخبار دیکھنا ہے۔ جسے اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک اور بچے سے لیکر بوڑھے تک روزانہ ہر ایک دیکھا کرتا ہے۔ اور علمی عملی فیوضات حاصل کرتا ہے۔ چونکہ کچھ عرصہ سے ہندوستان علاوہ پنجاب میں بھی اخباروں کا چرچا ہو رہا ہے۔ اکثر اُردو اخبار ترقی کر رہے ہیں۔ لوگوں کو ایک حد تک ان سے دلچسپی بھی ہوگئی ہے۔ اس لئے ہم اس فن کی مختصر تاریخ اور اس کے اقسام وغیرہ بیان کرتے ہیں۔

اخبار کا موجد

اس بارے میں سخت اختلاف ہے کہ اخبار کا موجد کون ہے۔ چین والے اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ایجاد کرنے والے ہم ہیں۔ روما والے مدعی ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کے کئی سال پیشتر ہم نے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ تمام باتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ فی الواقع اہل چین یا اہل روما اسکے موجد ہیں۔ اور سیکڑوں برس پہلے وہ شائع کر چکے ہیں تو بھی ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا ہم جس اخبار کا بیان کر رہے ہیں۔ اور اخبار سے جو مفہوم بالفعل سمجھا جاتا ہے اس میں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وَالشّتّان بینہما

اخبار جب ہی اخبار ہو سکتا ہے۔ جبکہ اُس کے متعدد نسخے اشاعت کی غرض سے موجود ہوں۔ اور ساتھ ہی مختلف مقامات میں بھیجنے کے آسان وسائل بھی میسر

ہوں - اور یقیناً اُس زمانے میں یہ تمام باتیں مفقود تھیں - نہ تو مطبع تھا کہ دس چھوڑ ہزار نسخہ بہم ہو جائیں - اور نہ یہ انتظام ریل تھا - کہ جہاں چاہیں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک چیزیں بھیجدیں - اِس لئے اُس زمانے کے اخبار پر اخبار کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا - پس اخبار جب ہی سے اخبار ہو سکتا ہے - جب سے کہ چھاپہ ایجاد ہوا ہے - اِس اعتبار سے اس چیز کی ایجاد کا سہرا اہل جرمن کے سر باندھنا چاہئے - جنہوں نے پندرہویں صدی عیسوی میں پہلا اخبار دُنیا میں شائع کیا - اور ہمارے نزدیک پہلے پہل یہی اخبار شائع ہوا ہے - وَالعِلمُ عِندَ اللہِ -

انگلستان

انگلستان میں پہلے پہلے اخبار ۱۶۲۲ء کو جاری ہوا - یہ وہی اخبار ہے جو آجکل ٹائمز کے نام سے شائع ہوتا ہے - پہلے اس کا نام دیکلی نیوز تھا - پھر ۱۷۸۵ء میں ڈیلی یونیورسل کے نام سے شائع ہوتا رہا - اب ۱۷۸۸ء سے ٹائمز کا نام اختیار کر چکا ہے - اس کے بعد ٹیٹلر وغیرہ اسٹیل اور اڈیسن نے شائع کئے - اور پھر گویا یہ رستہ سبھوں کو معلوم ہو گیا - لیکن اصل اس کی داغ بیل انگلستان میں ویکلی نیوز نے ہی ڈالی ہے

فرانس

فرانس میں پہلا اخبار ۱۶۳۱ء میں شائع ہوا - جسکا نام گزٹ دی فرانس تھا - اس میں زیادہ تر ملکی معاملات پر بحث ہوا کرتی تھی - اس کے بعد اور بہت سے اخبار شائع ہوئے - لیکن ابتدا میں فرانس سے ۱۶۳۱ء ہی کو اخبار نکلا تھا -

رُوس

رُوس میں پہلا اخبار ۱۷۰۳ء میں شائع ہوا -

امریکہ

یہ کون نہیں جانتا کہ جو ترقی امریکہ نے اخبارات میں کی ہے وُہ یورپ کو بھی نصیب

نہیں ہوئی۔ بڑی تحقیق سے معلوم ہؤا کہ اخبار یہاں پہلے پہل سنہ ۱۷۰۴ء کو شائع ہؤا۔ اس کا نام بوسٹن نیوز لیٹر تھا۔ اور اس کا دفتر شمالی امریکہ میں تھا۔ اس کے قبل اخبار کو اہل امریکہ جانتے بھی نہ تھے کہ اخبار کیا چیز ہے۔ آج جو ترقی امریکہ کو نصیب ہوئی ہے وہ بہت کچھ اخبار ہی کی بدولت ہے۔

اخبار کی قسمیں

یورپ میں جہاں اس مفید اخبار نویسی نے اعلیٰ درجہ کی ترقی کی ہے۔ اخبار کی بہت سی قسمیں ہوگئی ہیں۔ اور ہر ایک قسم کے اخبار ایک نہیں سیکڑوں شائع ہوتے ہیں۔ مگر اس کے مفید اقسام اور اعلیٰ مضامین یہ ہیں:۔

اقسام	مضامین
گزٹ۔ میگزین۔ ریویو۔ جرنل وغیرہ	مذہبی۔ تعلیمی۔ تجارتی۔ قومی۔ پولیٹیکل وغیرہ

اخبار کی تعریف

چونکہ اخبار کے بانی اور موجد اہل یورپ ہیں۔ اس لئے اُن کی تعریف ہمارے نزدیک معتبر ہے۔

اخبار جمع ہے خبر کی۔ خبر کو انگریزی میں نیوز کہتے ہیں۔ نیوز میں چار حرف ہیں۔

(ان) N (ای) E (ڈبلیو) W (اس) S

یہ چار حرف لفظ۔ ان چار لفظوں کا اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) N (اشارہ ہے) NORTH کا جسکے معنے ہیں شمال

(۲) E (اشارہ ہے) EAST کا جسکے معنے ہیں مشرق

(۳) W (اشارہ ہے) WEST کا جسکے معنے ہیں مغرب

(۴) S (اشارہ ہے) SOUTH کا جسکے معنے ہیں جنوب

اب دیکھو کہ اس چھوٹے سے جملہ میں کتنی بڑی وسعت ہے کہ جہات اربعہ کو لئے ہوئے

ہے- پس اخبار کی تعریف یہ ہوئی کہ وُہ مجموعہ اک وقت معین پہ شائع ہونے والا جس میں مغرب مشرق جنوب شمال کی تمام خبریں اور ان جہاتِ اربعہ کے متعلق مفید باتیں درج ہوں"۔

اخبار کے فوائد

ناظرین! کیا اخبار کے سوا دُنیا میں کوئی بڑی سے بڑی ایسی دُوربین ہے۔ جس سے آپ تمام دُنیا کو اپنا منظر بنا سکیں؟ اور کیا اخبار کے سوا کوئی اُونچے سے اونچا بلند مقام یا کوئی پہاڑ ہے۔ جس پر بیٹھ کر آپ تمام دُنیا کا نظارہ کر سکیں؟ نہیں! ہرگز نہیں! نہ دنیا میں کوئی ایسی دُوربین ہے۔ نہ کوئی ایسا بلند مقام ہے۔ یہ صرف اخبار ہی اک ایسی چیز ہے جسکے ملاحظے سے آپ تمام دُنیا کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں اور جسکے حاصل کرنے سے آپ تمام دُنیا کے نظارے کو حاصل کر سکتے ہیں۔

پچھلے زمانے میں واقفیت اور معلومات حاصل کرنے کا۔ عجائباتِ عالم دیکھنے کا سوائے سفر کے دوسرا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مگر اُس میں سوا صرف کثیر کے کہ جس کی وجہ سے غریب اور مفلس شخص اُس سے مستفیض نہیں ہو سکتا۔ محنت اور تکلیف و پریشانی بہت تھی۔ اور بعض اوقات خود جان کا خطرہ تھا۔ علاوہ بریں اگر ایک شخص اپنے تمام متعلقین کی جُدائی اور پریشانیوں کا تحمل بھی ہوتا۔ اور تمام عمر سیاحی بھی اختیار کرتا۔ جب بھی تو تمام دنیا کی سیر نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ اخبار اک ایسی چیز ہے کہ گھر بیٹھے بلا محنت و مشقت تمام دُنیا کی سیر کر لے اور معلومات اور عجائباتِ عالم کی سیر سے طبیعت کو محظوظ کر لے۔

یورپ میں اخبار سلطنت کا ایک جزو اعظم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ رعیت کے خیالات کی باگ فی الواقع اخبار کے ہاتھ میں ہے۔ پرنس بسمارک کی کیفیت یہ تھی کہ جب کسی معاملات ملکی میں اسکو کوئی خاص طرز اختیار کرنی ہوتی تھی۔ تو اُس کے قبل ہی وُہ اخباروں میں تائیدی مضامین شائع کرا دیتا تھا۔ جسکا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مُلک اس کا ہمزبان

ہوکر اسی کا کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔

یورپ کے اخباروں کو آج وہ طاقت حاصل ہے کہ جو چاہیں سو کریں۔ ایک سے ایک کی جنگ کروا دیں یا کسی جنگ میں صلح کرا دیں۔ یا ایک کا ملک چھنوا کر دوسرے کو دلوا دیں۔ کسی عہدہ دار کو معزول کرانا اور کسی ادنیٰ شخص کو اعلیٰ عہدہ دار بنانا ان اخبارات کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

اخبار کی خاص صفتیں

اخبار گورنمنٹ کے حقوق اور منشا کی حفاظت کرتا اور رعایا کے حقوق گورنمنٹ سے طلب کرتا ہے۔

اخبار علمی مذاق ہر طور سے پھیلاتا ہے۔ اور قابل توجہ باتوں پر توجہ دلاتا ہے۔

اخبار غیر ملکوں کی اچھی باتوں کو ہم تک پہنچاتا ہے اور ہماری باتوں کی ان تک اشاعت کرتا ہے۔

اخبار ہر ایک ملک کے حالات رسم و رواج۔ آب و ہوا۔ طرز معاشرت۔ طرز حکومت۔ مذاہب۔ عادات۔ اخلاق۔ قوانین سلطنت۔ جھگڑے۔ فساد۔ جنگ و جدل کو اخباری حیثیت سے لکھتا ہے۔ اور انپر بحث کرتا ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ اچھے کو برے سے جدا کرتا ہے۔

اخبار ناظر کی تحقیقات کو بڑھاتا ہے اور اس کے علم کو جلا دیتا ہے۔

اخبار غلط خیالوں کی تردید کرتا ہے۔ اور سچے خیالات کی تائید کرتا ہے۔

اخبار انسان کی تعریف اور فضیلت انسانیت بیان کرکے رؤسا اور امرا کو انسانیت کی جانب بلاتا ہے۔ اور انکو علوم و صنائع حرفت کی تعلیم عام کرنے اور مریضوں کی دوا اور علاج کے نئے مدرسے اور نئے شفاخانے قائم اور جاری کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اخبار فوائد عدالت بیان کرکے حاکم کو اس کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ اور گویا

تمام رعیت کی وکالت کرتا - انکی فریاد اور شکایتوں کو گوشِ حکومت تک پہنچاتا ہے۔

اخبار حکام اور عمال اور مامورین رشوت خوار اور ظالموں کے ظلم وجبر کے دفع کرنے میں کوشش کرتا اور منتظمین اعلے کو اس کی اطلاع دیکر اس کا کافی انسداد کرتا ہے۔

اخبار ہرایک عالم عاقل کی امانت افکار اور ودیعت خیالات کو ہرایک عالم عاقل کی نگاہوں اور کانوں تک پہنچاتا اور علما عقلا کو ایک دوسرے سے آگاہ کرتا اور مبادلہ خیال کا موقع دیتا ہے۔

اخبار اپنی قوم کے اجزائے پراگندہ اور اعضائے متفرقہ کو ایک جاکر کے حیاتِ تازہ بخشتا ہے اور از سرِ نو زندہ کرتا ہے۔

اخبار اپنے ناظرین کو بیٹھے بٹھائے تمام عالم کی سیر و سیاحت سے تجربہ کار بناتا اور خوشدل اور محظوظ و مسرور کرتا ہے۔

اخبار دوستداران اُمت اور محبان قوم کو دشمنوں اور عدوں سے جدا کرتاہے اور لباسِ کذب اور برقعۂ فریب کو چاک چاک کر دیتا ہے۔

اخبار شر اور بدبختی کی گھاٹیوں اور کمیں گاہوں سے بچانے کی غرض سے خیر دیکر خیر اور سعادت نیک بختی اور بصیرت کی شاہراہوں کا راستہ بتاتا ہے۔ تاکہ قوم بُری راہ نہ چلے اور صراط المستقیم سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

اخبار جس چیز میں ملک کا فائدہ دیکھتا ہے۔ فوراً اُسے محبانہ الفاظ میں قوم پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اور نکتہ چینی اور اعتراض کی راہ سے ہمیشہ بچتا رہتا ہے۔

اخبار ایسے ضروری امورات اور معارف کا جسکا جاننا ہر فرد بشر پر ضرور ہے۔ عام فہم عبارت میں جس سے عوام الناس کو بھی اشتباہ ہو ذکر کرتا ہے۔

اخبار پست ہمتوں کے برانگیختہ کرنے اور مردہ دلوں کو زندگی بخشنے کے لیئے ملکی دلچسپ ترقیات اور حالات کو اور صالحین کے کارناموں کو نہایت شیریں اور مؤثر

الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اور اُنکے عمدہ خصائل کو بیان کر کے قوم کو اُن کی تقلید پر آمادہ کرتا ہے۔ کہ تذکرۃ الاسلاف تبصرۃ الاخلاف ہے۔

اخبار ہمیشہ اخلاق جمیلہ اور خصائل پسندیدہ کے اوصاف اور عادات رذیلہ کے نقصانات بیان کر کے قوم کو اچھی باتوں پر مائل اور بُری باتوں سے متنفر کرتا ہے۔

اخبار سے ذہن اور عقل میں ترقی ہوتی ہے اور علمی مذاق بڑھتا ہے۔

الغرض اخبار کے فوائد بے شمار ہیں۔ جنکے بیان سے اتنا کہدینا بہتر ہے کہ جو شخص دُنیا میں اپنے بُرے بھلے کی تمیز کرنا چاہے اور دنیا میں رہ کر دُنیا کی عُمدہ باتوں کو حاصل کرنا اور بُری باتوں کو چھوڑنا چاہے۔ حقائق و معارف اور مختلف علمی عملی معلومات کا شوق رکھتا ہو۔ اور دنیا میں مہذب اور شائستہ عاقل و فرزانہ ہوکر رہنا چاہے۔ اور گھر بیٹھے بلا صرف و خرچ ایک اُستاد شفیق تلاش کرنا ہو تو وُہ اخبار بینی اختیار کرے۔

اخبار آپ کو بتلاتا ہے کہ دیکھو! فلاں ملک میں فلاں شخص نے یوں ادنے حالت سے اعلےٰ درجہ تک ترقی کی اور عزت و وقعت یوں حاصل کی۔ وُہ ایک معمولی مفلس شخص تھا۔ مگر تھوڑے دنوں میں دولتمند ہوگیا۔ وُہ ایک جاہل آدمی تھا مگر کچھ عرصے میں عالم ہوگیا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اُس نے تعصب اور نفسانیت کو بالائے طاق رکھکر بے تعصبی اور سلامت روی کا سبق یاد کرلیا تھا۔ اگر تم بھی ویسے ہی ترقی کر زینے طے کر کے اعلےٰ مینار پر پہنچنا چاہتے ہو تو اُسی شخص کے قدم بہ قدم چلو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگے۔

اخبار ایک قومی ہادی ہے

اخبار دراصل ایک زندہ ہادی ہے۔ جو ہر قسم کی باتوں میں ہدایت کرتا ہے۔ بُری باتوں سے تنفر دلاتا ہے۔ اور عُمدہ باتوں کی جانب مائل کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کی

طبیعت میں اِک ایسی زبردست قوت گمراہ کنندہ - موجود ہے - جسکا کام انسان کو جادۂ ضلالت میں ڈالنا ہے - اُس کی اعلیٰ کوششوں سے انسان سیدھے سعادت اور نیکبختی کے راستے کو چھوڑ کر شقاوت کی تنگ و تاریک اور خوفناک و پیچدار گھاٹیوں میں آنکھ بند کئے پڑ جاتا ہے - اور اس بدبختی کے مقام پر خوش قسمتی کے راستے کو تلاش کرتا ہی اور جب تک کہ کوئی شخص بصفت رہبر ہاتھ پکڑ کے منزل مقصود تک نہ پہنچا دے وُہ یونہی پریشان و سرگردان رہتا ہے -

اس لئے ہر قوم اور فرد کو ایک رہبر اور ہادی کی سخت ضرورت ہی - اور بے اس کے کوئی کبھی صراط المستقیم پر نہیں چل سکتا -

پس حالتِ موجودہ کے اعتبار سے اخبار سے بڑھ کر قوم کا کوئی ہادی اور رہبر نہیں ہے جو اُسے سیدھی راہ چلانے میں مددگار اور ترقی کا بدل وجان خواستگار ہو -

اخبار کے متعلق نامور لوگوں کی رائے

• ایک بڑے مدبر کی رائے اخبار بینی کے متعلق یہ ہے کہ کتب بینی سے اخبار بینی زیادہ سودمند ہے - اور اس کا نفع اس سے کہیں بدرجہا زیادہ ہے - کیونکہ ہر ایک کتاب ضرور کسی خاص بحث اور مضمون پر ہوا کرتی ہے - اور برخلاف اس کے اخبار میں چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف بحثوں پر ہوا کرتے ہیں - اور بجائے ایک بات کے اُن میں متعدد سودمند باتیں ہوتی ہیں - جس چیز سے ہماری طبیعت کو مناسبت ہو ہم اُس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں -

علامہ سید جلال الدین افغانی المصری اخبار کے فوائد میں یہ لطیف شعر پڑھتے ہیں

لا سعادت لامة لیس لها سائق الی الفضائل ولا زاجر عن الرذائل } یعنے جس قوم میں اچھی باتوں کی جانب ہدایت کرنے والا اور بُری باتوں سے منع کرنے والا اخبار نہ ہو اُسے نیکبختی اور سعادت نہیں مل سکتی -

یہ شعر اُس حکیم وقت کا ہے کہ جس کی علمی لیاقت آج تمام اخباری دنیا میں مسلّم ہے۔ اِس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ موجودہ کے اعتبار سے اخبار سعادت کا باعث ہے۔ سعادت سے محروم ہے وہ قوم جو اخباربینی سے ناواقف ہے۔ نیک بختی سے دُور ہے وہ قوم جو اخبار سے مستفیض نہیں ہے۔ یورپ کو دیکھو آج دنیاوی سعادت میں کوئی قوم اُس کے لگ بھگ نہیں ہے۔ تمام دنیا میں مسلّم ہو چلا ہے کہ جو شخص یا قوم دنیاوی سعادت کی خواہاں ہو یورپ کی تقلید کرے۔ یہ کیوں؟ بس اِسی لئے کہ اخباربینی وہاں طبیعت ثانی ہوگئی ہے۔ جوانوں۔ بوڑھوں۔ بچّوں۔ عورتوں۔ مردوں۔ معماروں۔ کتب فروشوں۔ مزدوروں۔ عطاروں۔ ڈاکٹروں۔ پادریوں۔ شاعروں۔ نجومیوں۔ تاجروں۔ مصوّروں۔ زمینداروں۔ کسانوں۔ انجنیروں۔ نوکروں۔ وغیرہ وغیرہ ہر ایک فرقہ ہر ایک عہدہ ہر ایک فن۔ ہر ایک علم ہر ایک قسم کے لوگوں کے لئے علیحدہ علیحدہ اخبار شائع ہوتے ہیں۔ اور وہ اُسے روزانہ دیکھ کر اپنی ضروری حاجتوں کو رفع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ھیمن ڈی ڈی اپنی ایک تصنیف میں تحریر کرتے ہیں۔ کہ میں جس وقت ڈیونٹی کالج میں تحصیلِ علم میں سرگرم تھا۔ مجھے مضامین نویسی کا بہت شوق چڑھا تو مجھے اخباروں کے مطالعہ سے بہت کچھ فائدہ ہوا۔ اور بہت سی باتوں کو میں نے اُس سے سیکھا۔ جو علمی اور عقلی مضمون اخباروں میں ہوا کرتا تھا۔ اُسے میں اوّل غور اور فکر کے ساتھ پڑھتا۔ اور رائے زنی کیا کرتا تھا۔ اور پھر اُس کو اور طالبعلموں کے آگے پیش کیا کرتا اور بحث کیا کرتا تھا۔ اِس طرح سے ایک علمی مذاق میری طبیعت میں پیدا ہوگیا۔ اور اُس نے ایسا اضطراب پیدا کر دیا کہ میں اِس فن اخبار نویسی کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اور پھر تو ایسے ایسے لاجواب مدلّل علمی آرٹیکل اور مضامین لکھنے لگا۔ جن کی قوم نے داد دی۔ یہ اخباربینی ایسی عُمدہ چیز ہے کہ اِس سے زیادہ کوئی

دلچسپ مشغلہ نہیں ہے ۔ مسٹر گلیڈ سٹون سابق وزیر اعظم انگلستان اخبار کے متعلق لکھتا ہے کہ "پبلک اخبار کی کیوں شاکی ہوتی ہے یہ تمہارے ہی فائدے کی بات ہے۔ اس کا وجود تمہارے لئے غنیمت ہو۔ یہ ایک زبردست ہاتھ ہے ۔جس سے تمام دینی اور دنیوی باتوں کی تکمیل ہوتی ہو۔ اور اس کا فیض چاروں طرف پھیلتا ہے ۔ اُس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں ۔ اس سے بڑے بڑے فائدے انسان کو ہوتے ہیں"۔ پرنس بسمارک کے حالات میں ڈاکٹر بسش اُن کے معتمد خاص لکھتے ہیں ۔ کہ پرنس بسمارک فن اخبار نویسی میں بڑا مشتاق تھا اور اُس کے رموز و نکات سے ایسا ماہر تھا جیسے کوئی بڑا نامور مشاق لائق و فائق اور تجربہ کار ایڈیٹر ہو۔ مجھے چونکہ اس کام پر اُس نے مامور کیا تھا ۔ اس لیئے وُہ دن میں کئی بار بُلاکر اخبار کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا ۔ اخبار کا وُہ ایسا عاشق تھا ۔ کہ رات دن اسی دُھن میں رہتا تھا ۔ رات کو آدھی آدھی رات یکفت چونک کر مجھے طلب کرتا تھا اور جو مضمون اس کے ذہن میں اسوقت سماتا تھا لکھکر حکم کرتا تھا کہ اسے فوراً صبح کو فلاں فلاں اخبار میں شائع کرا دیا جائے ۔ غرضکہ اخبار سے اُسے بڑی دلچسپی تھی اور اسکو سب سے عمدہ مشغلہ سمجھتا تھا ۔ پیٹر اعظم شاہ روس کی لائف میں لکھا ہے ۔ کہ وُہ نہایت دلچسپی سے اخباروں میں ایڈیٹوریل مضامین لکھا کرتا تھا ۔ اور اخبار کو رعایا کے خیالات کا آئینہ سمجھتا تھا ۔ اور اخبار سے اسکو اتنا شغف تھا کہ بذاتِ خود اُس کے پروف کی صحت کیا کرتا تھا ۔ اور وُہ تمام پروف اس کی مشہور لائبریری میں موجود ہیں ۔ فرانس کے مشہور مدبّر نپولین کے حالات میں مؤرخ لکھتا ہے کہ نپولین کا قاعدہ تھا کہ جب وُہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتا تھا تو پہلے اخباروں میں اُس کے متعلق موافق اور تائیدی مضامین شائع کراتا تھا ۔ اور اس طور سے عام رائے کو اپنے موافق کرلیتا تھا

ہندوستان میں جتنے نامور جنرل اور گورنر آئے ہیں ۔ جب وُہ پنشن لیکر ولایت کو واپس جاتے ہیں ۔ تو وہاں بھی اخبار نویسی کے پُر لُطف مشغلہ میں باقی زندگی بسر کرتے

ہیں۔ سر ولیم میور سے ہندوستان کا کون تعلیم یافتہ ایسا ہے جو واقف نہیں۔ یہ علاوہ اس کے کہ ہندوستان کے عرصہ تک گورنر رہ چکے ہیں۔ بہت بڑے مصنف بھی ہیں۔ ان کی تصانیف میں لائف آف محمد ایک ممتاز کتاب ہے جسمیں آنحضرت پیغمبر برحق رُوحی فداہٗ کی لائف لکھکر اُس پر ایک نئی طرز سے نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اور جو اس طریق اعتراض سے مختلف ہے جو عام مشنری اور پادری کیا کرتے ہیں جس سے میور صاحب کی ایک ممتاز صفت معلوم ہوتی ہے۔ یہ فاضل شخص بھی اخبار کے نامہ نگار ہیں۔ اور ان کے اکثر مضامین اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ مسٹر الفرڈ لائل مسٹر لیپل گریفن۔ مسٹر رچرڈ ٹیمپل۔ سر رچرڈ گارتھ وغیرہ نامہ مضامین نگار ہیں۔ سر ولیم ہنٹر سابق ممبر کانسل گورنمنٹ ہند۔ اخبار ٹائمز کے ایڈیٹر ہوئے اور ان کے پُرزور آرٹیکل نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فن اخبار نویسی کیسا لاجواب اور دلچسپ فن ہے کہ ایسے ایسے افاضل اُسے اختیار کرتے ہیں۔

مخزن اور نئی دُنیا۔ ناظرین مخزن یہ سُنکر غالباً خوش ہونگے۔ کہ نئی دُنیا میں بھی اسے نگاہ پسندیدگی سے دیکھا گیا ہے۔ ماہ جنوری کے پرچے میں کینیڈا (علاقہ برطانیہ در امریکہ) کی ایک خاتون کی دلچسپ چٹھی کا ترجمہ شائع ہوا تھا جس ہندوستانی خاتون کے نام وُہ خط تھا۔ اُس نے وُہ پرچہ امریکہ بھیجدیا۔ اور وہاں کے لوگوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ مانٹریل میں جہاں وُہ خاتون رہتی ہے۔ ایک اخبار چھپتا ہے جسکا نام "ڈیلی وٹنس" ہے ہمیں اُس پرچے کے پہلے صفحہ کا ایک نہایت خوبصورت عکس چھپا ہے۔ جس کے ساتھ ایڈیٹر اخبار نے مہربانی آمیز الفاظ میں مناسب تمہید لکھی ہے اس سے ہمیں اندازہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ کہ وہاں مذاق علمی کس پایہ کا ہے۔ اور صاحبان اخبار ناظرین کی قدردانی کی بدولت دلچسپی کے کیسے کیسے سامان بہم پہنچا سکتے ہیں۔

انقلابِ فرانس

یورپ کی تاریخ میں ایک نہایت مشہور واقع گذرا ہے جسے فرنچ ریوولیوشن یعنے سلطنت فرانس کا انقلاب کہتے ہیں۔ انگلستان کے نامور فسانہ نگار چارلس ڈکنز نے اُس انقلاب عظیم کو نہایت خُوبی سے لکھا ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سے سلطنت بادشاہوں کے ہاتھ سے نکلکر جمہوری طریق پر قائم ہوگئی۔ اس انقلاب عظیم کا ایک بڑا باعث عمائد فرانسہ کی بدچلنی و تعدی اور غربا کے ننگ و ناموس کی بے حُرمتی بھی تھا۔ ڈکنز کے چند صفحوں کا (جن میں اس باعث کا ذکر ہے) ترجمہ ہمارے دوست میر فیض الحسن صاحب بی۔ اے۔ مترجم فنانشل کمشنر صاحب بہادر ارسال فرماتے ہیں۔ جو ذیل میں درج ہے:۔

"میں مسمی الگزنڈر منیٹ ساکن پیرس ۱۷۶۷ء کے اخیر مہینہ میں یہ غم اندوز اور جانکاہ تحریر اپنے کلبۂ احزان واقع زندان خانہ بیسٹیل میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ مُجھ کو اس تحریر کے لکھنے کا کبھی کبھی اور وُہ بھی چوری سے موقع ملتا ہے اور اس کام میں مجھے بہت سی تکلیفوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ جب یہ تحریر ختم ہوجائے تو اسے انگیٹھی کی دیوار کے سوراخ میں چھپا دوں۔ یہ سُوراخ میں نے بڑی محنت اور مصیبت سے کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تحریر کسی رحمدل شخص کے ہاتھ لگ جائے۔ جبکہ میں اور میرا غم خاک میں مل چکا ہوگا۔ یہ الفاظ میں اپنی قید کے دسویں سال انگیٹھی کے دُھوئیں کو کھُرچ کر اور اس میں اپنا خون لت کرکے ایک زنگ آلُود آہنی قلم سے لکھ رہا ہُوں۔ اُمید کی ٹہنی اب بالکل خشک ہوگئی ہے۔ مجھ کو بعض خوفناک علامتوں سے جو اپنے آپ میں پاتا ہُوں معلوم ہوا ہے کہ اب زیادہ عرصہ تک میرے قوائے دماغی صحیح نہیں رہ سکتے۔ لیکن میں باقرار صالح کہتا ہُوں کہ اسوقت میرے حواس بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا حافظہ درست اور صحیح ہے اور جو کچھ میں لکھتا ہوں یہ سب سچ ہے۔ میں اپنی تحریر کی خواہ یہ کسی انسان کی نظر سے گذرے یا نہ گذرے مالک الستر

والخفایا کی درگاہ میں جوابدہی کرنے کو تیار ہوں۔

ایک چاندنی رات کو جبکہ کچھ بادل بھی آرہے تھے۔ میں دریائے سین کے گھاٹ پر کسیقدر شارع عام سے دور ٹہل رہا تھا اور ٹھنڈی ہوا کھا رہا تھا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ واقع مورخہ ۲۲- دسمبر سنہ ۱۸۵۰ء کا ہے۔ یہ مقام میرے مکان سے جو مدرسہ طبیہ کی گلی میں ہے ایک گھنٹہ کی مسافت پر تھا۔ مجھ کو اپنی پشت کی طرف سے ایک گاڑی کی گھن گھن کی آواز آئی اور میں چاہتا تھا کہ راستہ سے بچکر کھڑا ہو جاؤں کہ کہیں گاڑی کے نیچے نہ آجاؤں۔ اتنے میں کسی نے گاڑی میں سے ہاتھ باہر نکالا اور گاڑی بان کو آواز دی کہ ٹھہر جا۔ کوچبان نے گھوڑے کی راسوں کو زور سے کھینچ کر گاڑی ٹھہرا دی۔ اور جس شخص نے گاڑی رکوائی تھی۔ اُس نے میرا نام لیکر پکارا۔ میں نے جواب دیا۔ گاڑی اس قدر مجھ سے آگے نکل گئی تھی کہ جب تک میں گاڑی کے پاس پہنچوں دو شریف آدمی گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے۔ یہ دونو صاحب چغہ اوڑھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وُہ اپنا مُنہ نہیں دکھانا چاہتے۔ جب یہ دونو صاحب پہلو بہ پہلو گاڑی کے دروازہ کے پاس کھڑے تھے تو میں نے غور کیا کہ وُہ میرے ہم سن بلکہ شاید مجھ سے بھی کچھ عمر میں چھوٹے تھے وُہ ایک دُوسرے سے قد-آواز-لب ولہجہ اور (جہانتک میں دیکھ سکتا تھا) چہرہ میں مشابہ تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کیا آپ ڈاکٹر مینٹ ہیں؟

میں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔

دُوسرے نے کہا "وُہی نوجوان ڈاکٹر مینٹ جو پہلے بمقام تودے جراحی میں مشہور ہوا تھا اور گذشتہ ایک دو سال سے پیرس میں بڑا نام پیدا کر رہا ہے"۔

میں نے جواب دیا کہ جس ڈاکٹر مینٹ کا آپ نے اسقدر تعریف سے ذکر فرمایا وُہ یہی خاکسار ہے"۔

پہلے صاحب نے کہا ہم پہلے تمہارے مکان پر گئے تھے اور جب معلوم ہوا کہ تم اس طرف ہوا کھانے کو آئے ہوئے ہو تو ہم تمہاری تلاش میں ادھر آئے۔ کیا آپ مہربانی فرما کر گاڑی میں آئینگے۔ دونوں نوجوانوں کا طریق گفتگو حاکمانہ تھا اور مجھ کو گاڑی میں داخل ہونے کے لئے کہنے کے بعد اُنہوں نے مجھے بیچ میں لے لیا۔ وُہ دونو مسلح تھے اور مَیں نہ تھا۔

مَیں نے کہا "جناب آپ مجھے معاف کرینگے۔ اگر مَیں یہ کہوں کہ جس صاحب کو میری مدد کی ضرورت ہوتی ہے میں عموماً اُن کا نام بھی دریافت کیا کرتا ہوں۔ اور نیز یہ کہ کس قسم کی مرض کا مجھ سے معالجہ کرانا منظور ہے"۔

اس کا جواب اُس نوجوان نے دیا جو دُوسری دفعہ بولا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کے مخاطب ذی رُتبہ لوگوں میں سے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ مرض کی نوعیت کو آپ ہم سے بہتر تشخیص کر سکینگے۔ بس اتنا ہی جواب آپ کی اطمینان کے لئے کافی ہے۔ اور اب آپ گاڑی میں تشریف لے آئیں"۔ مَیں نے بجز تعمیل کے اور کچھ چارہ نہ دیکھا اور چپ چاپ گاڑی میں جا بیٹھا۔ وُہ دونوں بھی میرے بعد ایک ایک کر کے اندر آ بیٹھے۔ دوسرا گاڑی کے پائدان کو اُٹھا کر جست مار کے اندر آیا ہی تھا کہ گاڑی پیچھے مُڑی اور جس تیزی سے آئی تھی اُسی تیزی سے پھر روانہ ہُوئی۔ بازاروں کو طے کر کے گانوں کی سڑک پر جا نکلی۔ اور شاہراہ سے کٹ کر جانے لگی۔ تھوڑی دیر میں ایک مکان کے آگے جا ٹھہری۔ جس کے آس پاس اَور کوئی مکان نہ تھا۔ ہم تینوں اُتر کر باغ میں سے ہو کر مکان کے دروازہ پر پہنچے۔ کُنڈی کھٹکھٹانے کے بعد کچھ دیر میں دروازہ کُھلا اور جس شخص نے دروازہ کھولا اُس کے مُنہہ پر میرے ساتھیوں میں سے ایک نے جُھنجھلا کر اپنا سواری کا دستانہ کھینچ مارا۔

یہ بات کوئی قابل تعجب نہ تھی اس لئے کہ مَیں نے غریب لوگوں کو کُتّوں سے

زیادہ پٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن ان دونوں نوجوانوں کی حرکات اسقدر آپس میں مشابہ تھیں کہ جب ایک نے دستانہ مارا تو دوسرے نے ہاتھ سے سزا دی اور میرے اس خیال کی تائید ہوئی کہ غالباً یہ دونوں توام بھائی ہیں۔ جسوقت سے ہم بیرونی دروازہ کا قفل کھول کر (جسکو ہمارے اندر داخل ہونے پر پھر لگا دیا گیا تھا) مکان میں داخل ہوئے اُسوقت سے برابر اُوپر کے کمرہ سے میرے کان میں ہائے ہائے کی آواز آرہی تھی۔ جب ہم سیڑھیوں پر سے چڑھکر اُوپر پہنچے تو یہ آواز اور بھی زور سے آنے لگی اور کمرہ میں پہنچکر میں نے ایک مریض کو سخت قسم کے سرسام میں مبتلا چارپائی پر لیٹے دیکھا۔ یہ مریض ایک خوبصورت اور نوجوان عورت تھی جس کی عمر غالباً ۲۰ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کے بال منتشر تھے اور پیچ رہے تھے۔ اُس کے ہاتھوں کو اُس کے بدن کے ساتھ رومال اور پٹیوں سے باندھ رکھا تھا۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تمام پٹیاں کسی مرد کے لباس کو پھاڑکر بنائی گئی ہیں۔ ایک پٹی پر مجھے حرف ای اور عمائدِ فرانسہ کے خاندانی نشان کی علامات نظر آئیں۔ ان نشانات پر جاتے ہی میری نظر پڑ گئی تھی۔ اور مجھے وہاں پہنچے کوئی ایک منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ مریضہ نے اُس کپڑے کو اپنے منہ میں ٹھونس لیا اور اندیشہ تھا کہ کہیں اُس کا دم نہ گھٹ جائے۔ میں نے ہاتھ بڑھاکر کپڑے کو اُس کے منہ سے نکالا اور اُس کے ایک کونے میں مجھے کچھ گلکاری کا کام بنا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے مریضہ کو جو منہ کے بل لیٹی تھی۔ چت لٹایا اور اپنا ہاتھ اُس کے سینہ پر رکھکر اُس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اُن سے وحشت ٹپکتی تھی وہ ایک جگر خراش آواز میں ان لفظوں کو دہراتی تھی "میرا خاوند۔ میرا باپ اور میرا بھائی"۔ اور پھر بارہ تک ایک دو گنتی اور خاموش ہو جاتی تھی۔ ذراسی دیر ٹھہر

وُہ پھر یہی فقرہ دوہراتی اور بارہ تک گن کر ٹھہر جاتی - ایک ہی ترتیب اور ترکیب سے برابر وُہ اپنی بھیانک آواز سے "میرا خاوند - میرا باپ - میرا بھائی" چلاتی رہی اور بارہ تک گنتی گن کر ذرا سی دیر کے لئے ٹھہر جاتی تھی -

مَیں نے پُوچھا کہ یہ حال کتنی دیر سے ہے -

بڑے بھائی نے جواب دیا (تمیز کے لئے مَیں ایک بھائی کو بڑا بھائی کہونگا اور دُوسرے کو چھوٹا - جو کسی قدر زیادہ تحمل نہ گفتگو کرتا تھا اُسکو آیندہ بڑا بھائی لکھا جائیگا) کہ گذشتہ شب تقریبًا اسی وقت سے یہ حال ہے -

"کیا مریضہ کا باپ - بھائی اور خاوند ہے" ؟

"ایک بھائی ہے" -

"مَیں اس کے بھائی سے تو اس وقت مخاطب نہیں ہُوں" ؟ -

نہایت حقارت سے جواب ملا "نہیں" -

کیا نمبر ۱۲ کی طرف مریضہ کے انتقال ذہنی کے لئے حال میں کوئی خاص وجہ ہُوئی ہے -

چھوٹے بھائی نے گھبرا کر جواب دیا - ہاں ۱۲ بجے کی طرف -

مَیں نے کہا صاحبو! مجھ کو آپ اس طرح پر خالی ہاتھ لے آئے ہیں کہ اس وقت مَیں کچھ نہیں کر سکتا - اگر مَیں اپنی ضروری چیزیں ہمراہ لیکر آتا تو یہ وقت بیکار نہ ضائع ہوتا -

بڑے بھائی نے چھوٹے کی طرف دیکھا جس نے ہنس کر جواب دیا کہ "ایک دوائی کا صندوقچہ یہاں بھی موجود ہے" - اور یہ کہکر صندوقچہ میرے سامنے لا کر رکھدیا -

مَیں نے چند بوتلوں کو کھول کر سُونگھا اور ڈاٹوں کو لب پر رکھ کر ذائقہ معلوم کیا - اگر سوائے مسکرات کے مجھے کوئی اور چیز استعمال کرنی منظور ہوتی تو میں ان

ہیں سے کسی دوا کو بھی مریضہ کو نہ دینا۔

چھوٹے بھائی نے پوچھا۔ کیا آپ کو کسی قسم کا شبہ ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ جناب میں انہیں استعمال کرنے لگا ہوں۔ اور سوائے اس کے اور کچھ نہ کہا۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک خوراک مریضہ کو کھلائی۔ چونکہ تھوڑی دیر کے بعد دوسری خوراک دینی تھی۔ میں پہلی خوراک کا اثر دیکھنے کے لیے مریضہ کے بستر کے برابر بیٹھ گیا۔ ایک سہمی ہوئی عورت خادمہ کا کام کر رہی تھی جو اب ایک گوشہ میں ہو گئی۔ مکان سیلا ہوا اور بہت پرانا تھا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے سے عرصہ سے عارضی طور پر اسکو آباد کیا گیا ہے۔ ایک طرف پرانے بھاری بھاری پردے لٹکے تھے کہ آواز باہر نہ نکل سکے۔ آواز برابر اسی طرح جاری تھی۔ میں نے وہ کپڑا جس سے ہاتھ بندھے تھے۔ ڈھیلا کر دیا تھا۔ لیکن کھولا نہیں تھا۔ صرف اتنا فرق ضرور ہوا کہ مریضہ کے سینہ پر جو میرا ہاتھ رکھا تھا اس کی وجہ سے کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے اس کا کروٹیں بدلنا رک جاتا تھا۔ لیکن آواز برابر اسی طرح جاری تھی۔

چونکہ سینہ پر ہاتھ رہنے دینے کی وجہ سے مریضہ کچھ دیر تک آرام سے لیٹی رہتی تھی۔ اس لئے آدھ گھنٹہ تک میں اسی طرح ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ اور دونوں بھائی میری طرف دیکھا کئے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد بڑا بھائی بولا۔

"ایک اور مریض بھی ہے"۔

میں چونک اٹھا اور بولا کیا کوئی سخت مریض ہے؟

اس نے بے پروائی کے لہجہ میں جواب دیا "بہتر ہے کہ آپ خود دیکھ لیں" اور یہ کہہ کر پاس سے ایک شمع اٹھا لی۔

دوسرا مریض ایک پشت کے کمرہ میں تھا۔ جہاں ہم ایک اور زینہ پر چڑھ کر

داخل ہوئے۔ ۱۷ سال کی عمر کا ایک خوبصورت زمیندار لڑکا گھاس پر زمین پہ لیٹا تھا۔ ایک گدا اُس کے سر کے نیچے لپیٹا ہوا رکھا تھا۔ وُہ چت لیٹا تھا۔ دانت بھینچ کر رکھے تھے۔ داہنے ہاتھ کی مٹھی بند تھی اور سینہ پر رکھا تھا۔ اُس کی چمکدار آنکھیں اُوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اُس کا زخم نظر نہ آیا۔ اِس لئے میں ایک گھٹنا ٹیک کر غور سے دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ جاں بلب ہے اور اس کو کسی تیز دھار کی چیز سے زخم لگا ہے۔

مَیں نے کہا "میاں لڑکے میں ڈاکٹر ہُوں۔ مَیں تمہارا زخم دیکھنا چاہتا ہوں"۔

اُس نے جواب دیا۔ مَیں زخم نہیں دکھانا چاہتا۔ مُجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔ زخم پر اُس کا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ مَیں نے بڑی نرمی سے اُس کا ہاتھ وہاں سے سرکایا۔ یہ ایک تلوار کا زخم تھا۔ جسکو لگے غالباً ۲۰ یا ۲۴ گھنٹہ گذر گئے ہونگے اگر اُس کا علاج فوراً اُسی وقت ہوتا تو بھی جان بر ہونا ناممکن تھا۔ ظاہر تھا کہ عنقریب اس کا مرغِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائیگا۔ بڑا بھائی اس جاں بلب لڑکے کیطرف اس بیدردی سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی زخمی پرند یا خرگوش کو دیکھتا ہے۔ یہ زمیندار لڑکا گویا اُس کا ہم جنس ہی نہ تھا۔

مَیں نے پُوچھا "جناب! یہ زخم کس طرح لگا ہے"۔

"اس کتے۔ اس غلام نے میرے بھائی کو مجبور کیا کہ اس پر تلوار کھینچے اور اس کو میرے بھائی کی شمشیر سے زخمی ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے جس کا یہ بوجہ ایک ادنےٰ غلام ہونے کے ہرگز مستحق نہیں"۔ اِس جواب میں افسوس۔ یا غم یا رحم کا نشان تک نہ تھا۔ متکلم کے زعم میں اس ادنیٰ الجنس کے مخلوق کا اس مکان میں مرنا کسیقدر نامناسب سا تھا۔ مگر اس سے زیادہ اس کی موت کی کچھ پروا نہ تھی۔ اُس کے نزدیک زیادہ بہتر ہوتا کہ یہ حقیر غلام اوروں کی طرح اپنی مرگِ طبعی سے

مرتا تاکہ انکو ناحق کی تشویش نہ کرنی پڑتی۔

اِس تقریر کے اثنا میں لڑکے کی آنکھیں پہلے متکلم کی طرف آہستہ آہستہ پھریں اور بعد ازاں میری طرف۔

ڈاکٹر صاحب! یہ امرا بڑے متکبر لوگ ہیں لیکن بعض اوقات ہم ذلیل کتّوں میں بھی غیرت کا خون جوش میں آجاتا ہے۔ یہ بادۂ نخوت کا سرشار فرقہ ہم لوگوں کو لوٹتا ہے ہماری بے حرمتی کرتا ہے۔ ہمیں مارتا پیٹتا ہے اور جان تک لینے میں دریغ نہیں کرتا۔ لیکن کبھی نہ کبھی ہمیں بھی غیرت دامنگیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کیا آپنے اس کا ملاحظہ کر لیا ہے"۔

یہاں بھی مریضہ کی چیخوں اور فریاد کی آواز آرہی تھی۔ گو فاصلہ کی وجہ سے کسی قدر دھیمی معلوم ہوتی ہے۔ مَیں نے جواب دیا کہ "ہاں میں اُسے دیکھ کر آرہا ہوں"۔

"ڈاکٹر صاحب وُہ میری بہن ہے۔ یہ جفا کار اور عیّار امرا ہم لوگوں کی بہنوں کو مدّت سے بے حُرمت کرتے چلے آئے ہیں لیکن کبھی کبھی ہم میں نیک اور بہادر لڑکیاں بھی پیدا ہوجاتی ہیں۔ میری بہن ایک اچھی لڑکیوں میں تھی۔ میرے باپ نے اس کی ایک زمیندار سے شادی کر دی جو اس شخص کی جو سامنے کھڑا ہے رعیّت تھا۔ یہ دوسرا شخص اس کا بھائی ہے۔ اور اس مردُود فرقۂ اُمرا میں سب سے بڑھ کر بدذات ہی اور اسی شخص نے جو سامنے کھڑا ہے ہم سب کو لوٹ کھسوٹ کر اور جابرانہ محصول لگاکر اسقدر مفلس اور بےبس کر دیا ہے کہ میرے باپ کا قول تھا کہ ہم لوگوں میں اولاد کا پیدا ہونا غضبِ الٰہی کی نشانی ہے۔ اور یہی دُعا مانگنی چاہیئے کہ ہماری مستورات بانجھ ہوجائیں۔ تاکہ اولاد کا پیدا ہونا بند ہوجائے۔ اور ہماری قوم صفحۂ دُنیا سے ناپید ہوجائے۔ بہرحال میری بہن کی شادی ہوگئی۔ شادی کے وقت میرا بہنوئی بیمار تھا اور میری بہن نے اسی لئے شادی کی تھی کہ اپنے عاشقِ زار کا اپنے باپ کے گھر

میں لا کر علاج معالجہ کر سکے۔ اس کی شادی کو بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ اس شخص کے بھائی نے کہیں اس کو دیکھ لیا اور اس کے خاوند سے کہا کہ اپنی بیوی کو چندروز کے لئے اس کے حوالہ کر دے۔ اُمرا کے نزدیک ہم لوگوں کے تعلقاتِ زن و شوہر ایک بے معنے چیز ہیں۔ میرا بہنوئی تو شاید راضی بھی ہو جاتا۔ لیکن میری بہن ایک نیک لڑکی تھی۔ اور اس شخص کے بھائی سے اس کو اس قدر نفرت تھی۔ جس قدر مجھ کو ہے۔ اس پر ان لوگوں نے میرے بہنوئی کو مجبور کرنے کے لئے جو کچھ کیا اسکی بیان کی مجھ میں طاقت نہیں۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ان امیروں کو حق حاصل ہے کہ ہم پاجی کتوں کو گاڑی میں جوت کر ہانکیں۔ ان ظالموں نے میرے بہنوئی سے بھی گاڑی میں جوت کر گھوڑے کا کام لیا۔ ان جابروں کا یہ بھی دستور ہے کہ ہم سے رات بھر اپنے کھیتوں اور زمینوں میں پھرا لیتے ہیں اور مینڈکوں کو خاموش کرنا ہمارا کام مقرر ہوتا ہے تاکہ اُن کی نیند میں بھی خلل نہ آئے۔ رات بھر یہ میرے بہنوئی سے مینڈکوں کو چُپ کرواتے تھے اور دن بھر گاڑی میں جوتتے تھے۔ لیکن پھر بھی اس نے اُن کا کہنا نہ مانا۔ ایک دن وُہ روٹی کھانے گھر آیا اور اِدھر بارہ بجے اُدھر وہ بارہ سسکیاں لیکر اپنی بیوی کے زانو پر سر رکھے راہیِ ملکِ بقا ہو گیا اور ان ظالموں کے چنگل سے چھُوٹ گیا۔ اِس کے بعد اس شخص کا بھائی اس کی اجازت اور مدد سے میری بہن کو زبردستی گھر سے نکال لایا۔ میرے باپ کو جب خبر پہنچی تو وُہ سکتہ کی حالت میں رہگیا۔ اُس کا دل تو پاش پاش ہو گیا لیکن مُنہ سے اُف نہ نکلی۔ میں اپنی چھوٹی بہن کو ایسی جگہ چھوڑ آیا جہاں ان ظالموں کا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور خود اس مکان کا پتہ لگا کر گذشتہ شب تلوار لئے ایک چھت کی کھڑکی میں سے کُود کر یہاں داخل ہو گیا۔

"بہن نے میری آواز سُنی اور دَوڑ کر میرے پاس آگئی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ جب تک مَیں اس شخص کو نہ ماروں وُہ علیحدہ رہے۔ یہ شخص بھی پیچھے پیچھے آگیا اور پہلے میری طرف کچھ روپیہ پھینکے اور پھر مجھے ایک چابک ماری۔ لیکن اس ناچیز کتے نے اس پر ایسا حملہ کیا کہ اُسے تلوار کھینچنی پڑی۔ اب خواہ وُہ اس تلوار کے جو مجھ ناچیز کے خون سے آلودہ ہُوئی ہے کتنے ٹکڑے کر ڈالے لیکن وُہ اس سے منکر نہیں ہوسکتا کہ یہ تلوار اُس نے اپنی جان بچانے کے لئے سونتی تھی اور اپنی پُوری طاقت سے مجھ پر وار کیا تھا۔"

بعد وُہ لڑکا تھوڑی دیر خاموش ہوگیا اور پھر کہا "ڈاکٹر صاحب! مجھ کو ذرا اُٹھا کر بٹھاؤ۔ وُہ شخص کہاں گیا"؟

مَیں نے لڑکے کو اپنے سہارے سے اُٹھا کر بٹھایا اور یہ خیال کر کے کہ شاید اُسکی مُراد چھوٹے بھائی سے ہے جواب دیا کہ وُہ یہاں نہیں ہے۔

لڑکا۔ "یہ امیر جو اس قدر متکبّر ہیں اس وقت میرے سامنے آنے سے بھی خائف ہیں۔ وُہ شخص کہاں ہے جو ابھی یہاں تھا۔ میرا رُخ ذرا اُس کی طرف موڑ دیجئے"۔

مَیں نے لڑکے کی خواہش کے مطابق عمل کیا۔

لڑکا آنکھیں پھاڑ کر اور دایاں ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "اے مارکوئس اُس دن جب ان سب باتوں کا جواب دینا ہوگا مَیں تجھ کو اور تیری بداعمال نسل کے ہر ایک شخص کو خُدا کے تختِ عدالت کے سامنے طلب کراؤنگا۔ مَیں اس خون کی صلیب کا نشان اس بات کے ثبوت میں تجھ پر لگاتا ہُوں کہ مَیں ضرور ایسا کرونگا۔ تیرے بھائی کو جو اس بداعمال قوم میں سب سے بدتر ہے اس ظلم کی جواب دہی کے لئے علیحدہ طلب کرونگا۔ یہ خون کی صلیب کا نشان مَیں اس پر بھی لگاتا ہُوں۔ اس ثبوت میں کہ ضرور ایسا ہوگا"۔

دو دفعہ اُس نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھا اور اپنی انگلی سے ہوا میں صلیب بنائی۔ تھوڑی دیر تک وُہ انگلی کو اُٹھائے کھڑا رہا اور پھر اس کی انگلی نیچے کو گری۔ اور ساتھ ہی وُہ بھی زمین کی طرف گرا اور جب مَیں نے اُسے ہلایا تو وُہ مردہ تھا۔

تزکِ عبدالرحمانی - اخبار بین دنیا میں امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم والی افغانستان کی تزک جس میں اُنہوں نے اپنے حالات خود قلمبند کئے تھے - اب ایک مشہور کتاب ہے - چوہدری سلطان محمد خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا - سابق میر منشی افغانستان نے فارسی مسودہ کو صاف کر کے انگریزی میں ترجمہ کیا اور انگلستان میں شایع کیا - اس انگریزی ترجمہ نے ہندوستان میں بھی بہت قبولیّت حاصل کی - اور اسوقت تک اس کے متعدد ترجمے اُردو میں شایع ہو چکے ہیں - حال میں جناب منشی محمد حسن خانصاحب نے جو گورنمنٹ ہند کے دفتر محکمہ ملٹری میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز ہیں اور جنہیں ترجمہ میں خاص مہارت حاصل ہے ایک ترجمہ شایع کیا ہے - جس کی جلد اوّل ہمارے سامنے ہے جس کے قریب تین سو صفحے ہیں - لکھائی چھپائی نہائت عمدہ اور صاف ہے اور کتاب کے شروع میں امیر صاحب مرحوم کی ایک پاکیزہ تصویر لگی ہُوئی ہے جو کتاب کی زینت کا باعث ہے - ہر طرح سے کتاب ایسی ہے جیسی کہ منشی صاحب موصُوف جیسے بامذاق کہنہ مشق مؤلف اور مترجم سے توقع ہونی چاہئے - اس سے پہلے کئی اچھّی کتابیں انکی ہمت سے ترجمہ ہو چکی ہیں - جن میں ایک تو ناجرہ قابلِ ذکر ہے - جو ایک مشہور ترکی ناول کے انگریزی ترجمہ سے لیا گیا ہے - اور دوسرے جناب سیّد امیر علی صاحب جج ہائیکورٹ کلکتہ کی مشہور تصنیف تاریخ اہلِ عرب کا ترجمہ شروع ہے پہلی جلد کی قیمت عہ ہے اور دوسری کی بھی یہی قیمت ہوگی - جو صاحبان جلد اوّل کی خریداری منظور فرما کر دونوں جلدوں کی پیشگی قیمت بھیجدیں - اُن سے صرف عہ لئے جائینگے - درخواستیں بنام صاحب مترجم بمقام شملہ جانی چاہئیں۔

متروک الفاظ

(۲)

اُردو زبان میں آجتک مبصرینِ سخن جمع کو واحد پر فائق سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اکثر اوقات اِس قسم کی جمعیں خوبی شعر کے معاملہ میں سحر کا کام کرجاتی ہیں - مثلاً جعفر علی حسرت اُستادِ جُرأت فرماتے ہیں - ؎

بُھلا دیں یار نے دل سے ہمارے آہ بھی یادیں — عجب تاثیر رکھتی ہیں الٰہی دل کی فریادیں

نیز فرماتے ہیں :-

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں — گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

شعر اوّل میں یادوں کی جمع سے اگرچہ کوئی ظاہری فائدہ نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر غور سے دیکھیے تو "بھلا دیں" کے ساتھ اظہارِ تکمیلِ تغافل کے لئے ایک "یاد" کی بجائے "یادیں" لفظاً و معناً کسقدر موزون ہے -

اِس قسم کی جمعیں فارسی کے اُس انداز کی تقلید میں ہیں جو جمع الفاظ کے متعلق ہے میری مراد اُس جمع سے ہے جو "ہا" سے بنتی ہے - مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں :-

ہائے ایں پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد — بود با دامنِ پاکت چہ قدر ہا گستاخ

جس طرح فارسی میں اکثر ایسی جمعیں جو واحد پر "ہا" زائد کرنے سے بنتی ہیں ظاہراً بےوجہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں شعر کی خوبی اُن سے بڑھ جاتی ہے - اسی طرح اُردو میں بھی یہ طریقۂ جمع الفاظ ترقیِ حُسنِ شعر کے لئے بہت مفید ہے -

پیروانِ مومن خصوصاً نسیم دہلوی نے اِس نکتہ سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے اور جابجا اُنکا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے - مثلاً فرماتے ہیں :-

بیتابیوں نے دِل کی ڈالا ہے کس غضب میں — پہلو بدل رہے ہیں نالے کنارِ شب میں

نیز کہتے ہیں :-

نسیم غفلت کی چل رہی ہے اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

ہاں تو جمع کا یہ طریق دلکش بھی ہے اور مسلم بھی لیکن بعض ایسی صورتیں ہیں جنکو اب لوگوں نے بلا وجہ ترک کر دیا ہے - مثلاً الفاظ "آ بنیاں ہیں" "مچانیاں ہیں" بجائے "آئی ہیں" "مچائی ہیں" اور "راتیں کالیاں" بجائے "کالی راتیں" کسی زمانہ میں عام طور پر مستعمل تھے - لیکن اب متروک ہیں - حالانکہ وہ کئی قسم کا فائدہ دیتے تھے - مثلاً

(۱) حسن صفت کے بڑھانے کے لئے -

مثلاً میر صاحب فرماتے ہیں :- ؎

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا و لے
باتیں گئیں نہ دل سے تری پیاری پیاریاں

جرأت کہتا ہے :- ؎

یاد کر کے وہ حسن سبز اور انکھڑیاں متوالیاں
کاٹتے ہیں رو ہی رو ساون کی راتیں کالیاں

خواب میں بھی وہ نظر آتا نہیں مدت ہوئی
جاگتے ہی جاگتے کٹتی ہیں راتیں ساریاں

ان اشعار میں ہر موقع پر جمع صفت نے نیا کام کیا ہے - پہلے شعر میں باتوں کی محبوبی کو زیادہ کیا ہے - جرأت کے مطلع میں مصرعہ اوّل میں مستی چشم یار کو اور مصرعہ ثانی میں سیاہی شب غم کو بڑی خوبی سے زیادہ کر دکھایا ہے اور تیسرے شعر میں درازی شب فراق کو اور بھی درازی دیدی ہے -

(۲) کسی قسم کے جذبہ یا جوش کو ترقی دینے کے لئے -

مثلاً میر صاحب شوخی عشاق کی نہایت نمایاں تصویر یوں کھینچتے ہیں - ؎

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

عبد الحی تاباں جوش طرب و بہار کی کیفیت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں - ؎

فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں — کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ ؎

آپ تو تھیں ہیں پر اسکو بھی کیا خانہ خراب — درد اپنے ساتھ آنکھیں دل کو بھی لے ڈوبیاں

مصحفی اپنے وفورِ الم کا سبب نہایت دردمند الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں :- ؎

بے دیکھے جسکو پل میں انکھیں بھر آئیاں ہیں — کیا قہر ہے جو اس سے برسوں جدائیاں ہوں

اس سارے بیان سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسمائے جمع مونث کے ساتھ جمع افعال کا ہونا ضروری ہے۔ میرا جو کچھ مقصد ہے وہ یہ ہے کہ رنج یا اس وحشت وشوخی کی زیادتی کے اظہار کے لئے کبھی کبھی انکو جائز سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ بعض وقت ضرورت شعری انکی موجودگی چاہتی ہے اور بعض وقت نفس مضمون شعر۔ اور ایسی حالتوں میں وہ شاعر جو حقیقت میں بڑے ہیں انہیں استعمال کرتے ہیں اور انکے متروک ہونے کی مطلق پروا نہیں کرتے۔

مثلاً خواجہ آتش فرماتے ہیں۔ ؎

عہد طفلی ہی میں تھا میں بسکہ سودائی مزاج — بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں

اور صاحب مثنوی زہر عشق جنکی زباندانی مسلم ہے اپنی مثنوی بہار عشق میں فرماتے ہیں

اور وہ موتیاں ہیں البیلی — میں نہیں کچی گولیاں کھیلی

خواجہ صاحب نے قافیہ کی ضرورت پر نظر کر کے اور مرزا شوق نے شوخی تقریر کی کیفیت پیش کرنے کے لحاظ سے بلاتکلف انکا استعمال کیا ہے اور بجا کیا ہے۔ اگر مرزا رفیع السودا نے لکھا ہے۔ ؎

وہ صورتیں سنجانیں کس دیس بستیاں ہیں — اب جنکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

تو شیخ محمد جان شاد لکھنوی نوشاگرد میر کلو عرش فرزند میر تقی میر نے بھی نہیں

جائز رکھا ہے اور جابجا اپنے دیوان میں استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اُنکے انتقال کو صرف ایک سال ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر بے موقع نہو تو ان کا استعمال ضرور جائز ہے۔ اور انہیں صرف متروک ہونے کے لحاظ سے ٹکسال باہر نہیں سمجھنا چاہئے؀

سیّد فضل الحسن حسرت موہانی (از علیگڈھ کالج)

چاندنی رات

خاموشی کا عالم ہے ہر اک سمت ہر ایک سُو
کیا لطف ہوا ہے کہ بہے پڑتی ہے خوشبو
مہتاب ہے یا نُور کی پھیلی ہے کوئی جُو
دیکھو جو فلک کو تو نظر آتا ہے جادُو
جھرمٹ میں ستاروں کے عیاں مہ کی پری ہے
بجرے کی سواری میں ہوا کھانے چلی ہے

(میر نذیر حسین احمد آبادی)

صبح پیری

ہر وقت کا ایک مقتضا ہے ہر عمر کی وضع اک جُدا ہے
پیری میں شباب کی اُمنگیں باقی رہیں یہ کبھی سزا ہے
یہ سچ ہے کبھی جواں تھے ہم بھی کرنا جو نہ تھا وہ سب کیا ہے
پر اب ہے طلوعِ صبحِ پیری وہ خواب شباب بے مزا ہے
ہے بزمِ نشاط مجلسِ غم نغمہ نوحہ کی اب صدا ہے
آگے تھا زباں پہ بادہ بادہ اب لب پہ فقط خدا خدا ہے

(ڈاکٹر فضل حسین آتش۔ از مظفرپور)

رؤیائے مرزا

(ترجمہ از اڈیسن)

چاند کی پانچویں تاریخ کو (جسے میں اپنے آبا و اجداد کی رسوم کے موافق نہایت متبرک خیال کرتا ہوں) غسل کر کے مَیں نے کپڑے پہنے۔ اور صبح کی نماز ادا کر کے میں بغداد کی اُونچی پہاڑی پر چڑھ گیا۔ تاکہ وہاں تنہا بیٹھ کر دن کا باقی حصہ یادِ خدا میں گذاروں۔ مَیں قلۂ کوہ پر مزے سے ٹہل رہا تھا۔ اور خوشگوار نسیم کے لذت افزا جھونکے میرے دل و دماغ کو معطر کر رہے تھے۔ کہ یکایک میرے دل میں انسانی نخوت و تکبر کا خیال موج زن ہُوا۔ اور مَیں اس معاملہ پر نظرِ تعمق سے غور و خوض کرنے لگا۔ صدہا خیالات کے بعد میرے مُنہہ سے یہ الفاظ نکلے کہ بیشک انسان محض سایہ ہے اور زندگی ایک خواب ہے۔ اسی حالتِ اضطراب میں میری نظر پاس کے چٹان پر جا پڑی۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ وہاں ایک گڈریا ہاتھ میں بنسری لئے بیٹھا ہے میری طرف دیکھتے ہی اُس نے بنسری بجانی شروع کر دی۔ اُس کی آواز نہایت ہی شیریں تھی۔ اور وُہ اس مزے کی تان اُڑا رہا تھا۔ کہ میرا دل فرطِ طرب سے جوش میں بھر آیا۔ ایسا نغمہ آج تک مَیں نے کبھی نہیں سُنا تھا۔ مَیں نے دل میں خیال کیا۔ کہ یہ سُر شاید اُن آسمانی نغموں سے آشنا ہیں۔ جو فرشتہ سیرت اور نیک خصال بزرگوں کے اس دُنیائے فانی سے کُوچ کے بعد جنّت الفردوس میں داخل ہوتے ہی اِس لئے گائے جائینگے۔ کہ وُہ نزع کی خوفناک حالت کو فراموش کر دیں۔

مَیں بعض اشخاص سے پہلے سُن چُکا تھا۔ کہ یہ چٹان ایک جن کا گھر ہے۔ اور لوگوں نے بہت دفعہ اُس کے شیریں نغموں کو سُنا ہے۔ مگر کبھی کسی نے اُس کی شکل

نہیں دیکھی۔ جب مجھے اس کے راگ نے محوِ حیرت کر دیا۔ تو میرے دل میں اس کے ساتھ ہمکلام ہونے کی آرزو پیدا ہوئی۔ مَیں نے سراسیمگی کی حالت میں اُس کی جانب دیکھا۔ اُس نے مجھ کو اپنے ہاتھ سے اشارہ کرکے اپنے پاس بُلایا۔ میں نہایت ہی مودبانہ اور انکسار کی حالت میں آگے بڑھا۔ اور چونکہ اُس کے دلفریب نغمہ نے میرے دل و دماغ پر قابو پا لیا تھا۔ مَیں جاتے ہی اُس کے پاؤں پر گر پڑا۔ اور گریہ وزاری کرنے لگا۔ جن میری حالت دیکھتے ہی کچھ ایسی نظرِ لطف سے مُسکرایا۔ جو میری قوتِ متخیلہ سے آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور جس نے میرے دل سے تمام خوف اور ڈر نکال دیا۔ پھر اُس نے مجھے زمین پر سے اُٹھایا۔ اور کہنے لگا "جس خیال میں تم غرقاب تھے۔ اور جو جو باتیں حالتِ اضطراب میں تم نے اپنے آپ سے کیں۔ مَیں نے سب سُن لی ہیں۔ میرے پیچھے آؤ"۔ پھر وُہ مجھے اُس پہاڑی کی سب سے اُونچی چوٹی پر لے گیا۔ اور کہنے لگا "مشرق کی طرف نظر دوڑا کر مجھے بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو"۔ میں نے کہا۔ مَیں دیکھتا ہُوں کہ سامنے ایک بڑی وادی ہے۔ اور پانی اُس میں بڑے جوش و خروش سے لہریں مارتا ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ وادی وادیِ مصیبت ہے اور امواجِ آب زندگیِ جاوید کے مدو جزر کا ایک حصہ ہیں۔ مَیں نے پُوچھا۔ کہ کیا وجہ ہے کہ یہ تلاطمِ امواج ایک بڑے دھندلے غبار سے اُٹھتا ہے اور دوسری طرف بھی ایک نہایت دھندلے غبار میں غائب ہو جاتا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ جو کچھ تم دیکھتے ہو۔ یہ زندگیِ جاوید کا وُہ حصہ ہے جسے **وقت** کہتے ہیں۔ اور جس کی پیمائش آفتاب خود کرتا ہے۔ اور جو آغازِ دُنیا و مافیہا سے لیکر اُس کے انجام تک پہنچتا ہے۔ اچھی طرح سے اِس سمندر کی طرف دیکھو جو کہ دونو انجاموں پر اندھیرے میں گھرا ہُوا ہے اور مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا نظر پڑتا ہے"۔ مَیں نے کہا کہ مد و جزر کے درمیان میں ایک پُل کھڑا دیکھتا ہُوں۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ پُل انسانی زندگی ہے۔ اِس کا خُوب طرح سے ملاحظہ کرو۔ گہری

نظر ڈالنے سے مجھے معلوم ہوا کہ اس پل میں کوئی ساٹھ ایک مکمل محراب دار دروازے ہیں۔ اور کوئی بیس تیس ٹوٹے ہوئے ہیں۔ میں ان محرابوں کو شمار کر رہا تھا کہ مجھے اس جن نے بتلایا کہ اسی پل کے پہلے ہزار محراب تھے۔ مگر ایک سیل عظیم آیا۔ اور بہت سے محرابوں کو بہا کر لے گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ہزارہا آدمی اس پل پر گذر رہے تھے۔ اور ایک سیہ بادل اس کے دونو طرف چھایا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس پل کے بہت سے چور دروازے ہیں۔ اور جونہی کہ مسافر اُن پر قدم رکھتے ہیں۔ فوراً نیچے خوفناک سمندر میں جا پڑتے ہیں۔ مگر بعض اشخاص ایسے بھی میری نظر پڑے۔ کہ گرتے پڑتے ان ٹوٹی ہوئی محرابوں پر چلے جا رہے تھے مگر وہ بھی کچھ مدت کے بعد یکے بعد دیگرے نیچے گر پڑے۔ بعض آسمان کی طرف عالمِ تفکر میں نظر اٹھائے ہوئے چلے جاتے تھے۔ کہ فوراً ہی ٹھوکر کھا کر طعمۂ نہنگ اجل ہو گئے۔ ہزارہا آدمی پانی کے لطیف بلبلوں کے تعاقب میں چلے۔ جو کہ انہیں عجیب عجیب گوناگون رنگ دکھاتے نظر آتے تھے۔ اور اُنکے آگے ناچتے جاتے تھے۔ مگر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ بالکل قریب ہی ہیں۔ تو اُنکے پاؤں پھسل پڑے اور وہ اس خوفناک سمندر کے منجدھار میں جا گزین ہو گئے۔ بعض اشخاص ہیبت ناک صورتیں بنائے اور ہاتھوں میں خنجریں اور تلواریں لئے زبردستی اوروں کو ان چور دروازوں کیطرف دھکیل دیتے تھے۔ اور وہ بیچارے راہئ ملکِ عدم ہوتے تھے۔ میں اس عجیب عمارت کو نظرِ عبرت سے دیکھتا تھا۔ اور اس کے ہیبت ناک منظر میرے شیشۂ دل پر ٹھیس لگاتے تھے۔ اور میں کلفت کے گرد و غبار میں سراسیمہ و غرقاب ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں وہ جن کہنے لگا "مرزا اب اس ہیبت ناک پل کیطرف سے نظر ہٹالو۔ اور مجھے وہ بات بتاؤ جو تم نہیں سمجھ سکتے" میں نے اُوپر دیکھ کر کہا۔ کہ بھلا یہ جو ہزارہا پرندے پل کے دونوں طرف اُڑ رہے ہیں

انکا کیا مطلب ہے۔ جن بولا۔ کہ یہ دراصل پرندے نہیں۔ کوئی اُن میں حسد ہے۔ کوئی حرص۔ کوئی وہم۔ کوئی یاس۔ کوئی عشق۔ کوئی عیاشی۔ کوئی خود پسندی وغیرہ۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا افسوس انسان یونہی دنیا میں پیدا کیا گیا کسقدر مصیبت کسقدر رنج والم کا اُسے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں کسقدر تکلیف اُٹھاتا ہے۔ اور آخر کار اُسے موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن نے میری طرف نظر ترحم سے دیکھا۔ اور کہا اس خوفناک جگہ کی طرف مت دیکھو یہ تو انسانی زندگی کا پہلا سٹیج ہے۔ مگر اُس گہرے غبار کی طرف نظر ڈالو۔ جس میں کہ تو جزائر گرے ہُوئے آدمیوں کی نعشوں کو ڈالتا ہے۔ جب میں نے اُسطرف دیکھا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ اس وادی کے دو راستے ہیں۔ اور اس میں ایک بڑا فراخ سمندر ہے۔ جس کے وسط میں ایک بڑی پہاڑی ہے جو کہ اس کو دو حصوں میں منقسم کر دیتی ہے۔ اس کے نصف حصہ پر ابر سیاہ اس طرح چھایا ہوا تھا۔ کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مگر دُوسری جانب ایک وسیع بحر مجھے نظر آیا۔ جس میں کہ بیشمار خوبصورت جزائر تھے۔ جو کہ پھلوں اور پھولوں سے بھرے ہُوئے تھے۔ اور بیچ میں چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں۔ جن میں آب مصفا بڑی صفائی سے بہتا تھا۔ اُن کے کناروں پر سرو وصنوبر ایسی خوشنمائی سے لگے ہُوئے تھے۔ کہ اُنکی صورت دیکھتے ہی دل بے اختیار قابو سے نکلا جاتا تھا۔ اور میرے جی میں بار بار یہ آرزو پیدا ہوتی ہوتی تھی کہ صانع کی قدرت کی لاکھ لاکھ بلائیں لے ڈالوں۔ صبا ان پھولوں کی خوشبوئیں بسی ہوئی عجیب ناز وادا سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی تھی۔ بعض اشخاص مزین لباس زیب تن کئے ہُوئے۔ پھولوں کے ہار جو کہ عقود جواہر کو مات کرتے تھے۔ گلوں میں پہنے ہُوئے لب جو ٹہل رہے تھے۔ اور بعض پھولوں کی سیجوں پر آرام کی نیندیں لے رہے تھے۔ اس خوشنما اور دلچسپ منظر کے دیدار فرحت افزا سے جو خوشی میرے دل کو حاصل ہُوئی۔ قلم کی کیا طاقت ہے کہ صفحہ قرطاس پر

حروف کی شکل میں اِس کا عشر عشیر بھی دکھلا سکے۔ میرا دل بے اختیار یہی چاہتا تھا کہ کہیں سے عقاب کے پر مجھے مِل جائیں۔ اور مَیں اُڑکر وہاں جا بسوں۔ مگر میرے رفیق کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہاں جانے کے لئے کوئی آسان اور سیدھا راستہ نہیں۔ اگر وہاں کوئی جانا چاہتا ہے۔ تو اُسے ان موت کے دروازوں سے جن کو کہ مَیں نے پُل پر دیکھا تھا گذرنا ہوگا۔ پھر مجھے مخاطب کرکے وہ یُوں گویا ہوا" یہ جزیرے جو تم کو ایسے ہرے بھرے اور تر و تازہ نظر آتے ہیں۔ اور جن سے کہ اس بحر کی تمام سطح بھری ہُوئی ہے۔ تعداد میں ساحل سمندر کی ریگ کے وزن سے بھی زیادہ ہیں۔ اور یہ جزیرے جو تمہیں نظر آتے ہیں۔ انکے پیچھے اَور جزیرے بھی ہیں۔ جنہیں تمہارا محاسبِ فکر شمار نہیں کرسکتا۔ اور جن کی خوبصورتی تمہاری قوتِ متخیلہ میں سما نہیں سکتی۔ یہ محلّات بعد مرگ اُن نیک خصال آدمیوں کو درجہ بدرجہ عطا کئے گئے ہیں جنہوں نے دُنیا میں نیکی سے زندگی بسر کی اور جو کام کئے ثوابِ آخرت کے لئے کئے۔ ہر ایک محل اپنے رہنے والے کے مذاق کے موافق اشیاء سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ گویا بجائے خود فردوس بریں ہے۔ اَے مرزا کیا ایسے محلّوں میں بسنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئیے؟ کیا تم اُس زندگی کو مصیبت زدہ تصوّر کرتے ہو جو کہ تمہیں ایسے اجرِ عظیم کے حاصل کرنے کی طاقت بخشتی ہے؟ کیا ہمیں اُس موت سے ڈرنا چاہئیے جو ہمیں آخرت میں ایسی جگہ لے جائیگی۔ جہاں سے سچّی خوشی حاصل ہوگی؟ یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہئیے۔ کہ انسان (جو زندگی جاوید حاصل کرسکتا ہے) یونہیں بیفائدہ پیدا کیا گیا تھا"

مَیں نے پھر اُن خوشنما جزیروں کی طرف نہایت ہی فرحت آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر مَیں نے اُس سے کہا "براہ مہربانی مجھے یہ تو بتلا دیجئے کہ ان خوفناک سیہ بادلوں کے نیچے اس پہاڑی کے دوسری طرف کیسا منظر ہے"۔ جن نے مجھے

کچھ جواب نہ دیا - میں مڑکر پھر اس سے پوچھنے کو تھا - کہ مجھے معلوم ہوا - کہ وہ غائب ہوگیا۔ میں نے چاہا کہ پھر اسی رویاے کی طرف متوجہ ہوں - جسے اتنی دیر دیکھتا رہا تھا - مگر اُس موج زن مدوجزر - محراب دار پل - اور اُن خوشنما جزیروں کی بجاے مجھے کچھ نظر نہ آیا - ہاں - بغداد کی لمبی وادی سامنے تھی - جس میں بیل - بھیڑیں اور اُونٹ چر رہے تھے +

ذکاءُاللہ خان

مُردوں کے حامی - کیا مُردوں کو بُرا کہنا کمینہ پن نہیں - کیونکہ وُہ آپ تو اپنی حمایت میں تقریر سے قاصر ہیں ؟ مگر پھر خیال آتا ہے کہ انکو کیا پڑی ہو کہ اپنے بچاؤ کی فکر کریں - اگر آپ انہیں بُرا کہتے ہیں تو اس سے انکو سروکار ہی کیا ہو - وُہ جھوٹ جواب بولینگے اس کا اثر آپ پر اور آپ جیسے اور آدمیوں پر تو پڑیگا لیکن اس بُتِ خاکی کا جو قبر میں مدفون ہے - یا اُس رُوح کا جو قفسِ جسم سے پرواز کرگیا ہے کچھ نہیں بگاڑ سکتا - عمدہ سے عمدہ ڈھال جو آج تک ایجاد ہوئی ہے - باوجود اپنی سختی کے برچھی کی نوک کا ایسا اچھا مقابلہ نہیں کرسکتی - جیسا کہ وہ گھاس کا پتا جو صدمہ کے ساتھ ہی لچک جائے - شہرِ خاموشاں کے رہنے والوں کی نسبت جو کچھ آپ کہیں وُہ آپ کا اور اہلِ دُنیا کا معاملہ ہو - اگر جھوٹ ہے تو ضرور رنگ لائیگا - ممکن ہے لاکھوں بندگانِ خدا کو نقصان پہنچاوے - ممکن ہو صدیوں کی ترقی کو روک دے - ممکن ہے آپ کی رُوح کو نابود کردے لیکن متوفی کے کفن کے ایک سرے میں بھی شکن نہیں ڈال سکتا - اس کا خیال ہی دل میں نہ لائے - بیشک مرے ہوؤں کا کوئی حامی نہیں - مگر اُنکے دو بڑے زبردست حامی ہیں جو اُنکے لئے کافی ہیں یعنی خدا تعالےٰ قدیر اور بدنِ خاکی کو کھا جانے والا کیڑا جو خاک کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

(رسکن)

قران السعدین

ستاروں بھری رات

کھینچتی ہے شبِ تاریک سُوئے چرخ کہن　　کہ ستارے عجب انداز سے ہیں نور فگن
نور سے انکے قدامت کے ہیں روشن آثار　　اُن کی رفتار دکھاتی ہے کچھ اگلا سا چلن
نہیں معلوم کہ روشن ہیں یہ کن وقتوں سے　　نہیں معلوم کہ کب تک یہ رہینگے روشن
جگمگاہٹ کی ہے کچھ انکے نرالی ترکیب　　چشمِ بیدار ہیں جوں سنتریوں کی چتون

سُہیل

ہے انہیں میں وہ ستارہ جسے کہتے ہیں سُہیل　　کان ہے جس کی چمک اُٹھتے ہیں یاقوت یمن
نافہ سال جس کی مہک اُٹھے ادیم طائف　　کھال کھنچوائیں جس امید پہ آہوئے ختن
نور سے جس کے ضیا پاکے حسینِ وعظ　　معنوی عرش سے لٹکاتے ہیں قندیلِ سخن
ہے یہی جس کی کہ اولادِ زنا معتقد ہے　　بالکنایہ ہے یہی شیفتۂ عفت زن

زہرہ

انہیں میں وہ بھی ہے کہتے ہیں جسے اوجِ چرخ　　غمزہ و ناز اگر فن ہے وہ ہے ماہرِ فن
عشرت و عیش کی دیوی ہے پری حسن کی ہے　　ہوش کھوتے ہیں اسے دیکھ کے پروینِ پرن
گو نہیں چاند مگر چاند سی صورت اس کی　　عید کے چاند کی صورت ہے مسرت کا مشن
صبح سے لے کے ہے یہ شام تک رونقِ بزم　　ہے لگن ماہ اگر بزم میں یہ شمع لگن
کچھ تعجب نہیں ہو رقص کا اس کی ہی اثر　　ہے جو مدت سے یہ چکرایا ہوا چرخِ کہن
صبح کا اس کو بتاتا ہے ستارا کوئی　　کوئی کہتا ہے کہ ہے شام اسی سے روشن
فاسفر بھی ہے یہی اور یہی ہے وِسپر　　مختلف نور سے ہے زینتِ فانوسِ زمن

کہتے زہرہ اسے کاہن ہیں تو وینس رہب / برہمن کہتے ہیں شکرا اسے ناہید شمن
فرطِ اسما ہو اگر حسنِ مسمّیٰ کی دلیل / تو مدلل ہے یہ دعویٰ کہ یہی ہے احسن

ہاروت ماروت

وہ جو دنیا میں ہے قبرس کا جزیرہ مشہور / تھا وہیں بیچ سمندر میں کہیں اس کا وطن
نکلی اک روز سمندر سے نہا کر دھو کر / ہائے وہ سولہ سنگار اور وہ بارہ ابرن!
کہیں ہاروت کے تھے ساتھ کھڑے واں ماروت / اس طرح کا کبھی دیکھا تھا کہاں چاہِ ذقن
چاہ سے کود پڑے دونوں کے دونوں ہیں / آج تک کھاتے ہیں غوطے پڑے بے دلو رسن
لاکھ جادو وہ سکھاتے ہیں یہ نہیں کام آتا / ایک جادو بھی۔ کچھ ایسی ہے وہ جادو چتون
جس کو باور نہیں اف نہ چاہِ بابل / چاہیے سر کے لئے ہم سے وہ لے مغزِ سخن
چاہِ بابل ہو وہ دل سب ہیں کہ ہو چاہ کی لو / شمع ساں جلنے ہی مو جس نے لگائی ہو لگن
کچھ نہ پوچھو کہ ہیں اس چاہ میں کتنے جادو / دل کی پوچھو۔ تو نہیں ختم ہے بس سحر کا فن
الغرض حسن کی دیوی نے اڑائی جب آنکھ / جو کڑی بھول گئے ساری وہ تقویٰ کی ہرن
رہ گیا عشق ادھر حرص کا کھولے ہوئے منہ / اڑ گیا حسن ادھر اپنا بچا کر دامن
چمن کا حسن ادھر جن کے ستارا ناہید کا / عشق ادھر جھونکا گیا لے کے میانِ گلخن

کیوپڈ

کہتے ہیں تھی یہ فرشتوں کی نظر کی تاثیر / کہ ہوئی حاملہ ناہید بیک چشم زدن
نو مہینے میں ہوا خیر سے بچہ پیدا / کیسا بچہ! ہوں جسے دیکھ کے آنکھیں روشن
لیک دیکھو تو خود اس کی نہیں روشن آنکھیں / چاند سورج میں لگا منہ کے سے ظلمت کا گہن
گم بصر ہے پہ بصیرت سے تلافی کرتی / منہ پہ آنکھیں ہیں بندی دل کی ہیں آنکھیں روشن
کوئی ثانی نہیں اس کا قدر اندازی میں / پرلے ہی درجے کا اس فن میں یہ ہے ماہرِ فن
پیٹھ پر سونے کے تیروں سے بھرا ہے ترکش / چومتے غنچہ گل جن کے ہیں پیکاں کا دہن

قبضے میں قبضہ ہے الماس کا چاندی کی کماں | شہد کی مکھیاں چلّے کا ہیں پکڑے دامن
ہے نکلتا اُدھر احباب کے مُنہہ سے زہ زہ! | چل رہے تیر اُدھر گرہیں کماں سے زن زن
دیکھو جس تیر کو ہے دل ہی میں آکر وہ دو پا | چھیدتی ریشمی گھنڈی کو ہو جیسے سوزن

موسیقی کا کمال

سُنتے ہیں زہرہ کو موسیقی میں بھی ہے وہ کمال | کہ تھرکنے لگے گھر ناچ کھڑا ہو آنگن
در و دیوار لگیں وجد کے تال دینے | شوق میں پردے سے باہر نکل آئے چلمن
یہی موسیقی نہ ہو جس سے کہ تن میں آئی | رُوح انسان کی بنتا اُس کو جو در تن در تن
یہ ہمیں ست نہ کہیں ماخذِ فیثاغورس | کہ بتاتا ہے وُہ گردش میں فلک کو ارگن
گردشِ چرخ لگاتی ہے سُریلی تانیں | کھل گیا لے کے حقیقت ہے زمانے پہ زمن
ہر ستارہ ہے پڑا اپنی جگہ ناچ رہا | ناچ گھر خاص ہے کب ہے یہ فضا کا گلشن

اثرِ طالع

جوتشی کہتے ہیں جس وقت کہ یہ زُہرہ جبیں | جھانک کر اپنا جھروکے سے دکھاتی درشن
کیا بتائیں تمہیں اس صبحِ سعادت کا سماں | تم ہی ہر ایک گھڑی سمجھو جو ہُوئی اس کی لگن
سعدِ اصغر ہے یہی ہو نہ قران السعدین | مشتری سے جو کبھی اس کی لگی ہو نہ لگن

مشتری

بیٹھا کرسیِ سعادت پہ ہے قاضیِ فلک | ریش کی جامۂ تقویٰ پہ ہے نُورانی پھبن
ظاہر اگرچہ ہے لولیِ فلک سے سرکار | کیا تعجب ہے جو عصمت کا بچا ہو دامن
کیا عجب عشق میں مرجھی ہوں فلاطوں کے اُصول | ہو یہی چشمِ زمانہ میں فلاطونِ زمن
بزمِ واحد میں جو ہیں قاضی و لولی دونوں | بڑی اس میں بھی سعادت ہے نہ ہونا بدظن
کہتے کیوں اس کو ہیں قاضیِ فلک؟ سوچو تو | اس کی تحقیق ہے کس طور پہ عقلاً نقلاً!
اس کی تاویل وہ مدکار ہے یونان کی عقل : | آئی ہے ہند کے شہروں میں جو ہو کر لندن

وہ یہ کہتی ہے کہ تھے آلہ یوناں میں بہت
ہند میں ٹھاکروں کے جیسے ہیں ہر جا درشن

انہی میں ایک جو تھا اُن کا بڑا سا ٹھاکر
بھاگوان اُس کے تھے انصاف کی ہر گھر چرچن

دیوپتر اُس کو سمجھتے بھی تھے کہتے بھی تھے
دیوتا وں سمجھتے تھے ہر ایک اُس کا بچن

دیوپتر اور پدر دیو ہیں دونوں واحد
جوپیٹر اب یہی مشہور ہے شرقاً غرباً

پڑھ لو تاریخوں میں جا کر جوپیٹر کے اوصاف
پوچھ لو جا کے مورخ سے ہوا منتھ کہ کہن

دیوتا بن گئے تھے جتنے تھے زمیں پر آباد
پھر لگے چرخ کے دیول سے دکھانے درشن

سبب اس کا ہے دگر صابیوں کی شرکت
وہ جنہوں نے ستاروں سے لگائی تھی لگن

کچھ یہ اس ملک کی شاید کہ خصوصیت تھی
خوش نصیبی سے جہاں پایا سا تھا اُنکا وطن

تھی زمیں ریت کی ذروں سے نشاں بھر ہی رات
آسماں رات کو تھا تاروں سے قدرت کا چمن

یوں شب و روز انہیں تارے ہی آتے تھے نظر
جبھی رہنے لگے تاروں کے تصور میں مگن

رفتہ رفتہ وہ لگے اُن کی عبادت کرنے
آنکھیں بھر آکے عقیدت سے اُٹھا کر گردن

پھر عبادت میں کیے انکے مراتب قائم
دیکھا جس کو کہ تابندہ کو جتنا روشن

بت پرستوں سے ہوا صابیوں کا جب میل
ڈالی گردن میں عقائد نے تالف کی رسن

بت نہ وہ بت رہے تارے نہ رہے وہ تارے
تارے بت بن گئے بت بن گئے تارے وثن

بت تھے یا تارے تھے دونوں لگے آنکھ جانے
آسماں اور زمیں ہو گئے گھر اور آنگن

دونوں میں آج بھی قائم ہے وہی آمدورفت
وضع داری کا سکھاتے ہیں یہ دونوں ہی چلن

یوں غرض باپ وہ یونانیوں کے ٹھاکروں کا
بن گیا چرخ عقائد پہ ستارہ روشن

مشتری کر کے جسے ہم ہیں پکارا کرتے
لے کے جو جنس سعادت کی زروسے کوڑی من

قوتِ فیصلہ سے اپنی ہے قاضی مشہور
ہے یہی محکمہ عدل کا حاکم حتماً

چرخ پر اس کا ہے مشہور زبردست دماغ
عقل کل ہے یہی گویا کہ دماغاً عقلاً

ایتھنہ جس کو کہ رومی ہیں منروا کہتے
مشتری کا ہے دماغ اُس سے ہوا آبستن

عقل اور علم کا یونان کے ہے رب النوع
زادۂ اُمّ دماغ اُس کا ہے بے ہیچ سخن

علم اور عقل سے بے شک ہو سعادت کو لگاؤ
ہے سعید اب جو سرفراز ہے علماً عقلاً

نسبت دی کا ہے دنیا پہ الٰہی سایہ
کہ پڑے کشتِ ترقی پہ سعادت کی پھبن

ہم سے ایسے ہے علم کی ہستی قائم
نور سے اس کے ہیں عقل کی آنکھیں روشن

نظم بے شک ہے یہ شہباز قران السعدین
مشتری سے ہو لگی دیکھو تو زہرہ کی لگن

سعد اور غرب ہیں ہمدم سعد اکبر
لارڈ کرزن کے قریں جیسے کہ لیڈی کرزن

شہباز (از اورنگ آباد)

خون

(از ملفوظات مولوی سید امجد علی صاحب اشہری)

بہت سراغ لگایا مگر پتا نہ ملا
کہ کیوں ہے خون کا پیاسا قدیم سے یہ بشر

بہت قدیم سے رسم یہ چلی آتی
کہ بھینٹ دینے سے ہووے بلا کا دفع خطر

کبھی پہاڑوں پہ ہوتے تھے صاعقے نازل
زمانہ کرتا تھا اُن صاعقوں سے کسب اثر

تمام روم میں قربانیوں کا چرچا تھا
تمام مصر میں چرچا تھا بھینٹ کا گھر گھر

تمام ساکنِ یونان و فارس و بابل
مذاقِ خاص میں قربانیوں کے تھے خوگر

سوائے جانوروں کے حلال ہوتے تھے
جو ہوتے بھینٹ کو مخصوص آدمی چھنٹ کر

ہنود میں بھی بشدت رواج تھا اس کا
ہیں اب بھی اُس کے نمونے کے مختلف منظر

ہزاروں عورتیں اب بھی زباں کٹی دیکھو
جنہوں نے اپنی زبانیں چڑھائیں دیبی پر

زباں کے خون سے دیبی کو شاد کام کیا
کسی نے بھینٹ کیے آدمی کہیں جا کر

کھلا پلا کے اُسے دم میں ذبح کر ڈالا
ادائے رسم سے پہلے پڑھے گئے منتر

عجیب بات یہ دریافت تجربہ سے ہوئی قصائیوں کو ہو طاعون کا بھی کم ہی اثر
جہاں کی قوموں کو خونریزیوں کی عادت ہے وہاں نہ ہیضہ نہ طاعون کا بھی ہو گزر
جو بکریوں کے ہیں گلے میں عام بیماری تو چند جانوروں کے دینے سے دور ہو یکسر
اسی طرح سے جو امراض قہر مانی ہیں بتائیں آئے لیے ملک و قوم کا خاص اثر
کہیں ہیں ماتے مینڈھے کو تا ہو رفع بلا کہیں گراتے ہیں بھینسے کو پڑھ کے کچھ منتر
کوئی ہے مرغ کو دیبی کی بھینٹ کر دیتا کوئی ہے بکرے کو بچا کے مارتا یکسر
تمام کشور افریقہ ان مراسم میں ہے ایشیا بھی کچھ آگے اور بڑھ چڑھ کر
اگر کہیں کہ جہالت کی ہیں یہ سب رسمیں تو میں کہوں گا نہیں یہ مجھے نہ ہو باور
بڑی بڑی جو ہیں قومیں مہذب و دانا کہ جن کے نام پہ کرتا ہے فخر علم و ہنر
وہ خود بھی ایسے رواسم کی آپ عامل تھیں وہ آپ ایسی مراسم کی ہو چکیں خوگر
ہے محو فکر میں خود نیٹن سینچوری کہ اس کی علت اصلی کو کیا کرے باور
چھڑی تھی بحث یہ یورپ میں کیا سبب اسکا کہ امن عام ہے پیدا ہوں خاص خاص ضرر
مگر جواب ابھی تک نہیں ہوا شائع کہ جسکو مان لیں دانائے ملت و کشور
یہی ہے ہند کہ جب خانہ جنگی رہتی تھی تو قحط و ہیضہ و طاعون کا نہ یوں تھا گذر
جو کٹ کے مرتے تھے وہ ملک کا تھے کفارہ نہ چھیڑ کرتا تھا پھر عام ملک سے نیچر
ہماری قوم میں بھی ہے رواج قربانی ہماری قوم میں بھی اس کے ہیں نشاں مضمر
ہزاروں اونٹ تو لاکھوں ہوں گے نہ قربان ہے جس کے واسطے مخصوص خاص عید بقر
سوائے اسکے جو بیمار ہو کہیں کوئی تو گوسفند کریں ذبح کچھ دعا پڑھ کر
مشاہدہ سے بھی ثابت ہے اس قدر تو ہاں کہ ان سے بعض مقاصد میں ہو صدور اثر
ہمارے فعل کا مفہوم کیا ہے کسب ثواب ہمارے اونٹ کا رتبہ ہے سب سے بالا تو
ہمارا ہی نہ چلے گا کسی طرح پر کھٹ کھٹ بڑھا کے پاؤں خوشی سے جھکائے عجز کا سر

دیا جو طعنہ فرشتوں نے آدمی کے لئے ۔۔۔ وُہ سفک دم سے تعلق پذیر ہے یکسر
کہا خدا نے کہ تم جانتے نہیں اس کو ۔۔۔ میں جانتا ہُوں جو اس میں ہے رازِ حق مضمر

اشہری

خطِ منظوم

(پیغام بیعت کے جواب میں)

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں ۔۔۔ تشنہ کام مے فنا ہوں میں!
ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل ۔۔۔ خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں
کانپ اُٹھتا ہُوں ذکرِ مرہم پر ۔۔۔ وُہ دلِ درد آشنا ہوں میں!
تنکے چُن چُن کے باغِ اُلفت کے ۔۔۔ آشیانہ بنا رہا ہوں میں
گلِ پژمردہ چمن ہوں مگر ۔۔۔ رونقِ خانہ صبا ہوں میں!
کارواں سے نکل گیا آگے ۔۔۔ مثلِ آوازہ درا ہوں میں
دستِ واعظ سے آج بنکے نماز ۔۔۔ کس ادا سے قضا ہوا ہوں میں!
مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد ۔۔۔ دیدہ حور کی حیا ہوں میں؟
ہے زباں مائلِ ترانہ شوق ۔۔۔ سُننے والے کو دیکھتا ہوں میں
میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر ۔۔۔ رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں
پردہ میم میں رہے کوئی ۔۔۔ اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں
سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ ۔۔۔ کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں
میں کسی کو بُرا کہوں! توبہ! ۔۔۔ ساری دُنیا سے خود بُرا ہوں میں
جام ٹوٹا ہوا ہُوں میں لیکن ۔۔۔ مَے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری — اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے — وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے — اُس عبادت کو کیا سمجھوں میں
بُت پرستی تو ایک مذہب ہے — کفرِ غفلت کو جانتا ہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے — اور آنسو بہا رہا ہوں میں
میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو — تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکوں کی راہ نما ہوں میں
ہوں زمیں پر گذر فلک پہ مری — دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
علم لیتا ہے میری گودی میں — رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں
رہبری دہر میں ہے کام مرا — رشکِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّرِ کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
تو مری ہمسری کرے! توبہ! — دیدۂ ہمت کی ضیا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن — غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سُنکر کہا کہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
میرے دم سے جہان بستا ہے — اس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے چینی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی — حُسن کی بزم کا دیا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہوں میں
دشت میں طور پر ہے جلوہ مری — نظر مجھ کو آ رہا ہوں میں
تو ہے دل بستہ نار و گلزار — اور تری قید سے رہا ہوں میں

دست بستہ ہو دل جو میرے پہلو میں — تو پرستش کی کر رہا ہوں میں
اس دل کو بچانا ہے مطلب — سب بزرگوں کی خاک پا ہوں میں

فیض اقبال ہے اسی در کا
بندۂ شاہ دل رفت ہوں میں

اقبال

فلاکت

اور جیسا کہ صاحب ... سے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے چند طلبہ سے کالج سے اردو میں نظمیں لکھوائی تھیں یہ نظم اور ایک دوسری جس کا عنوان آثار قدرت ہے ان میں اچھی جانچی گئی ہے ان دونوں کو ہم خوشی سے ہدیہ ناظرین مخزن کرتے ہیں۔

تو ہے فلاکت بان کی تمر — دین کی اور ایمان کی بیرن
رنج و الم کے تجھ میں نشاں ہیں — سوز جہنم تجھ میں عیاں ہیں
شکل تیری یہ کالی کالی — جھونپڑی صورت آنکھوں کی لالی
غنچۂ دل ہیں دیکھ کے غش میں — خودی سے باہر اور بے بس میں
صورت ظاہر گرچہ نرالی — سیرت ہے پر موتیوں والی
صورت کو سیرت مت جانو — جھوٹ نہیں یہ دل سے مانو
شجر فلاکت گرچہ برا ہے — میٹھے پھلوں سے خوب بھرا ہے

اُلٹی کہوں گر سمجھ تو بشر ہے — زہر کا پتلا اندر باہر
صورت ہو گر تیری ڈراؤنی — دیکھ کلیجہ منھ کو آئے
خوشی کا من آں سر پہ کھڑا ہے — خوب یہ کس جھگڑے نے جڑا ہے
جان کی دشمن بن کر آئے — گنج گراں تو سر پہ لائے
مارے ہیں کھینچ کے ہے بلا سکر — پہنچاویں جو در پہ قضا کے
اہلِ خرد اب سُنے حقیقت — اس میں نہاں ہے رازِ طریقت

چھوڑ کے دنیا جب کوئی آدم — اپنے آپ میں ہو کر بے غم
قالب میں جب جان ہو شکل — قسمت نے جب کیا ہو بیکل
جی چاہے بس کھا کے ہوں بسمل — جان ہو جانبازی پر مائل
چاروں طرف سے چھوڑ سہارے — مستی میں جنگل کو سدھارے
تنہائی وہ رنگ دکھائے — وہم و گمان میں جو نہیں آئے
جنگل میں جنت کے نشاں ہوں — رازِ نہاں کچھ اور عیاں ہوں
پتوں میں لسانی آوے — دل کی کلی پھٹ سی کھل جاوے
جنگل کے بہتے وہ چشمے — کیا ہی دکھاویں عجب کرشمے
لہریں تختۂ آب رواں پر — ہیں تفسیر رموزِ نہاں پر
دفترِ حکمت دیدۂ دل ہو — اتنی فلاکت پر قائل ہو
پھر بھی ہوں ناصح کامل — یونہی کھلیں سب عقدۂ مشکل
ہر شے میں انداز ہوں نیارے — سمجھیں جنہیں کیا لوگ بچارے
تجھ سے فلاکت جو گھبرایا — عقل کا اندھا اسی کو پایا
دیدۂ دل سے جو دیکھا — دیکھا وہ جو تھا ان دیکھا

ظاہر میں نہیں تین بھی کانے باطن میں ہیں بھرے خزانے
صبر سے کڑوے گھونٹ کا پینا ہے بیمار کے حق میں جینا

پنڈت ارجن ناتھ

اسرارِ قدرت

دُنیا بھی عجیب مرحلہ ہے ہر روز نیا ہی مشغلہ ہے
دیکھو گے جدھر نظر اُٹھا کر حیرت میں رہو گے تم سراسر
ہر ایک کی شکل ہے نرالی گوری ہے کوئی کوئی ہے کالی
سبزہ ہے کہیں کہیں ہے لالہ ہر پھول کا رنگ ہے نرالا
کہتے ہیں زبانِ حال سے سب ہم سب ہیں نمود قدرتِ رب
سوسن کی زبانِ حال دیکھو پھر اس کا ذرا مقال دیکھو
نرگس کی نگاہ ہے کدھر کو ہم جانتے ہیں کہ ہے جدھر کو
حیران کھڑی ہوئی ہے اِک جا قدرت کا ہے دیکھتی تماشا
غنچہ کا جو مُنہہ ابھی کھُلا ہے کیا اسکو کہیں سے کچھ ملا ہے
گل مارے خوشی کے پھُولتا ہے ڈرتا ہوا بید جھُولتا ہے
جتنے یہ درخت باردر ہیں قدرت کے یہ اُس کی سب ثمر ہیں
سب اس کی جناب میں کھڑے ہیں مدت سے وُہ ایک جا پڑے ہیں
دیکھو جو پہاڑ تو ہو حیرت آئے گی نظر خدا کی قدرت
دو زانو وُہ بیٹھا ہے ادب سے کرتا ہے نیاز اپنے رب سے

کوئی نہیں چیزیاں تو بیکار ۔ اِک اِک میں بھرے پڑے ہیں اسرار
مینڈک کی اگرچہ شکل بد ہے بیڈھنگی ہے چال بھونڈا قد ہے
سر میں اس کے مگر ہے ایک من تاریکی شب کو کر دے روشن

محمد نعیم

کچکول

کس قدر اے زندگی ناآشنا جاتا ہوں میں کس لئے آیا تھا آخر کیوں چلا جاتا ہوں میں
ساتھیوں کا قافلہ پیچھے ہے لے راہِ عدم شکلِ آوازِ جرس آگے بڑھا جاتا ہوں میں
کر رہا ہوں قطع اس تیزی سے راہ کوئے دوست آپ اپنے ہوش کی صورت اُڑا جاتا ہوں میں
نزع میں یہ روح سے رو رو کے ارمان نے کہا وائے قسمت تو تو چل نکلی رہا جاتا ہوں میں
بزمِ عالم میں سراپا جل رہا ہوں مثلِ شمع سوزِ غم سے اشک بن بن کر بہا جاتا ہوں میں
ہو گئی میری ترقی کا سبب اُفتادگی شکلِ سایہ خاک پر گر کر بڑھا جاتا ہوں میں
جوش پر ہے عشق کا دریا سہارا کچھ نہیں دست و بازو تھک چلے ہیں ڈوبتا جاتا ہوں میں
شام تک منزل پہ جب پہونچے تو سب ہیں اکٹھا ظاہرا رستے میں لوگوں سے جدا جاتا ہوں میں
جسکو کہتے ہیں ترقی عمر کی وہ ہے کمی جسقدر بڑھتا ہوں اتنا ہی گھٹا جاتا ہوں میں
میں کسی کا بھی نہ تھا ممنوں کبھی اے ہجرِ یار آج سر پر لے کے احسانِ قضا جاتا ہوں میں
سامنے جانیکا عادل کے جب آتا ہی خیال شرمِ عصیاں کے پسینہ میں نہا جاتا ہوں میں
کھیلتے پھر النقصان کیوں برہم ہے اے دربانِ یار دل بہت بیچین کرتا ہے تو آجاتا ہوں میں
وہ نفس جو ضعف سے ہے رشکِ تارِ عنکبوت اس کی یہ قوت کہ سینے سے کھچا جاتا ہوں میں

نقشِ حسرت دل پہ کیوں شہرت جہاں میں اے ظہیر ۔۔۔ نامور ہو نیکی کمانے میں مٹا جاتا ہوں میں

(از محمد جعفر) ۔۔۔ سید نظیر حسین صاحب پاروی فائز

کبھی صورت جو مجھے آکے دکھا جاتے ہو ۔۔۔ داغ مری زیست کے کچھ اور بڑھا جاتے ہو
اک جھلک تم جو سرِ بام دکھا جاتے ہو ۔۔۔ دل پہ اک کوندتی بجلی سی گرا جاتے ہو
میرے پہلو میں تم آؤ یہ کہاں میرے نصیب ۔۔۔ یہ بھی کیا کم ہے کہ تصور میں تو آجاتے ہو
تازہ کر جاتے ہو تم دل میں پرانی باتیں ۔۔۔ خوابِ شیریں سے تمنا کو جگا جاتے ہو
اتنی تم کو بھی دکھاتے ہو مسیحا نفسی ۔۔۔ حسرتِ مُردہ کو آکے جلا جاتے ہو
دل کے دل ہی میں رہے سینکڑوں ارمان مرے ۔۔۔ کوئی آتا ہے یہ کیا آتے ہو کیا جاتے ہو
نگہِ لطف میں جادو ہے تمہاری جاناں ۔۔۔ سارے شکوے گلے اک پل میں بھلا جاتے ہو
شعلۂ طُور سے تو وادیٔ ایمن ہی جلا ۔۔۔ تم جہاں آتے ہو اک آگ لگا جاتے ہو

ہے تو نیرنگ وُہی عشق کا رونا دھونا
انہی باتوں میں نیا رنگ دکھا جاتے ہو

نیرنگ

خود بخود آیا ہوں میں جو دلِ غمناک سے ۔۔۔ میں نہیں ڈرتا کسی کے خنجرِ بیباک سے
اضطرابِ دل کی آخر مجھ سے کیوں ہے پرسشیں ۔۔۔ پُوچھ لیں خود آپ اپنے غمزۂ چالاک سے
گردشِ پیمانہ ساقی تری کیا بات ہے ۔۔۔ کر دیا آزاد فکرِ گردشِ افلاک سے
وجہ ترکِ پارسائی تجھ سے اعتنا کر دیں ۔۔۔ ذوقِ صہبا دور ہے ظالم ترے ادراک سے
ہم اسیرانِ الم پر تھا ہے منع فغاں ۔۔۔ ہے سکوں دشوار صیدِ بستۂ فتراک سے
شوقِ جنت سے ہیں فارغ عاشقانِ کوئے یار ۔۔۔ پُوچھ دیکھے کوئی ہم اُفتادگانِ خاک سے
آہِ دردآلود میں حسرت نہ ہو کیونکر اثر ۔۔۔ نکلی ہے آخر ہمارے سینۂ صدچاک سے

(حسرت موہانی)

کبھی تو بھول کے رکھدے قدم میرے سر پہ — پڑا ہوں مدّت سے نقشِ قدم تیرے در پر
وہ ناتواں ہوں جو لیٹا کبھی میں بستر پر — گماں ہوا کہ شکن پڑ گئی ہے چادر پر

(محمد مرحوم) — (امیر مینائی)

ملنے کا وعدہ منہ سے تو انکے نکل گیا — پوچھی جگہ جو میں نے کہا ہنس کے خواب میں
دامن میں آنسوؤں کی چھینٹیں پڑ رہا ہے — بسمل سے پاس ہو نہ سکا اضطراب میں

(،،) — (،،)

مرے بتوں کے تو خود لوٹتے ہیں حضرتِ شاں — خدا سے عزت مجھے میسر کرتے ہیں
کبھی بتوں سے جو کرتا ہوں وصال کی خواہش — خدا کے فضل کی امیدوار کرتے ہیں

(،،) — (،،)

نقاش کیا تمام مرقع نے رو دیا — تصویر دیکھ کر میری چشم پُر آب کی

(،،) — (،،)

یاروں میں خوئے شیفتہ ساعت ہوئی تو کیا — ظاہر میں صاف دل میں کدورت ہوئی تو کیا
نکلا نہ گھر سے فاتحہ پڑھنے تمام عمر — کوچے میں اس کے نام کو تربت ہوئی تو کیا

(،،) — (تسلیم)

ہاں زبانِ تیغ رہنے دو دہانِ زخم میں — شکرِ احسانِ ستم کچھ تو ادا ہو جائیگا

(،،) — (،،)

میں وہ محرومِ ازل ہوں کہ بہ رنگِ تصویر — نہ کبھی لب پہ میرے حرفِ تمنا آیا

(،،) — (،،)

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے — پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

(،،) — (امیر مینائی)

اپنے پروانے کے جلنے جانے پر — رات بھر شمع کو گریاں دیکھا

(سید محمود دہلوی)

جہاں کے بحر میں مثل حباب گھر رکھنا　　سفر عدم کا لگا ہے بندھی کمر رکھنا
اسیر کرکے ہمیں حکم دے گیا صیاد　　قفس ہو تنگ تو نکلے نہ بال و پر رکھنا

(سید مودود احمد)　　(منتہی)

کیا بانکپن کی مشق ہے قربان جائیے　　برچھی لگائی جاتی ہے ترچھی نگاہ سے
جل جل کے کتنے خاک ہوئے طالب جمال　　اُٹھا کبھی دھواں نہ تری جلوہ گاہ سے
بھیدی نے کھل کے دل کا پتا دیا مجھے　　میری نگاہ مل گئی تیری نگاہ سے

(معلن)　　(جلیل)

مستی نے اپنا رنگ وہاں بھی جما دیا　　ہو حق کا شور اُٹھنے لگا خانقاہ سے

(رر)　　(داغ)

لگے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد　　لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی　　بدل دے وُہ بچپن کی نادانیاں

(رر)　　(نامعلوم)

یہ سمجھا ہی کہ ہر شے میں ہے جلوہ آشکار　　اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صُورت آج تک دیکھی نہیں

(لالہ جگدیش سہائے ازاناؤ)　　(نامعلوم)

شاخوں سے برگ و گل نہیں گرتے ہیں غمیں　　زیور اُتر رہا ہے عروس بہار کا

(رر)　　(رر)

کبک و قُمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے　　کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار　　مرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے
عشق ادھر عقل اُدھر دھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھئے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

(عبدالرشید چشتی بی - اے)　　(حالی)

خوشبودار تیل



تصویر میں ایک
عجیب طاقت ہے
یعنی، خود تصویر منہہ
سے بولتی ہے۔ اسوقت
یہ تصویر خود ایک طرف
اس کے لمبے اور خوبصورت
بال زور سے ہمارے
خوشبودار تیل کے
استعمال کی سفارش کر
رہے ہیں۔

ہندوستان میں جس قدر خوشبودار تیل مروج ہیں۔ وہ علی العموم سفید تیلوں کو مختلف ذرائع سے خوشبودار بنائے جاتے ہیں۔ بنانیوالے خواص الادویہ سے لاعلم ہوتے ہیں۔ انکو بالوں کی ساخت۔ دماغ کی تشریح اور دواوں کی تاثیر معلوم نہیں ہوتی۔ بیچارے کسنے تاب اکبر کے فقیر ہوتے ہیں۔ انکا دار مدار خوشبودار ادویہ کو تیل میں بسا کر تیل کو فروخت کرنے پر ہوا اور بس۔ اگر وہ جانتے کہ تل کا تیل دماغ کو خشک و جلد و اعصاب کو خراب کرتا ہے تو آج یہ نہ دیکھنے میں آتا کہ جسکو دیکھو بیوقت بال سفید اور ادنیٰ ادنیٰ باتوں سے نزلہ زکام میں مبتلا ہیں۔ میں نے طبی اصولوں کے مطابق بالوں کی اصلیت طریق پرورش و روئیدگی و بالوں کے قیام وغیرہ حالات پر غور کرنے اور مندرجہ بالا قباحتوں اور موجودہ تیلوں کے اجزا مروجہ کے تمام نقصانات کو مدنظر رکھکر خوشبودار تیل اکسیر سر ایجاد کیا ہے جس کے استعمال سے دماغ کو طاقت اور اعصاب و عروق کو مضبوطی ہوتی ہے۔ دردسر۔ دوران سر۔ سر کا چکرانا ہمیشہ ہوتے رہنے سے بالوں کا گرنا وغیرہ بالکل دور ہو جاتی ہے۔ بالوں کی جڑیں تر رہنے سے بال خوب لمبے و نرم رہتے ہیں۔ چہرہ پر رونق اور سرخی پیدا ہو جاتی ہے۔ سکتہ بیماریاں جو چہرہ پرست گرمی سے پیدا ہوتی ہیں جن سے کلف و داغ پڑ جاتے ہیں۔ رک جاتی ہیں۔ منگا کر آزمایئے +

پتہ:- حکیم ڈاکٹر غلام نبی - لاہور۔ اعوان منزل



ہمارا کارخانہ ولایت میں قریباً ۴۰ سال سے پبلک کی خدمت کر رہا ہے جو اب لاہور میں تبدیل کیا گیا ہے
اگر کوئی منگوانے کے بعد ناپسند ہو تو واپس کریں
تمام درخواستیں بنام شیخ رحیم بخش سوداگر متصل انارکلی بازار لاہور آنی چاہئیں



خالص چاندی کے زیورات جو مطابق رسم و رواج اپنے دیس کے بنوائے گئے ہیں
تمام و غیرہ اشیاء بنام شیخ رحیم بخش سوداگر متصل انارکلی بازار لاہور آنی چاہئیں

آبزرور لاہور

شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کو کام کی زبان میں حقائق و معارف سے پہنچانا یہی ایک ذریعہ ہے۔ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ یورپین انگریز اس کے خریداروں میں ہیں۔ اور جو باتیں اس اخبار میں درج ہوتی ہیں یقیناً حکام کی نظر سے گذرتی ہیں۔ ترتیب مضامین یہ ہے۔ صفحہ اوّل (تار کی خبریں ادبی و مختصر کہانی یا مضمون جو دو ماہوار میں سہ نگاروں کے قلم سے نکلا ہوا ہوتا ہے اور اخبارات کے ضروری مضامین کے ترجمے۔ معاصرین کی رائے کے خلاصے) صفحہ دوم (لیڈنگ آرٹیکل) صفحہ سوم (ایڈیٹوریل نوٹ) صفحہ چہارم (ضروری ملکی خبریں نظم و نثر) صفحہ پنجم (اسلامی دنیا کی خبریں ممالک مغربی و شمالی کی خبریں وغیرہ) صفحہ ششم (ضمیمات) قیمت سالانہ ۱۲ روپیہ۔

غلام رسول بی۔ اے۔ مینجر

دیوان حبیب

جناب سید کاظم صاحب حبیب کنتوری یادگار ناسخ مرحوم کے کلام معجز نظام کے مجموعہ صرف پہلا دیوان جو حیدرآباد کے مطبع شمس منشی میں طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ اس قابل ہے کہ شائقین سخن اسے حرز جان بنائیں اور اپنے کتب خانہ کی رونق اس دیوان سے بڑھائیں۔ اس میں غزل کا رنگ بدل دیا گیا ہے اور غزل سے وہ کام لیا گیا ہے جسکی ضروریات زمانہ و ملک و قوم متقاضی ہیں۔ اس میں زبان ٹکسالی اور بندش علم بدیع و بیان کی پابندیوں کا ملتزمانہ پہلو لئے ہوئی استادان لکھنؤ کو یاد دلاتی ہیں۔ قیمت فی جلد ۱؎ مصنف سے معرفت مشتہران طلب کیا جائے۔

المشتہران

سید محمد ضامن و سید محمد مظفر

حیدرآباد دکن کنٹہ گوشہ محل۔ بنگلہ جناب مولوی سید محمد کاظم صاحب حبیب کنتوری۔

کایستھ سماچار۔ یہ نامور میگزین انگریزی میں الہ آباد سے زیر ایڈیٹری مسٹر ایس سنہا بیرسٹر ایٹ لا بڑی آب و تاب سے اور باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ ملک بھر کے اخبارات نے متفق طور پر تسلیم کیا ہے کہ اس میں بیشتر حصہ ایسے مضامین کا ہوتا ہے جو عام پسند ہوں۔ اور ہر قوم کے لائق مضمون نگار اپنے انگریزی مضامین سے اس رسالہ کو رونق دیتے ہیں۔ اس پر خوبی یہ کہ قیمت نہایت ارزاں ہے مگر پیشگی مینجر کا [illegible]

جلد ۳ ـ جون سنہ ۱۹۰۲ء ـ نمبر ۳

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ



مضامین نثر

مضامین نظم

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں ـ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◻ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے ـ

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبد القادر بی ـ اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے [illegible]
ایک معقول تعداد سے اور ہونہار [illegible]
ملکی علم ادب سے کرنا فضول سمجھا جاتا تھا۔ شوق [illegible]

کہ ایک باشان ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور مضمون نگاروں کے علاوہ اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں لیے ہوئے اصحاب جنکو آج تک [illegible] بنانے میں شریک [illegible] ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا۔ جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کی طرف سے ہوتے مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لیے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود رہے۔ رسالہ کا حجم (۱۹×۱۲) کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ صفحہ کا ہے۔ **قیمت** عمدہ دبیز ولایتی کاغذ پر بلا محصول تین روپیہ۔ اور دوم درجہ کے کاغذ پر دو روپیہ ہے۔ اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا۔ محصول ڈاک دونوں صورتوں میں ۶ آنہ سالانہ ہے۔ درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنی چاہیے۔ مابعد کا کوئی حساب نہیں۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ **شیخ عبدالقادر مالک و ایڈیٹر**

شرحِ اُجرتِ اشتہارات

مخزن اشتہارات کے لیے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ اس کے خریداروں کی لمبی فہرست میں پنجاب کے لوگ بھی ہیں اور صوبجات متحدہ و اودھ کے بھی۔ اضلاع دکن اور حیدرآباد میں بھی بکثرت جاتا ہے۔ اور وہاں کے امراء اور رؤسا کی ایک کثیر تعداد اس کے قدردانوں میں ہے۔ شمالی ہندوستان کے بھی معزز ترین مسلمانوں کے اسمائے گرامی اس کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس لئے اس کے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیت اشتہار کا اندازہ کرسکینگے ایک سہ ماہی کے لیے آزما کر اگر فائدہ نظر آئے تو سال بھر کا معاہدہ کریں۔ اُجرتِ اشتہارات فی صفحہ سال بھر کے معاہدہ کے لیے [illegible]۔ ششماہی کے لئے [illegible] اور سہ ماہی کے لئے [illegible] روپیہ۔ فی نصف صفحہ سال بھر کے واسطے [illegible] روپیہ ششماہی کے لئے [illegible] اور سہ ماہی کے لئے [illegible] اتفاقی اشتہارات کے لئے [illegible] اس شرح میں کمی کی گنجائش نہیں۔ **شیخ عبدالقادر مالک و ایڈیٹر۔**

نقشِ ارژنگ

اِس گئے گذرے زمانے میں بھی خاکِ پاکِ ہند سے ایسے ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوتے ہیں کہ عقل اُنکے کام کو دیکھ کر دنگ رہجاتی ہے۔ یُوں تو اہلِ کمال کو ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ناقدردانیٔ زمانہ کی شکایت رہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ شکایت زیادہ زور سے پائی جاتی ہے۔ اور اندنوں بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ فنونِ لطیفہ کے کمال کی قدر اس مُلک میں اب بہت ہی کم رہ گئی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی قدر کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ملک میں روپیہ کا مینہ برس رہا ہو۔ اور سونا چاندی کسی کی نظر میں کچھ مال نہ ہو۔ ایسی صورت میں خواہ مذاقِ قدردانی نہ بھی بڑھا ہوا ہو۔ ممکن ہے کہ ملک کے امراطلبِ شہرت و ناموری میں اہلِ فن کو انعام و اکرام دیتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ ملک کا تموّل چاہے معمولی درجہ کا ہو۔ مگر ملک میں مذاقِ فن اس درجہ پر ہو۔ کہ لوگ جی جامہ بیچ کر بھی اہلِ فن پر نثار کریں۔ ہندوستان میں نہ تو تموّل کی وُہ حالت ہے اور نہ مذاق کے پیدا ہونے اور بڑھنے کے سامان۔ پھر فنونِ لطیفہ بڑھیں تو کیونکر بڑھیں۔ ہر قبرستان میں کئی خفتگانِ خاک ایسے ہیں۔ جو مشاہیر زمانہ میں ہوتے اگر انہیں حالات سازگار مل جاتے۔ مگر چونکہ زمانہ نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ زمانہ سے بیزار ہو کر کنجِ لحد میں ہم آغوشِ حسرت و حرمان ہو گئے ہیں۔ اُس کثیر تعداد کے علاوہ جو اس طرح دنیا میں آتے اور غنچۂ ناشگفتہ کی طرح بن کھلے مُرجھا جاتے ہیں۔ کئی اہلِ کمال ایسے بھی ہیں جن کی

طبیعت کی رنگینی گل کھلاتی ہے۔ گلوں میں رنگ بھی ہوتا ہے اور بو بھی ہوتی ہے مگر وہ رنگ کسی قدرداں کی آنکھ کو تازگی نہیں بخشتا اور وہ بو کسی ذی فہم دماغ کو معطر نہیں کرتی۔ گل کھلے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں۔ تختہ گلاب مہک رہا ہے۔ اور کوئی خوشبو لینے والا نہیں۔ بہت سے اہل کمال ہیں پریشان حال اور معتوب روزگار دیار کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اور انکی حالت بالعموم ایسی ہو کہ بے اختیار فن شعر کے ایک استاد کا یہ پُردرد شعر زبان پر آتا ہے:۔

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال۔ افسوس ہے
اے کمال! افسوس ہے۔ تجھ پر کمال افسوس ہے

حیدرآباد دکن باوجود اس شہرت کے جو قدردانی اہل فن میں اسے حاصل ہے اور بجا حاصل ہے۔ کئی ایسے آشفتہ حالوں کا مخزن ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سرکار نظام نے (خدا اس سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے) عباسیوں کی فیاضی اور قدردانی علم و ہنر کی شہرت کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور کئی باکمال اس سرکار کی توسّل سے کامل ہو گئے ہیں۔ ورنہ مایوسی آج کے زورِ طبیعت کو بجھا دیتی۔ اور وہ کئی اپنے جیسے طبّاع مگر بدقسمت آدمیوں کی طرح کنج گمنامی میں پڑے رہتے۔ مگر یہ بھی مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ وہیں بہت لوگ ایسے ہیں جو یا تو نگاہِ لطفِ سرکار سے محروم رہے ہیں۔ یا اگر نگاہ اُن پر پڑی بھی ہے تو ادھوری پڑی ہے۔ اور اُن پر وہ عنایات نہیں ہوتیں۔ جو اُنکے کمال کے متناسب ہوں۔ یا جن سے وہ اپنے فکرِ معاش سے مستغنی ہو کر پوری توجّہ سے اپنے فن کو رونق دے سکیں۔ یوں تو مختلف علوم و فنون کے جاننے والے وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اُن سب کے کمال کے نمونے اپنے اپنے رنگ میں خاص خوبیاں رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت ہمارے تصوّر میں فنِ خطّاطی کے کمال کا ایک نمونہ ہے جس کی ایک جھلک اتّفاق سے دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ اور جس کا نقش ذہن میں اس

خوبی سے جما ہے۔ کہ مٹانے سے نہیں مٹتا۔ اور اسی کا نام ہم نے نقشِ ارژنگ رکھا ہے اور ہم کیا رکھینگے۔ خود سعدی شیرازی نے اس نام پر صاد کیا ہے۔ یہ نقشِ ارژنگ ایک آئینہ ہے جس کا طول ¾۲ فیٹ اور عرض ½۱ فیٹ ہے۔ اس آئینہ پر اُستاد نے ایک درخت کریدا ہے۔ جو بہ حیثیتِ شجری نہایت پیارا اور خوشنما شجر ہے۔ جڑ سے لیکر تنہ تک ایک مکمل شجر ہونے کی شان آشکار ہے۔ کیا ڈال کیا پات شجر کے مطالعہ کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس شجر کے سایہ میں ایک خوبصورت عرب گھوڑا کھڑا ہے۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ یہ گھوڑا حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے تازی گھوڑے کی صحیح تصویر ہے۔ درخت کی ٹہنیوں پر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے پرندے بیٹھے ہیں۔ کوئی اُڑنے کو پر تول رہا ہے۔ کوئی اُڑتا ہوا آرہا ہے اور آکر ستا رہا ہے۔ کسی کی حالت سے کلیلیں ٹپکتی ہیں۔ ایک کونے میں ایک بلی دبکی ہوئی بیٹھی ہے۔ اور گھات میں ہے کہ کسی پرند پر جست کرے۔ ایک آدھ پرند کی صورت پر جس سے بلی کی آنکھ لڑ گئی ہے۔ سہمے ہوئے ہونے کے سب آثار نمایاں ہیں۔ یہ پرند تعداد میں گیارہ ہیں۔ اور ایک گوشہ میں یہ موزون مصرع اُنکی موزونیت کی داد دے رہا ہے۔ دوحۂ بجمع طیرہا موزون۔ مگر سب سے بڑی بات جو اس نقاشی میں دکھائی گئی ہے اور جو دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ درخت اور یہ جانور تمام گلستاں ہیں یعنی سعدی کی گلستاں کے سارے باب نہایت باریک اور خوشنما خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور اسی لکھائی کے الفاظ ملکر اس شجر کی شاخیں اور پتے اور ان پر بیٹھنے والے پرند بنتے ہیں۔ اور سعدی ہی کے دو شعر زیبِ عنوان ہیں۔ اور اس آئینہ حیرت انگیز کیطرف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سعدی نے انہیں اسی کے واسطے لکھا تھا وہ شعر یہ ہیں:-

گر التفاتِ خداوندیش بیارآید ۔ نگارخانۂ چینی بنقشِ ارژنگ است

اُمید ہست کہ رُوئے ملال درنکشد   ازیں سبب کہ گلستاں نہ جائے دلتنگیست

باوجود باریک ہونے کے تحریر میں یہ خوبی ہے کہ اسکا بہت سا حصہ تو بغیر کسی مصنوعی مدد کے صاف پڑھا جاتا ہے اور جو زیادہ باریک ہے وُہ کلان نما شیشہ کے ذریعہ سے پُورا واضح ہو جاتا ہے۔ صاحب فن کے فن کا اندازہ اصلی طور پر اسی باریک حصہ سے ہو سکتا ہے کیونکہ کلان نما شیشہ کے ذریعہ سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بظاہر نظر کام بھی نہیں کر سکتی وہاں بھی حروف کے دائرے ایسے ہی موزون اور درست ہیں جیسے اُن مقامات میں جہاں ذرا جلی قلم استعمال کیا گیا ہو۔ اور تناسب حروف میں کہیں فرق نہیں آنے پایا۔ اس سے پہلے اسی باکمال نے اس سے ذرا چھوٹے پیمانے پر یہ فن دکھایا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کی ایک سوانح عمری اس شیشہ سے ایک چھوٹے شیشہ پر لکھی تھی اور وُہ شیشہ بر موقع جوبلی ملکہ معظمہ کو بھیجا گیا تھا وہاں سے پروانہ اظہار خوشنودی مزاج آیا تھا۔ اُس زمانہ میں الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار پایونیر نے بھی نہایت ممدوح الفاظ میں اس فن کی داد دی تھی اور سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اپنی بےنظیر جوہر شناسی کا ثبوت دیا تھا۔ معمولی اخباروں کا تو کیا ذکر وُہ تو مدتوں مدح سرائی کرتے رہے ہونگے۔ کسی اور ملک میں کسی صاحب فن کا یا اُس کی کسی ساخت کا ایسا چرچا ہوتا تو وُہ غالباً آجتک مالا مال ہو چکا ہوتا اسی قسم کے کام تیار کرنے کی سینکڑوں فرمایشیں اُس کے پاس پہنچ جاتیں اور وُہ مجبور ہوتا کہ اپنے شاگرد بنا کر اُن سے کام لے اور فن کی ترویج مزید کا باعث ہو۔ مگر یہاں تعریفیں خواہ کسی مصنف کی ہوں کسی مشہور نصیح کی ہوں کسی مدبر ملک کی ہوں۔ کسی مصوّر کی ہوں۔ کسی نقاش کی ہوں یا کسی اور فن کے ذی کمال کی ہوں۔ عارضی ہوتی ہیں اور محض زبانی۔ اُن سے کوئی معتد بہ فائدہ صاحب فن کو نہیں پہنچتا اور خلق خدا جلد اُن تعریفوں کو بھول جاتی ہے

اور دُنیا جلد اُن لوگوں کو فراموش کر دیتی ہے۔ جن پر ایک فوری جوش کے اثر سے یہ واہ واہ اور مرحبا کے ہزاروں پھول برسانے کو تیار تھی۔ ہمارے ہاں اکثر باکمالوں کو انکی محنت اور عرقریزی کا صلہ اسی زبانی تحسین و آفرین سے ملتا رہا ہے اور اُن میں سے بعض اپنی قانع طبیعت کی بدولت اسی کے نشہ میں مست رہے ہیں۔ چنانچہ آمیر مینائی مرحوم لکھتے ہیں :-

شاعر کو دل سے بھاتی ہے تحسینِ شعر امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

مگر یہ فرضی اور خیالی نشہ اور تصور کے لہلہاتے ہوئے سبز باغ اس زمانہ میں کسی کو دیر تک سہارا نہیں دے سکتے تاوقتیکہ وُہ بالکل تارک الدنیا نہ ہو جائے اور آمیر جیسا فقیر منش صُوفی مزاج کُنج قناعت کا عادی آخر واہ واہ کی بوتلوں کے نشہ سے سیر ہو کر اُس نشہ کی تلاش میں وطن سے نکلنے پر مجبور ہوا جس کے ڈورے ابیض منقوش کی دید آنکھوں کو میگون کر دیتی ہے۔

وُہ تو اپنی ذات سے آدھی چھوڑ کر ساری کی طرف دوڑنے والا نہ تھا۔ مگر امیر اللغات کی سی ضخیم اور تحقیق طلب تصنیف اُس ہوائی جنس سے وسے تحسین و آفرین کہنے میں تیار نہیں ہوسکتی تھی اور اُس کے واسطے زر سے بھرا کیسہ درکار تھا۔ اُس نے سارے ہندوستان پر نظر دوڑائی اور دکن کے سوائے کہیں بھی اُسے جائے اُمید دکھائی نہ دی۔ گیا اور چلتے چلتے یہ پیشینگوئی کرتا گیا۔

اب نہ آؤں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے ۔ مجھ کو

وہاں پہنچتے ہی اُس کے بیمار ہونے اور دنیا اور مشاغل دُنیا سے رخصت ہونے کا دردناک واقع ابھی ایسا تازہ ہے کہ اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ۔

غرض اس سے مقصد یہی ہے کہ اہل ملک اور خصوصاً رؤسائے اودھ امرا رکو ان کا اہم فرض یاد دلایا جائے کہ حیدرآباد کے باکمالوں کی قدردانی عملی طور پر کریں۔ پیشتر اس کے کہ قدردانی کا موقع انکے ہاتھ سے نکل جائے۔ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی سے نہ صرف ملکی علم و ہنر کو ترقی دیکر اہل ملک کو ممنون کریں بلکہ اپنے واسطے جہاں ان باتوں میں وہ دولت جمع کرلیں جسے نہ کیڑا کھائیگا نہ گھن لگیگا۔

خصوصاً حیدرآباد دکن چونکہ ہندوستان میں گذشتہ اسلامی عظمت و شان کا نشان باقی ہے ہر فن کے اہل کمال کے بہت حقوق ہیں اور جو سلوک آج تک صاحبان کمال کے ساتھ یہاں ہوا ہے اس کی توسیع کی بہت کچھ ضرورت ہے +

بچوں کا اخبار۔ منشی محبوب عالم صاحب مالک و ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ لاہور کی جدت پسند طبیعت کا تازہ ترین نتیجہ ایک بچوں کا اخبار ہے جس وقت سے اسکی تجویز کا اعلان بذریعہ پیسہ اخبار ہوا ہے اسکی مانگ جاری ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ ضرورت کی چیز ہے۔ ہر گھر میں بچے ہیں اور ان میں کوئی نہ کوئی پڑھتا ہے۔ انکے لئے درسی کتابوں کے علاوہ کوئی علمی تفریحی مشغلہ ڈھونڈھو تو ہندوستان بھر میں وسعت اس کی مہیا کرنے سے عاجز ہے۔ اس ضرورت کو منشی صاحب نے نہایت خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے اب جب یہ چیز تیار ہوکر ہمارے سامنے موجود ہے تو خیال آتا ہے کہ آج تک کیوں نہ تھی۔ یہ خیال کہ بچوں کے لئے ایک خاص رسالہ یا اخبار ہو طبیعت سے ایسا مانوس معلوم ہوتا ہے۔ ہاں یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یہ اخبار سردست ایک ماہوار رسالہ کی صورت میں ہے۔ جو ۱۸ × ۲۲ کی تقطیع پر ماہ بماہ شائع ہوا کریگا۔ اسکی ظاہری صورت دلکش بنانے میں بھی پوری کوشش کی گئی ہے اور اسکے مضامین بھی دلپذیر ہیں۔ اور خصوصاً اس جماعت کے لئے جس سے یہ مخصوص ہے دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ جا بجا اچھی تصویریں بھی موجود ہیں لطیفے بھی ہیں معمے بھی ہیں۔ کہیں کہیں نظم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے درج ہیں جن سے مفید نصائح کا سبق حاصل ہوتے ہیں۔ غرض کئی پہلوؤں سے اردو زبان میں یہ اپنے رنگ کا نرالا پرچہ ہے۔ اور اس قابل ہے کہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے

زبان اور قلم

(از مولانا سید امجد علی صاحب اشہری)

دُنیا میں یہی دو چیزیں ہیں جو ہزاروں برس گذشتہ کے آثار اور واقعات کو ہمارے سامنے لا رہی ہیں۔ اور انہیں سے ہم آیندہ ہزاروں برس یا قومی یادگار قائم رہنے کی اُمید کر سکتے ہیں۔ اور آج کل انہیں دو چیزوں پر ہماری ہر قسم کی سوشل اور پولیٹکل زندگی اور ترقی منحصر اور موقوف ہے۔ زبان سلطنتِ جسمانی کی وزیر اور بیانِ سلطنتِ روحانی کا سفیر ہے۔ زبان دیکھنے میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ لیکن انسان کا کوئی جزو بدن مثل زبان کے ہر شئے پر محیط و متصرف نہیں۔ زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ مثل ہوائے بسائط میں داخل ہیں۔ لیکن آپ غور تو کریں کہ اُن کی بساطت سے مادّی چیزوں کی کیسی عجیب و غریب تکوین و اصلاح ہوتی ہے۔ اور یہ قدرتی فونوگراف نیچر کے کیا کیا اسرار ظاہر کرتا ہے اور ۳۲ حرفوں کی آوازوں اور اُن کی مختلف ترکیبات سے روزمرّہ کی زندگی اور سائنس پر کیسا عجیب اثر پڑتا ہے جو قدرت کا ایک صریحی معجزہ نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی آسمانی کتاب میں ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانُ یعنے ہم نے آدمی کو بنایا اور اسکو بات کرنا سکھایا۔ گویا یہ صفت گویائی اُس کی قدرتِ آفرینش کا ایسا عجیب نمونہ ہے جس پر صانعِ حقیقی بھی ناز کرتا ہے۔ زردشت کے اقوال میں ہے کہ زبان معجزۂ قدرت ہے۔ ہندوں کا وید مقدس زبان کو برہما کے خزانوں کی کنجی بتاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی مسیحائی زبان سے وابستہ نظر آتی ہے۔ جرمن کے ایک حکیم نے پوری کتاب زبان کی لاثانی اور بےمثل طاقتوں پر لکھی ہے اور ثابت کیا ہے کہ کوئی طاقت اس سے لگا نہیں کھا سکتی۔ آنریبل سرسید کی زبان سے جو کام ہوا وہ

آپ کے سامنے ہے۔ نپولین زبان کی طاقت کو طاقتِ عظیم کہا کرتا تھا حکیم نصیر الدین طوسی زبان کی فلاسفی کو اسرارِ حکمت کے عجائبات میں بتاتا ہے۔ ارسطو کے اقوال میں ہے کہ میں قدرت کے اس عجیب و غریب آلۂ جر ثقیل کی طاقتوں کی انتہا نہیں بتاسکتا لقمان نے زبان کی نسبت فیصلہ کیا ہے کہ یہ تمام خزائنِ قدرت کی کُنجی ہے۔ انگلستان کی ہوس آف کامنز اور ہوس آف لارڈز میں جو باتیں زبان کی طاقتوں سے سرانجام پاتی ہیں۔ وُہ خاص طور پر محلِ غور ہیں۔

مُبارک وُہ قوم جس میں ایسے عالی وجوہ نطق آرا پیدا ہوں۔
اور آفریں اُس قوم کو جو زبان کی ایسی عزت کرنے والی ہے۔

زبان کے بعد قلم کی طاقت کو تلوار کی طاقت سے زیادہ پُراثر مانا گیا ہے۔ دنیا میں ہم سیکڑوں مشینیں دیکھتے ہیں لیکن یہ دمڑی کی مشین بھی ایسی عجیب ہے جو ہر وادی میں ایک پاؤں سے دوڑنے کو آمادہ اور ہر بات کی تصویر اُتارنے کو دلدادہ نظر آتی ہے۔ پرانے زمانہ کو اس سے بڑھ کر کیا فخر ہوگا جس نے زبان کی نقل اور اسرارِ نیچر کے اظہار اور طرح طرح کے نقوش اور بقا ریادگار کو ایسا عجیب آلہ اس ارزانی کے ساتھ ایجاد کیا۔ اگر ہم دُنیا کی بڑی بڑی عالیشان مشینوں کے مقابل اپنی اس دمڑی کی مشین کو سامنے لائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو کام اس مشین سے نکلتے ہیں وہ اس کا حصہ ہیں ؎

ہے لوح و قلم اوّل مخلوقِ الٰہی | آباد اسی سے ہے ہوا کشورِ شاہی
ہیں اس کے شرف لاتعد و لاتناہی | تمراں میں فضیلت پہ قلم کی ہے گواہی

دیکھو تو قلم فاتح اقلیم جہاں ہے
مثل اس کے بتاؤ کوئی فتاح کہاں ہے

ہماری دانشمند گورنمنٹ نے جتنی قابلِ قدر طریق سے قلم سے کام لیا وُہ تلوار کی طاقت سے کہیں زیادہ مضبوط اور باثر پایا جاتا ہے۔ ایشیائی لٹریچر میں قلم کو بادشاہ کا ہم مرتبہ

ما گیا ہے۔ ۵

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم

یورپ کے رسائل اور اخبار قلم کی طاقت سے وُہ کام لے رہے ہیں جو تلوار کی طاقت سے سرانجام پانا دشوار ہوں۔

کبھی ہماری قوم بھی شمشیر و قلم دونوں کی مالک تھی لیکن افسوس کہ اب وُہ دونوں سے دُور اور بہت دور ہوتی جاتی ہے۔

اِس امر کا فیصلہ کہ ہماری قوم سے تلوار اور قلم دونوں نکلے ہوئے ہیں۔ تھوڑے غور میں ہوسکتا ہے۔ تلوار کا یہ حال ہے کہ بغیر لیسنس کے ٹین کی تلوار نہیں باندھ سکتے۔ اب رہا قلم اس کو جب آپ یورپ کے آہنی پین کے سامنے لائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی ہیچ ہے۔

یورپ کے ایک معمولی اخبار اور رسالہ کے برابر ہمارا کوئی اعلیٰ اخبار اور رسالہ نہیں۔ یورپ کی ایک عام تصنیف ہماری خاص تصنیف سے بالاتر ہوگی۔ یورپ میں تصنیف کے لئے جو سرمایہ موجود ہے اُس کا یہاں پتہ نہیں۔ یورپ میں ایک ایک بات کی تحقیق میں لاکھوں روپیہ خرچ ہو جانا معمولی بات قرار پا گیا ہے۔ ہم کس برتے پر علم طبقات الارض جغرافیہ ہیئت طبعیات کی چھان بین کریں۔ یورپ میں سیکڑوں عالم اپنی قوم کی متعدد زبانوں میں مختلف مقامات پر لیکچر دیتے ہوئے پائے جائیں گے جن سے خواہ مخواہ اذہان کو کسی جانب رجحان اور قلوب میں ترقی کا میلان پیدا ہو۔ یہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہ کچھ داستان گو امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کی داستانیں کہتے ہوئے نظر آئینگے۔ بڑی معراج یہ کہ سال تمام پر نواب محسن الملک اور مولانا نذیر احمد کی زبان سے کچھ سُن لیں۔

حال میں انگلستان کے ایک سوداگر سسل روڈس نے افریقہ کی جائداد سے نو کروڑ روپیہ تعلیمی وظائف کے لئے وقف کیا۔ ہم ہیں کہ اپنے ہونہار بچوں کو دس روپیہ مہینہ کا وظیفہ نہیں دے سکتے۔ یورپ کے اخباروں میں مضمون لکھنا درشنی ہنڈی کا

کام دینا ہے۔ یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون نگار صرف اخلاقی شکریہ پر آداب بجالاتے ہیں۔ وہاں ایک ایک اخبار اور معمولی کتاب کی لاکھوں کاپیاں بک جانا آسان۔ یہاں تمدنِ عرب حیات جاوید۔ الفاروق۔ البرامکہ جیسی کتابیں خریداروں کا مُنہہ تک رہی ہیں۔ پھر ہم کیونکر کہیں کہ ہم صاحب قلم ہیں۔ ہاں جیسے گرتے پڑتے ہم اپنی زندگی کاٹ رہے ہیں ویسے ہی گڑگڑاتے اور لڑکھڑاتے ہوئے ہماری زبان بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ اور جس مایوسی سے ہم اپنی ترقی کی اُمید کرتے ہیں۔ اُسی افسردہ دلی سے اپنی زبان کی بہتری کی بھی اُمید کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی جب ہے کہ جیسے قوم میں قومی ترقیات کے لئے کچھ نہ کچھ کوشش ہو رہی ہے ویسے ہی قومی زبان کے لئے بھی کچھ نہ کچھ زندہ دلی کے اسباب پیدا کئے جائیں۔

شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پر و بال

مسلمانوں کی مروّجہ زبانوں میں عربی اور فارسی نے اپنے ادائے کلام کو اصُول و عروض مقرر کئے۔ نثر میں مرجز۔ مسجع۔ عاری اور نظم میں قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی وغیرہ کے لئے قواعدِ خاص نافذ ہوئے۔ اقسامِ کلام کے کھرے کھوٹے پر کھنے کو معیار بنائے گئے اور اقسامِ نظم کی ناپ تول کو ترازویں مقرر کی گئیں۔ لیکن اب تک اُردو کے سب معیار ناقص ہیں اور اُردو میں درجاتِ امتیازی کا بھی حصر و انضباط نہیں۔۔ اُردو میں اہلِ کمال کے مناظرات کی جگہ اولڈ فیشن اور نیو فیشن کی ترکیب کلام ایک تفاوتِ خاص ظاہر کرتی ہے۔ جو بات وہاں حلال ہے وُہ یہاں حرام ہے اور جو یہاں جائز ہے وُہ وہاں مکروہ ہے۔ میرے نزدیک اُردو کی ترقی قوم کی ترقی سے زیادہ مشکل نظر آتی ہے۔ کیونکہ اُردو کی ترقی کے لئے عربی اور فارسی کا علامہ اور انگریزی کا ایل ایل۔ ڈی ہونا ضرور ہے۔ جو اُس کے مقاصد شرقی کی تدوین کرے۔ اور اسکی بات قبولیتِ عام کا اثر رکھنے والی ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ ایسے لوگوں کو قیامت کی نیند سُلا رہا ہے

اور قوم میں جو تعلیم یافتہ پیدا ہو رہے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی اور معمولی طور کی اُردو جانتے ہیں۔ جو زبانِ اُردو کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ پس ہندوستان میں عربی اور فارسی کا زوال تکمیلِ زبانِ اُردو تک اُردو کے لئے سخت مصیبتناک امر ہے۔ جو نامعلوم طریق سے اُردو کا کام تمام کر رہا ہے۔

اُردو کے عالیشان ایوان میں بجائے اس کے کہ علوم و فنون کے وسیع اور پائدار کمرے بنائے جائیں۔ آرایش کا سامان اضافہ ہو رہا ہے۔ اور فرنیچر کی وہ کثرت ہے کہ ایک ایک درجہ میں بڑے بڑے جھاڑ لٹکتے نظر آتے ہیں۔ اور لیمپوں اور فانوسوں کی تو گنتی نہیں۔ تمدن عرب حیاتِ جاوید الفاروق المامون الہارون مولوی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ البرامکہ وغیرہ وغیرہ سب اسی فرنیچر کے شمار میں ہیں۔ علمی تصنیفات میں اُردو نے اب تک نصابِ تعلیم بھی پورا نہیں کیا۔ مولانا نذیر احمد صاحب نے منطق میں کچھ لکھنا شروع کیا تھا جو ناتمام رہ گیا۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب نے طبعیات میں کچھ لکھا اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے ایک بڑا ضروری کام کیا لیکن ابھی وہ سلسلہ بھی مکمل نہیں ہوا۔ اور مولانا نے اُس کتابی سلسلہ کو چھوڑ کر متفرق طور سے زمین و آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیئے۔ کہیں ادیب میں ایک مضمون لکھ بھیجا کہ فضائے لاتناہی میں ایک گولہ چھوٹا تھا اس سے سورج نکل بھاگا اور کبھی کسی اخبار میں ایک آرٹیکل لکھ ڈالا کہ سورج سے ایک دہکتا ہوا انگارہ نکلا اور چلتے چلتے ٹھنڈا ہونے پر زمین بن گیا۔ لیکن افسوس کہ ایک مدت سے ایسے متفرق مضامین بھی شائع نہیں ہوتے۔ آنریبل سرسید احمد خان بہادر نور اللہ مرقدہٗ اور عالیجناب نواب محسن الملک بہادر کے لکچر اور اسپیچیں اُردو کا سرمایہ فخر سمجھے جانے کا حق رکھتی ہیں لیکن ان میں بہت بڑا حصہ زوائد کلام کا ہے جو اس موقع و محل کے لئے اپنا کام نکالنے اور دُنیا کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لئے اختیار کیا گیا اور جو اس موقع پہ

حسن کلام کا کام دینے والا تھا لیکن کتابی حیثیت میں آنے اور لٹریچر کا اعلیٰ نمونہ کہلانے کے لیے اس کو ایک خاص انتخاب کی ضرورت ہے۔

میرے نزدیک ملک کو اخباروں کے بڑے بڑے طولانی آرٹکل پڑھنے اور اسکی تقلید میں مضمون آرائی کرنے سے طول کلام کا ایک عام مرض پیدا ہوتا جاتا ہے جو یورپ کے سزاوار ہے لیکن ہمارے حسب حال نہیں۔ یورپ میں بڑے بڑے تخول پر روزانہ اخبار نکلتے ہیں اور باریک ٹائپ سے چھپتے ہیں۔ اور مضمون نگاروں کو مضامین کے خاطر خواہ دام ملتے ہیں۔ اس لئے دونوں کو اس امر کی ضرورت ہے کہ بات کو بڑھا کر کہنے اور اخباری کالموں کو لمبے لمبے مضامین سے بھرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جائے۔ لیکن یہاں خدا خدا کر کے آٹھویں دن اخبار نکلتا ہے اور ۲۰×۲۶ کی عام تقطیع آٹھ صفحہ سے سولہ صفحہ تک ہی جس میں ایڈیٹر اور پروپرائٹر اخبار نے تمام دنیا کے مضامین و مطالب اور سارے جہان کے اخبار جمع کرنے کا اشتہار دیا اور اپنے خریداروں سے اسکا بیمہ کیا ہے۔ پس آٹھویں دن ان چند صفحات کو لمبے لمبے مضامین و تراجم سے بھر دینا اپنے ہاتھ سے اپنے کام کا بگاڑنا ہے۔ میرے نزدیک ہر ایڈیٹر اور مضمون نگار اور ہر انشا پرداز کو اس امر کی پابندی کرنا ضرور ہے کہ عام طور سے جو مضمون ایک صفحہ میں آتا ہے اس کو خاص قابلیت سے ایک کالم میں لکھنے کی خواہش سیکھا جائے۔ اور اس طور پر اردو کی فضولیات کو کم کر کے اخبارات میں دوسری ضرورتوں کے لئے گنجائش نکالی جائے۔

اردو میں مغربی تراجم سے بڑی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مضمون جو کتابی صورت میں آنے چاہئیں ایک مرتبہ اخبار میں لکھ کر ردی کے ساتھ عطاروں کو دے دیئے گئے ہیں۔ اور انہوں نے انکو پڑیاں بنانے کے کام میں خرچ کیا ہے۔ دوسرے نامعقول ناولوں اور معمولی تراجم میں جو ہیں کوئی فائدہ

نہیں پہنچا سکتے ملک کے اوقاتِ عزیز کا بڑا حصہ صرف ہوا۔ کاش تمام ہندوستان کے اردو خواں اور انگریزی داں ملکر انسائیکلوپیڈیا یا اسی درجہ کی اور کسی کتاب کا ترجمہ کرڈالیں تو اس ملک کے لیئے ایک لاثانی خزانہ پیدا کرنے والے ہوں۔ اور بقائے حروف تک اردو کا سرمایہ فخر سمجھا جائے۔ اور پھر اُس سے ایسے ایسے مفید سبق حاصل ہوں جو دوسرے ذرائع سے ناممکن ہیں۔

پنجاب کے زندہ دلو! کیا تم ہمت کر سکتے ہو؟

علیگڈھ کے نوجوانو! کیا تم اتفاق مشترکہ سے ویسا درخت لگا سکتے ہو جس کے سایہ میں آنے والی نسلیں تمہاری بزرگیوں کا اعتراف کرنے والی ہوں۔ اور یقین سمجھو کہ اب تمہاری سب ترقیاں صرف زبان اور قلم پر منحصر اور موقوف ہیں۔

فی زمانتا پنجاب میں ہر قسم کی ترقیات کا پتا ملتا ہے۔ وہاں اخباروں کی حالت بھی دوسرے مقامات سے اچھی ہے۔ اور طرہ یہ کہ کل جس پنجاب پر دلی اور لکھنؤ والے من حیث زبان ہنستے تھے وہ خدا کے فضل سے آج اُن کی ہمسری کا دعویٰ کر رہا ہے۔

اگر ہر حصہ ملک میں اردو کی نسبت ایسی ہی مشق جاری رہے تو چاروں طرف تدوین کلام کا ایک خاص سلیقہ پیدا ہو سکتا ہے۔

(اشہری از اٹاوہ)

مُشک

صانع مطلق نے کارگاہ ہستی کی ترکیب کے وقت اقسام اقسام طور کی اشیا اور حیوانات و نباتات بنا کر اپنی اعلیٰ درجہ کی دستکاری کا نمونہ دکھا دیا ہے۔ ہر ملک و دیار میں ایک نئی چیز اور ہر نئی چیز میں ایک انوکھی بات (اور وُہ بھی مفید خلائق) قدرت کی پکار پکار کے صاف الفاظ میں گواہی دے رہی ہے۔ زیادہ تکلف برطرف صرف سادگی اور لطافت کے ہاتھوں نیچر نے ہر شئے میں وُہ دلفریبی کی بجلی کُوٹ کُوٹ کر بھر دی ہے جس کی طرف ہر مذاق والے کا دِل کھنچا جاتا ہے اور جس کے ہر فریق والے ہمیشہ کے لئے دِل سے قدر دان ہو رہے ہیں۔

مگر یہ سب کائنات کس کے لئے؟ صرف اِک حسن تقویم کا جوہر رکھنے والے انسان ضعیف البنیان کے لیئے جو صانع کے شائستہ اور لاجواب ہاتھوں کی پُرکاری اور قدرت کی وسعت بتا رہا ہے۔ اور جسے ملاءِ اعلیٰ کی پرلی طرف سے ظلوم وجہُول کی بے بہا سند ملنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ان ضعیف انسانوں کی رسائی کے صدقے اور قربان یہ نام خدا ہر شئے تک پہنچکر (چاہے وُہ کتنی ہی اٹل اور زبردست کیوں نہ ہو) حکمرانی کے علاوہ فطرتی بناوٹ اور خوبی کے مزے لُوٹ رہے ہیں۔ اور سادگی و لطافت کے سوا بے ساختگی کے سرور اور لُطف سے قابل قدر زندگی کے حصے گذار رہے ہیں۔

وُہ کونسی چیز ہے کہ جس تک انکا کاٹ چھانٹ کرنے والا اور بُرے کو بھلے سے الگ تھلگ رکھنے والا ہاتھ نہیں پہنچا ہے۔ اُنہوں نے سرکش سے سرکش اور زبردست سے زبردست کو زیر فرمان کر لیا ہے اور زیر فرمان کیے جاتے ہیں۔ کہاں انسان کی جسمی حیثیت اور ضعف! اور کہاں دیگر مخلوقات کے قوی جُثّے اور قوت! مگر وُہ

قادرِ حقیقی جس کو چاہے فتح دیدے اور فضیلت - عقل حیران ہے اور طبیعت پریشان!
واقعی یہ مقولہ درست ہو کہ "یضع اللہ سُبحانہٗ بالضعیف حتّٰے یتعجب منہُ القوی" +

غرضکہ قدرت کے عجائبات کی زندہ تصویر اور وُہ بھی دل کش و دلچسپ اُن کے دل پر ہمیشہ سے فتحمندی حاصل کر چکی ہے یہ جو کچھ کر رہے ہیں فطرت کے جذبات نہ رکھنے کی حالت میں! یہ جو کچھ برت رہے ہیں آپ سے باہر ہو کر - جس کی بدولت آئے دن وُہ وُہ باتیں سوجھتی ہیں اور ہر کام کے عمدہ اور مفید ایسے ایسے طریقے ہاتھ لگتے ہیں - جنکا اندازہ غیر ممکن نہیں تو محال ضرور ہے - یہ اپنی طبیعت کے زور سے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی اچھی شئے سے بُری کو جُدا کر دیتے ہیں - ہر چیز میں اچھائی کے نیک پہلو ڈھونڈھ لینے کے علاوہ کوئی بھی ایسی چیز چار حدُود دہر اور اس نیلے شامیانے کے نیچے نہیں چھوڑتے جو دُنیا والوں کے لئے عمدہ اور فائدہ رساں یا کارآمد ہو!

ان کی جد وجہد اور چھان بین کے سوا عقل کی رسائی کی پہلی مثال "مشک" اور خطائی ہرنوں کے بیان سے خصوصاً مشک دستیاب ہونے کے طریقے سے ہم دینا چاہتے ہیں جو دلچسپی کی دُنیا میں بے نظیر ہے - دارالسلطنت پیچینؔ[۱] جو اقلیم خطا کے پہلے صُوبے بیچیلی میں واقع ہے جسے اک زمانہ میں صحرانشین تاتاریوں نے زبردست اور قوی اہلِ خطا کے بلوۂ عام رہنے کی غرض سے "دارالامارۃ" قرار دیا تھا - اس کے مغرب کی سمت پہاڑوں کی باقاعدہ قطار نے نافہ دار ہرنوں کو آسائش سے سکونت کا موقع دیا ہے - اُن کی فطرت عام ہرنوں کے ہمراہ بود و باش اور اُنکے ساتھ ساتھ رہنے کی مطلق اجازت نہیں دیتی ہے ایسی اُونچی اُونچی چوٹیوں پر انکے رہنے کے مکانات بنے ہُوئے ہیں - اور یہ ان میں نہ صرف رات ہی کا ہیبت ناک اور تاریک وقت کاٹتے ہیں بلکہ دن کا بھی ایک بہت بڑا حصہ گذارتے ہیں - جہاں انسان تو انسان طائرِ خیالِ انسان بھی پر نہیں مار سکتا ہے ۔

---

[۱] دیکھو مسٹر جیمز کارکرن صاحب کی ہسٹری +

اور جہاں کی رسائی کے خیال سے درندوں کے دل دہلے جاتے ہیں اور پرندوں کے کلیجے منہ کو آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جس نے اُن کی تمام عادتوں اور خصائل کے من وعن فوٹو کھینچنے سے باز رکھا۔ ان کی حرکات اور سکنات اور طرز معاشرت کی کما حقہ تحقیق ہو سکی۔

ہرنوں کی ڈیل ڈول اہل تبت اور وحشی تاتاریوں کے علاوہ خطا والے بھی بیان کرتے ہیں کہ ان ہرنوں نے کچھ تو عام ہرنوں کا قیافہ اُڑایا ہے اور کچھ سیدھی سادی بکریوں کا! مگر لطف یہ ہے کہ جسم کے بچانے کی ڈھالیں جنہیں عام طور پر "سینگ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ انکے گول مول سروں سے اُتنا ہی دُور ہیں جتنا یہ دُنیا والوں سے! نر اور مادہ دونوں اس بکار آمد شئے سے بے بہرہ۔ ڈیل ڈول میں بجز بنگالے کی غریب اور مظلوم بکری کے نہ ہرنوں سے مناسبت نہ کسی اور جانور سے۔ اک یونہی سا جسم پایا ہے جو سبک روی میں مشاق اور کیسا مشاق! جسے ہوا یا بجلی سے تشبیہہ دینی مطلق مبالغہ نہ ہوگا۔

ان ہرنوں کے مادے مشک سے یکلخت محروم ہیں مگر خیر سے نروں کے مقام ناف میں ایک چرمی تھیلی ہے۔ جسے مشک کی سکونت کا شرف حاصل ہے اور جو اپنے مادوں کے مقابل زائد حالت بیم میں ہیں اور جن کی عزیز جانیں جوکھم میں!

یورپ کے جہاں گرد اور سیاح پادری جو صرف سیر و سیاحت کی نذر ہو چکے ہیں اور جو فرنگستان سے قدم نکال کر دنیا بھر کی سیر سے سیر نہیں ہوتے ہیں۔ پھر بھی "ھل من مزید" ہی کے نعرے مارتے ہیں۔ اُنکے اقوال بھی نیک دل خطائیوں کے اظہار سے اتفاق رکھتے ہیں۔ اور ان کے تعجب خیز بیان کے صادق ہونے کی صاف الفاظ میں گواہی دیتے ہیں۔

مُشک کے کرشمے اُس حافظ حقیقی نے ہر جاندار اور ذی رُوح کو جسمی حفاظت کی اک نہ اک تدبیر سوجھا دی ہے۔ اور ایسے وسائل پیدا کئے ہیں جس سے وُہ بآسانی اپنے دشمن جانی پر فتحیابی حاصل کر لیتا ہے۔

ان ہرنوں کو اللہ جل شانہ نے سینگ عطا نہ کئے تو ان کا نعم البدل مُشک سی مست

گرد پینے والی شے سے بھرے ہوئے نافے دید یئے یہ ہرن اپنے دشمن سے (خواہ شیر ہو یا بھیڑیا یا اَور کوئی درندہ) ایسا بھاگتا ہے جیسا لاحول سے شیطان مگر پھر بھی جان جانے کا خوف اسے مشک کے نافے چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے جس سے اُس کا دشمن "طور" والا سبق لیتا ہوا زمین پر آ رہتا ہے (یعنے بیہوش ہو جاتا ہے) اور بعض اوقات اس تازہ خوشبو کی برداشت ہونے والی تکلیف (جو شدتِ حرارت اور یبوست سے عبارت ہے) دماغ شق کرتے ہی اُس کا کام تمام کر دیتی ہے۔ وہاں کی پہاڑیوں کا قول ہے کہ یہ ہرن اسی مشک کی بدولت غذا بھی حاصل کر لیتا ہے۔ سانپ کو (جسکے سوا کسی اَور گزند کا یہ خوگر نہیں) اپنی حکمتِ عملی سے بیہوش کرتے ہی ہڑپ کر جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی مشک کی بے حد خوشبو سانپ سے ایسا ہی سلوک کیا کرتی ہے۔ اور دیوانہ یا مدہوش کرنے کے علاوہ حالت کے پاس نہیں آنے دیتی ہے جس سے وُہ موذی کاٹنے اور اذیت دینے کے ارادوں میں ناکامیاب رہتا ہے غرضکہ یہ ہرن اپنے اوصاف اور خوبی میں یکتا ہے۔ سب جانوروں سے جُدا اور سب ہرنوں سے عُمدہ اور قابلِ قدر! نہ دیدہ نہ شنیدہ۔ کہ خُدا جانتا ہے کیا بات پائی ہے۔

صاحبو! قدرت کے تماشے دیکھ دیکھ کر ہم لوگوں کی عقلیں فانوس کی مانند چکر کھانے لگتی ہیں۔ اُس کا پیارا اور مُردہ دلوں کو زندہ کر دینے والا نام زبان پر جاری ہو جاتا ہے ذرا غور اور تحقیق کا چشمہ لگا کر دیکھئے۔ کثرت میں وحدت کے نہ چھپنے والے جلوے نمایاں ہیں۔ تمام مصنوعات صانع کی قدامت اور یکتائی پر دال ہیں۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

فَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

مشک کی قسمیں ختا میں مشک تین قسم کی دستیاب ہوتی ہے۔ سب سے بہتر وُہ ہے جو نافہ کے اندر پتھر کے طور پر سخت جمی ہوئی ہو اور اُس کی شناخت یہ ہے کہ اگر ایک کچے

سُوت کو لہسن کی گرہ میں ملا مشک پر ذرا گھسنے تو لہسن کی بو سُوت سے اُڑ جائیگی - دوسری قسم مشک کی وُہ ہے جو دانے دار ہوتی ہے اور ہندوستان میں ہر جگہ مِلتی ہے - تیسری قسم بالکل روغن کے طور پر گاڑھی ہوتی ہے نہ کھانے میں آتی ہے نہ دوا کے کام مگر کبھی اُسے جما کر غیر ممالک میں بار لوگ بیچ ہی ڈالتے ہیں - پہلی قسم کا دیگر ممالک میں لیجانا اور رعیت کے معززین میں یا عام طور پر فروخت کرنا قانوناً سخت ممنوع ہے - بجز فغفور کے اور کوئی اُس دل خوش کن اور خداداد شے کو اخذ نہیں کر سکتا - یا شاہزادگانِ خطا اس نعمت غیر مترقبہ کے مستحق مانے جاتے ہیں - اب رہیں دو قسمیں وُہ ہر ملک اور ہر دیار میں باقاعدہ جاسکتی ہیں کوئی مخالفت نہیں ! اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں !

ہرنوں کی گرفتاری کے وسائل یہ ہوشیار اور اپنے گنوں کا پُورا وحشی جانور تین طور پر گرفتار ہو کر اپنے بے بہا جوہر سے مالامال کرتا ہے -

(۱) جب شکاری کسی خاص مخبر کے ذریعہ سے یہ بات سُنتے ہیں کہ ہرنیں فلاں مقام سے گذرتی ہیں - فوراً اُسی مقام کے اطراف و جوانب میں اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں - اور اُنکے اشارے سے تین چار شخص بانسری بجانے والے (جو اسی غرض سے لائے جاتے ہیں) نہایت ملائمت سے میٹھی اور دردناک آوازیں نے بجانے لگتے ہیں جسکے سُنتے ہی یہ لطیف طبع اور صدائے خوش پر مٹنے والے جانور مست ہو جاتے ہیں - اور عقل کی پابندی سے آزاد ہوتے ہی اُسی سمت (جدھر سے نے کی آوازیں آتی ہیں) ہلکر آہستہ آہستہ اٹھلاتے ناچتے چلے جاتے ہیں :

باوجود خوف گرفتاری اور جبلّی وحشت و رمیدگی یہ یہانتک قربت اختیار کر لیتے ہیں کہ تاک میں رہنے والے بے رحم شکاریوں کو بندوقوں سے مار لینا نہایت سہل ہو جاتا ہے -

(۲) بعض شکار کرنے والے لڑکوں کی مہین اور موہنی سُر کی آواز کی بدولت (جس پہ

یہ بلا کے چلتے ہوئے ہرن ہوش کھو بیٹھتے ہیں، بآسانی جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ واقعی آوازِ خوش اور راگ ایک ایسے مقناطیسی مادّے کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ جو علاوہ انسانوں کے حیوانوں پر بھی پورا قبضہ کر لیتا ہے۔

جانوروں پر آوازِ خوش کا اثر مجھے اس مقام پر ایک عجیب واقعہ یاد آگیا۔ اپریل ۱۸۹۸ء کے کوارٹرلی ریویو میں جانوروں پر باجہ کے اثر کی بابت ایک دلچسپ آرٹیکل شائع ہوا تھا پہلے پہل ایک چھپکلی پر آزمائش کی گئی۔ جوں ہی اُس نے سرود کی پہلی آواز سُنی اپنا سر اُٹھایا اور چوکنّی ہو کر سُننے لگی۔ لیکن آہستہ آہستہ اپنے سر کو جنبش دیتی رہی۔ اِس کے بعد سانپوں پر آزمائش کی گئی۔ ایک پنجرے میں کئی سانپ بند تھے۔ جب باجہ بجنا شروع ہوا تو اُنہوں نے اپنے سر اُٹھائے۔ اور زبانیں نکالنے لگے۔ جب آواز میں کوئی خرابی اور کمی پیدا ہوئی تو ہر سانپ کا سر یکا یک پیچھے کو ہٹتا نظر آیا۔ یوں تو ہر سانپ نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ لیکن خونخوار "کوبرا" (جس پر ہندوستان کے سپیرے بڑی کامیابی سے فتح پاتے ہیں) ایک چھوٹی سی بانسری کی دلکش آواز سُنتے ہی فوراً بیدار ہو گیا۔ جو اپنے پنجرے کے پیندے پر بڑے آرام سے بے خبر سو رہا تھا۔ پہلی آواز سنتے ہی اُس نے سر اُٹھایا۔ اور آنکھیں دروازے پر لگا دیں (کیونکہ اسی طرف سے آواز آرہی تھی) جب باجہ تیز ہوا وُہ اپنی دُم کے بل سیدھا کھڑا ہو گیا اور پھن پھولا دیا۔ اور باجہ کی لَے پر اِدھر اُدھر جھومنے لگا۔ بالآخر جس قدر باجہ کی آواز میں تبدیلی ہوتی تھی اسی قدر سانپ کی اُن غیر معمولی حرکتوں اور سر کی جنبش میں تبدیلی واقع ہوتی تھی۔

ممالک قطبی کا ریچھ بانسری اور باجہ کی آواز سُننے کے لئے اپنی پچھلی ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا۔ اور اپنا اطمینان ظاہر کرنے کی غرض سے کچھ بڑبڑاتا رہا۔ شیر کے پنجرے میں ہر شیر کا سر سرود کی پہلی آواز پر اُٹھ گیا۔ جب باجہ میں تیزی ہوئی ہر شیر نے اپنی دُم ایک طرف سے دُوسری طرف ہلانی شروع کی جنگی وُہ ہی کیفیت تھی جو کسی بلی کی جست کا ارادہ کرتے

وقت ہوا کرتی ہے۔ شہنائی باجہ سنتے ہی شیخ کے پاس چلی آئی۔ گویا وہ شیر کو آگے سے ہٹانا اور خود نزدیک سے سننا چاہتی تھی۔ اسی طرح بھیڑیے اور ہاتھی پر آزمائش کی ٹھہرائی گئی۔ بانسری کی آواز پر ہاتھی دفعتاً کھڑا ہو گیا۔ دور سے سنتا کہ اس کا ایک پاؤں زمین سے اٹھا ہوا تھا اور سارے بدن پر ایک سکون کا عالم طاری تھا۔ جب تک بانسری بجتی رہی سکوت طاری رہی اور ایک سی کیفیت۔ جب بانسری بند ہوئی سارا نقشہ بگڑ گیا ہاتھی باجہ اور بانسری بجانے والے کی طرف زور شور سے اپنے پاؤں پٹکنے لگا۔ چیتا نفیری کی تیز آواز پر غصہ میں کھڑا ہو گیا لیکن پھر سرود کی آواز سے حالت سرور میں اور خوشنود سا نظر آتا تھا۔ اس کے بعد بانسری بجنے لگی تو اس کی سریلی آواز نے اس پر اور زیادہ اثر ڈالا۔

اس قصہ سے یہ حصہ ملا کر سرود اور بانسری یا اور کوئی باجہ جس کو اشرف المخلوقات کہلانے والوں کے مذاق نے باجوں میں نہایت درجہ پسند کیا ہے۔ وحشیوں کے حیوانوں کو بھی مرغوب بالطبع ہے۔ اور ان کی فطرت میں ایک نوع کی مناسبت رکھدی گئی ہے جسکی وجہ سے وہ آواز خوش بطیب خاطر قبول کرتے ہیں۔ اور یہ قبولیت طبع ایک حد پہنچ کر انہیں آپے سے باہر کر دیتی ہے!!

آمدم برسر مطلب مشک والے ہرنوں کی گرفتاری کے دو طریقے تو حوالہ قلم کر دیئے گئے اب تیسرا طریقہ لکھا جاتا ہے۔

(۳) جب یہ پہاڑوں کی بلند بلند چوٹیوں سے اتر اتر کر حالت تشنگی میں پانی کی بہتی ہوئی جھیل کیطرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے موقع پر چھپے اور آس پاس سے شکاری بہت سے آدمیوں کو لئے بڑے بڑے ڈھول اور نقارے بجاتے ہوئے دفعۃً گھیر لیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے بڑے بڑے جھانجھوں کی وحشت خیز آوازوں سے وہ حشر مچانا شروع کرتے ہیں کہ بیچارے ہرنوں کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ایسے بھاری

جھٹکے اور ایسے غل غپاڑے سے خائف ہو کر پانی میں کود کود پڑتے ہیں۔ پھر کیا ہے یہ شکاری باطمینان اُن ڈوبتے ہوؤں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔

مشک کے دستیاب ہونیکا طریقہ

گو کہ اُن کی گرفتاری کے تین طریقے جاری اور مروج ہیں اور وقتاً فوقتاً انپر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ مگر سب سے عمدہ اور انسب بندوق سے شکار کرنیکا طریقہ ہے (جو ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں) جس سے وہ جانور آن کی آن میں مرجاتا ہے اور مشک بگڑنے نہیں پاتی۔ اور نہ پھیلنے! اگر کچھ دیر اُسے ایذا پہنچے اس حالت میں مشک (جو حقیقت میں اک قسم کا خون ہے) تمام وجود اور سارے جسم میں سرایت کرنے میں کچھ دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی۔ اسی غرض سے شکاری دام میں پھانستے ہی اک باریک ریشمی دوڑے سے ناف کو جکڑ دیتے ہیں۔ اور اسقدر زور سے گرہ پر گرہ دیتے ہیں کہ رگوں کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی سیدھی راہ سے آنے جانے والا مسافر خون کسی عاشق کی رکتی ہوئی آہ کی طرح جہاں ہوتا ہے وہیں رک جاتا ہے۔ اور رستہ مسدود ہونے کی بدولت اپنی دلی تمناؤں کا خون کرتا ہوا اور وطن مالوف کو خیرباد کہتا ہوا ہمیشہ کے لئے مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔

بسا اوقات بندش میں دیری واقع ہوتی ہے جس سے نہ صرف ناف ہی کی چرمی تھیلی میں ایلی مشک کی پختہ رنگ والی صورت نظر نہیں آتی بلکہ اُس کی (یعنے ہرن کی) رگ رگ سے بوئے مشک آنے کے علاوہ (جو نہایت تعجب خیز بات ہے) بوٹی بوٹی اور جسم کے گوشت کا ہر حصہ تلخ اور بیحد کڑوا کسیلا ہو جاتا ہے۔ الحاصل یہ مشک بھی عجیب ہے اور یہ جانور بھی غریب جانور ہے۔ عجیب عجیب کرشمے دکھاتا ہے۔ اپنی ہوشیاری کی حمایت سے شیر اور بھیڑیے جیسے درندوں کے ہاتھ نہیں لگتا۔ علاوہ چستی اور چالاکی کے (جو اس میں ودیعت کی گئی ہے) بلاؤ اس قدر دور اندیش ہے کہ اپنی مینگنی تک کو بلی کی طرح مٹی میں چھپا دیتا ہے۔ اور اپنے پیشاب کو اس لئے چاٹ جاتا ہے کہ دشمنوں کو ذرا بھی پتہ اور

ممکن نہ تھے۔ مگر افسوس ہے یہ ہشیاری پھر بھی حضرتِ انسان کے زبردست ہتھکنڈوں سے چھوٹنے نہیں ملتا۔ ان چالیوں سے وہ لاکھ اڑتا ہے مگر آخر انکے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ انسان ضعیف ہونے پر بھی ایسی ایسی کاروائیں کرتے ہیں اور آسمان سے ستارے توڑ لاتے ہیں خداجانے اگر قوی طور پر تخلیق ہوتی تو یہ اللہ کے بندے کیا کچھ کر چھوڑتے۔

بغفلت ساختن دل تا وا رید از غیرتِ امکاں
چہا میسوخت این آئینہ گر میداشت بینائی

اصل غرض کیطرف مراجعت صاحبو! یہ باوجود حیثیت غیر جنس (اور وہ بھی قوی) پر کیونکر فتحیابی حاصل کرتے ہیں؟ اس کی اصلی وجہ کیا ہے؟ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ یہ اللہ نے اپنی قدرت اور صنعت کے تماشے دکھائے ہیں۔ اور انسان ضعیف البنیان کو اشرف مخلوق بنا کر عجیب قدرتیں (اگرچہ حادثہ) عنایت فرمائیں۔ اور آدم کو تمام علوم وفنون کا مرکز بنا دیا۔ فیض کے چشمے جاری کر دئے۔ وہ ہمت و استقلال فیاضی سے بخشا کہ فرشتے تک دنگ رہ گئے۔ ؎

دامن توفیقِ ما گردِ تعلق برنداشت آفتابِ ہمت ما از سرِ دنیا گذاشت

یہی تو سبب ہے جو ہم اوپر لکھ آئے کہ حضرتِ انسان کی رسائی کے صدقے اور شاید یہ بازوئے جستجو اور قدم ہمت کی قوت سے موہوم سے موہوم اور زبردست سے زبردست شے سنگ پہنچکر اپنا رنگ جما دیتے ہیں۔ اور قابو پاتے ہی زیر فرمان کر لیتے ہیں۔

بھلا ان ہرنوں کی بساط ہی کیا ہے۔ حضرت انسان تو ہوا کو باندھ لیتے ہیں۔ اور فانوس عقل کی روشنی سے ظلمات کی چھپی ہوئی چیزوں کا معائنہ کر لیتے ہیں۔ حکمتِ عملی کی لگاتار بارش اور صنعتوں کے ہل سے زمانے کی جگر کاٹنے والی زمین میں راحت رساں اشیا کے علاوہ عجیب اور مہذب اشیا کا ہرا بھرا کھیت کھڑا کر دیتے ہیں!

(غلام یٰسین آہ۔ دہلوی از کلکتہ)

گناہ

(بہ تقلید حضرت آغا شاعر دہلوی)

اے چہرہ پر جھریاں والے بوڑھے تیری رگوں میں خون کا نام نہیں ہے۔ تیرے ارغوانی رخساروں پر بڑھاپے کا یاسمینی نور برس رہا ہے۔ تیرے سیاہ اور گھنے بال بگلے کے پروں کی طرح سفید ہو گئے ہیں۔ جنکو نہ کسی رنگریز کے قابل تعریف ہاتھوں نے رنگا ہے اور نہ انہیں کوئی خضاب ہمیشہ کے لئے سیاہ کر سکتا ہے۔ ان کی طبیعت اسی طرح بدل گئی ہے جس طرح تیری جوانی کا زمانہ گذر گیا۔ ہاں ذرا سچ کہنا۔ کبھی تجھے اپنا گذشتہ اور حسرت آمیز زمانہ یاد آیا۔ کیا تو نے اس گذرے ہوئے پر بہار وقت کو یاد کر کے کوئی ٹھنڈی سانس اپنے مرجھائے ہوئے دل سے کھینچی۔ کیا کبھی گذشتہ زمانہ کی یاد نے تیرے دل کو میلا کیا۔ اور کیا تو نے عمر کا ادنےٰ سے بھی ادنےٰ حصہ زمان رفتہ کی تلاش میں بسر کیا۔ اگر تو نے ایسا نہیں کیا۔ تو مجھے تیری حالت پر افسوس آتا ہے۔ مگر تو قابل رحم ہے۔ آہ بوڑھاپے ضعیف ہے۔ معذور ہے۔ آ میں تیری مدد کرتا ہوں اور تجھ کو تیرا گذشتہ زمانہ یاد دلاتا ہوں۔

اے سفید پلکوں والے بوڑھے وہ دن تجھے یاد ہے۔ جب تو اپنی خاک میں مل جانیوالی ماں کی آغوش میں دودھ پی رہا تھا۔ جب تو اپنے ننھے ننھے لال لال ہونٹوں سے کچھ اس انداز سے ہنسا کرتا تھا کہ تیری ماں کا دل اس کے پہلو میں اسی طرح تڑپ جاتا تھا جس طرح تیرے دودھ کے سفید سفید دانت تبسم کے وقت بجلی گرایا کرتے تھے۔ جب تو اپنی روشن اور سیاہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والی آنکھوں سے پہروں آسمان پر خوبصورت چاند کے ٹکڑے کو گھورا کرتا تھا۔ اور اپنی نازک کلائیوں کو حرکت دے دیکر چھوٹی چھوٹی انگلیوں

سے اشارہ کیا کرتا تھا اور خدا جانے تو نے چاند میں کونسی بات دیکھ پائی تھی کہ گھنٹوں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ تجھے اپنی وہ کلکاریاں یاد ہیں جنہیں تو اپنی نرم اور نازک لبوں سے نکال کر ہوا کے تموج کے ذریعہ سے چاند کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ کیا تجھے اپنی وہ بے سود کوشش یاد ہے۔ جب تو چاند کو اپنی آغوش میں کھینچنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر تھکا دیا کرتا تھا۔ اور جب تجھے اپنی امیدیں مایوسی ہوتی تھی۔ تو ہنستے ہوئے چہرہ سے بسورنے لگتا تھا اور کچھ دیر بعد مہین ہچکیں جو چھوٹے سے گلے اور پیارے لبوں سے دلفریب معلوم ہوتی تھیں۔ سنائی دینے لگتی تھیں۔ پھر تیری ماں آجاتی تھی۔ اور تجھے روتا دیکھ کر (اگرچہ تیری آنکھوں سے کوئی بھی قطرہ اشک نہیں گرتا تھا) چھاتی سے لگا لیتی تھی۔ اور تو اسکا خون جسے دنیا والے دودھ کہتے ہیں اور جو تجھے آب کوثر سے زیادہ میٹھا اور مزیدار معلوم ہوتا تھا غٹ غٹ کرکے پینے لگ جاتا تھا۔

اگرچہ تو اسوقت فرشتہ سے زیادہ معصوم اور روح سے زیادہ پاک تھا لیکن پھر آدم کا بیٹا تھا۔ آدم کا گناہ تیرے عنصری خمیر میں موجود تھا اور آج یہ پہلا دن تھا کہ تو نے گناہ کے دروازہ میں پہلا قدم رکھا۔ اور دودھ پیتے پیتے شوخی سے یا یوں کہو سادگی سے اپنی بےقصور اپنی بےگناہ اور اپنی بھولی ماں کی چھاتی میں زور سے کاٹ کھایا۔ اور جب اس نے بےچین ہوکر تجھے اپنی چھاتی سے علیحدہ کر دیا تو تو نے جلدی سے چہرہ بگاڑ کر رونی صورت بنالی۔ ہرچند تجھے خدا نے گویائی کی طاقت نہیں دی تھی۔ پھر بھی تو نے اس دل سوز اور مہربان بلکہ شفیق ماں کو نگاہوں نگاہوں میں یہ دھمکا کر چھوڑا کہ اگر دودھ نہیں پلاؤگی تو ابھی غل مچا دونگا۔ دیکھ اے ضعیف اور قبر میں پاؤں لٹکانے والے بوڑھے یہ تیری پہلی گستاخی تھی جو تو نے اپنی ماں سے کی۔ وہ ممتا کی اندھی ماں تیرے اس قصور کو خیال میں بھی نہیں لائی۔ وہ اپنی تکلیف بھول گئی اور تیری پرورش میں

مشغول ہوگیا۔

اس طرح چار سال تک ناز برداریاں تیری خدمت کرتی رہی۔ اور پھر ایکدن تجھ تیرے باپ کے دامن عاطفت اور اپنے دم واپسیں کی دعاؤں کے سپرد کرکے تیرے دیدار کی حسرت لئے دنیا سے چل بسی۔ مہربان ماں کے فراق کا غم تجھے کیا ستاتا۔ کیونکہ تو ابھی تک عالم سر دشستان کا ایک نورانی پیکر تھا۔ تیرا روحانی ہیکل بسم اللہ کے گنبد میں دستبرد سے محفوظ تھا۔ تجھے ماں کی وفات اسوقت محسوس ہوئی۔ جبکہ شام کے وقت گرسنگی کے ہزادنے تجھ سے اپنا روزینہ طلب کیا۔ اسوقت تجھے ماں یاد آئی اور شاید تو تلملاکر رونے ہی لگا تھا کہ باپ کا مہربان ہاتھ تیرے سر کو چھوتا ہوا دکھائی دیا اور اس نے تجھے آغوش میں کھینچ لیا۔ دیکھ تیرا باپ کیسا فیاض تھا کہ اس کی بے انتہا اور پے درپے آنیوالی مہربانیوں نے ماں کی یاد کے غم کو تیرے ننھے سے دل میں پھٹکنے نہ دیا۔ اس نے تجھے کبھی ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تیرے نازنین جسم سے پھول کی چھڑی تک نہیں چھوائی۔ آہ اب تو ماں کو بالکل بھول گیا تھا۔ اس کی یاد تجھے کبھی پریشان نہیں کرتی تھی وہ تجھے بھولے سے بھی یاد نہیں آتی تھی۔ دیکھ اے بارِ گناہ سے خم کمر ہونے والے بوڑھے یہ تیرا وہ گناہ ہے جس کی تلافی کا خیال ابھی تک ستر سال کے بعد بھی تجھے محسوس نہیں ہوا۔ تیری حسرت نصیب ماں کی روح اب تک اس امید میں ہر رات تیرے سرہانے آکر کھڑی ہوتی ہے کہ کبھی تو خواب میں بھی اپنی گم گشتہ بدنصیب ماں کا خیال کرے جس سے اسکو آسمانی مسرت حاصل ہو۔ مگر نہیں وہ ہر صبح تیرے پاس سے مایوس جاتی ہوئی نظر آتی رہی ہے۔

اے مجسم عبرت بوڑھے۔ پھر تو مکتب میں بستہ لئے جاتا دکھائی دیا۔ معلم تجھے سبق پڑھا کے ہدایت کردیا کرتا تھا کہ یاد کرے مگر تو سبق یاد کرنے کے بجائے جوراستا دسے جو ہر روز سبق بدسبق افضل ہو تنگ آآکر اس کی موت کی دعائیں خدا کی جناب میں مانگا کرتا تھا۔

حضرت حق میں اٹھا کر ہاتھ ہر صبح و مسا ‍ چپکے چپکے مانگتا مرگِ معلم کی دعا

اگرچہ تیری یہ دعا قیامت تک قبول نہیں ہوئی کیونکہ جب ایک معلم مرگیا تو دوسرا جو بیرحمی کے فن میں پہلے سے زیادہ مشاق ہوتا تھا تیری دعاؤں کو بے اثر ثابت کرنے کے واسطے ایک سبز عصا ہاتھ میں لئے مکتب میں تیرا منتظر ہوتا تھا۔ اس طرح تو نے اگرچہ کئی بدخو استادوں کے خون اپنی معصوم دعاؤں کی گردن پر لئے۔ لیکن جب باپ نے تیری ان بیباکیوں کی جو بزرگ استاد کے حق میں کی جاتی تھیں۔ کوئی داروگیر کی اور تجھے اپنی رہائی دشوار نظر آئی تو تو نے مکتب سے بھاگنا شروع کر دیا اور اب کئی کئی روز تک گھر میں اور مکتب میں تیری صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ماں کی فریفتہ روح خدا جانے کن کن سنسان جنگلوں میں تیری خاطر بھٹکتی پھرتی تھی۔ مگر تجھے کچھ خیال نہیں تھا۔ ضعیف باپ کے تھک جانے والے پاؤں سینکڑوں گز زمین چار پہر میں الٹ ڈالا کرتے تھے لیکن تیرا پتہ نہیں لگتا تھا۔ تجھے بھوکا مرنا قبول سنسان جنگل قبول اور اس کی دہشتناک کالی کالی راتیں قبول۔ لیکن باپ کا پیار اور استاد کی مار منظور نہیں تھی۔ تو بارہا دیکھا گیا ہے کہ کبھی گھنے جنگلوں میں گھس گیا ہے۔ اور کبھی پہاڑوں کی غاروں میں جا چھپا ہے۔ اگرچہ تو دلسوز باپ کو ہر وقت ناخوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ (بہشت نصیب جس کی موت پر اسوقت برسوں کے متعدد عشرے گذر چکے ہیں) تیری صورت دیکھتے ہی تیری لغزشوں سے درگذر کر دیا تھا اور تیری خطاکاری کے باوجود تجھے یہی کہنے لگتا کہ تو ابھی بہشتی گلاب کی کلی ہے۔ تو باغِ حیات کا نورسیدہ شگوفہ ہے جسکو معصیت کی گرد نے ناپاک نہیں کیا تو خدا کی رحمت ہے جو گناہ کے دھبہ سے بالکل پاک ہے اور تو پاک فرشتہ ہے۔ اور تیرے کان برائیوں کی آلودگی سے ناآشنا ہیں۔

اے خدا کے گنہگار بندے! تو اس شام کو یاد کر جبکہ مہربان باپ کی دردناک آواز

تجھے یوں کہتی ہوئی سنائی دی۔ اے ماں کے لخت جگر۔ اے باپ کے نورِ بصر اے دائے مرنے والی کے آخری یادگار۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے۔ کہ تیرا دل اسی طرح ہمیشہ غموں سے دور اور خوشیوں سے معمور رہیگا۔ کیا تیرا باپ سدا کے لئے تیری پرورش کا کفیل بنکر زندہ رہیگا۔ کیا موت کا زبردست ہاتھ بہت جلد اُس کے سایہ کو تیرے سر سے نہیں اٹھالیگا۔ اے نادان اور بھولے لڑکے تو اُسوقت کو بہت قریب آیا جان جو تیرے خیر طلب باپ کو مرنے والی ماں کی طرح ہمیشہ کے واسطے تجھ سے جدا کر دیگا۔ اے مردہ ماں کی غمناک نشانی اور زندہ باپ سے عنقریب بچھڑ جانے والے بچے۔ وہ سال بڑی تیزی سے آرہا ہے جس کی فصل خزاں میں تو بے باپ کا کہلاویگا اور جس کے آفتاب کی روشنی میں تو یتیم بنا دیا جائیگا۔ اے میرے قابلِ رحم بیٹے۔ تو دنیا کے میدان میں اکیلا رہجائیگا۔ تیرے ہمدرد اور غمخوار دنیا سے اُٹھ چکے ہونگے اور تو تنہا زمانہ میں اپنی حالت پر آنسو بہانے کے لئے چھوڑ دیا جائیگا۔ کوئی رحم کا ہاتھ تیرے رخسار کی بہتی بڑھانے والے اشکوں کو پاک کرنے کے لئے موجود نہیں ہوگا۔ اور کوئی ہمدرد آواز تسلی آمیز جملے تیرے حق میں استعمال کرتے ہوئے نہیں سنائی دیگی۔ ہاں تو دنیا میں تنہا ہوگا اور تیرے پیار کرنے والے مرچکے ہونگے۔ تیری حالت پر آنسو بہانے والے خاک میں دفن ہونگے۔ اے دنیا کے چھوٹے مسافر۔ کوشش کر کہ تو اس وقت کسی کا محتاج نہ ہو۔ اے خام عقل طفل ہمت کر کہ تن تنہا اسوقت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنیکے قابل ہوجاوے۔ اے بے سمجھ لڑکے۔ ذرا غیرت کو کام میں لا کہ تو اپنے محبت کرنے والے اسلاف کی شرمناک یادگار نہ بنے۔

اے جھرجھری آواز والے بوڑھے۔ یہ نصیحت تھی جو تیرے باپ نے اپنی موت کے سال سے کئی برس پیشتر کی تھی۔ لیکن تجھ جیسے سنگدل پر ان جگر خراش الفاظ نے کوئی اثر نہیں کیا۔ تونے ان سچی باتوں کو باپ کے بڑھاپے کا خبط خیال کیا اور آج کی

صداقت پر اصلا اعتنا نہیں کی۔ اوہ یہ کیسا ناقابلِ معافی اور سخت گناہ تھا کہ قابلِ پرستش باپ کی نافرمانی میں تو ہمیشہ ثابت قدم نظر آیا۔ اوہ تو کیسا بدنصیب تھا کہ باپ تجھ سے کبھی راضی نہیں ہوا۔ اوہ تو کیسا دیوانہ تھا کہ اس کا بوڑھا دل دکھانے میں ہمیشہ مستقل رہا۔

اسوقت تو اپنی عمر کا دوسرا عشرہ طے کر رہا تھا اور تیری سالگرہ کا چودھواں سال تھا کہ تیرے باپ کی پیشینگوئی پورا ہونے کا وقت آگیا۔ یہ وہ ناگزیر وقت تھا کہ فانی انسان کی زندگی کا سب سے زیادہ تلخ اور ناخوش گوار حصہ ہے۔ یہ وہی وقت تھا جس سے تیرا باپ تجھے بارہا خبردار کر چکا تھا۔ آخر اُس کی موت کے دن کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور پلک مارنے میں اتنا بلند ہو گیا کہ اُس کی روشنی کے ذرّے چھت کے روزنوں میں سے چھن چھن کر چھت کے سایہ میں سونے والے بوڑھے باپ کے مُردنی چھائے ہوئے چہرہ پر گر رہے تھے۔ اور اس کے تغیر و تبدل کو صاف دکھا رہے تھی تو اس روشنی میں اس ناگزیر اور ضرور ہونے والے سانحہ کو دیکھ لیتا۔ تو اپنی روحانی آنکھوں سے موت کے فرشتہ کو دروازہ میں گھستا ہوا دیکھ سکتا تھا اور تو اس کے یکایک آجانے کی سرسراہٹ کو تاڑ جاتا۔ اور تیرے باپ کے اعضا کا تشنج اور چہرہ کی سفیدی اسکی گواہی دیتی مگر تو اس عالم میں نہیں تھا۔ ایسی دُور تو پہنچا ہوا تھا جہاں تجھے خود اپنی خبر نہیں تھی۔

آخر وہ دن ختم ہوا۔ رات آئی اور اُسکا بھی زیادہ حصہ گذر گیا۔ اب پانچ بج چکے تھے۔ اس سنسان اور خاموش کمرہ میں جہاں تیرا باپ دم توڑ رہا تھا۔ ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور تیرے باپ کے ناگزیر وقت میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کہ اس کی بوڑھی زبان پر زور سے تیرا نام آیا۔ اور تو فوراً ہی گھبرا کر اس کے پاس گیا۔ اور اس کو ایسی حالت میں دیکھا جو تیری نگاہوں میں بالکل اجنبی تھی اور جیسے دنیا والے نزع کے نام سے پکارتے

ہیں۔ اس وقت اس کی نبض بہت سست چل رہی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے جسم میں خون نہیں رہا تھا۔ اس کے اعضا میں برف کی سی خنکی سرایت کرتی چلی گئی۔ آخر اس نے اپنے اکھڑی سانس کو سنبھال کر اور سینہ پر ہاتھ مار کر کہا "اے میرے بچے۔ میں وہاں جاتا ہوں۔ جہاں سے کوئی نہیں پھرا۔ مجھے وہ سفر درپیش ہے جہاں سے واپس آنا معلوم"۔

"اے لڑکے۔ مجھے معلوم نہیں کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ دنیا تجھ سے کس طرح سلوک کریگی۔ اور مجھے خبر نہیں۔ کہ زمانہ تیرے موافق رہیگا یا مخالف اے بدنصیب فرزند۔ میں نے ہر چند چاہا کہ تو کسی لائق ہو جائے۔ اور وہ زندگی بسر نکرے۔ جس پر غیرت موت کو ترجیح دے۔ مگر میری زندگی میں یہ اُمید بر نہ آئی۔ جو شدنی تھا وُہی ہوا۔ اور وُہی ہوگا۔ اے بیٹے۔ اب تیرا باپ مرتا ہے اور تجھے ہمیشہ کے لئے الوداع کہتا ہے۔ اب تو قیامت تک اس کی صورت نہیں دیکھ سکیگا۔ مگر اس دم توڑنے والے باپ کی تجھ سے التجا ہے۔ کہ تو دُنیا میں خواہ کیسی متبذل اور ذلیل حالت میں کیوں نہ رہے۔ مگر نیکی اور ایمان کو ہاتھ سے نہ دینا۔ ہاں ذرا اُن مرنے والوں اور پیار کرنے والوں کی شرم رکھ لینا۔ جن کو آسمانی تقدیر نے زبردستی تجھ سے جدا کر دیا ہے۔ اے ناشاد باپ کے نامراد بیٹے آہ تو تنہا ہے اور تجھے دُنیا میں تنہا زندگی بسر کرنا ہوگی۔ مگر تو اس تنہائی سے اپنے دل کو ملامت کرنا تیری ماں کی غمگین رُوح تیرے لئے بےچین ہوگی۔ تیرے باپ کی سوگوار رُوح تیری مصیبت میں شریک ہوگی۔ تیرا دُنیا میں کوئی مددگار نہیں۔ اس رنج سے کبھی تو غمگین مت ہونا۔ ہم مرنے والوں کی دم نزع کی دُعائیں زندگی میں تیری مددگار ہونگی۔ اور میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ تو دُنیا میں ہمیشہ خوش حال رہے اور نیک راستہ پر چلے۔ اے خدا تو جو آسمان پر ہے۔ میں اس انجان اور بھولی روح کو

تیرے رب کے سپرد کرتا ہوں تو اس کا سب سے زبردست نگہبان ہے اور بیشک تجھ کو اپنے پیدا کرنے کی لاج ہے۔

اس جملہ کے ختم کرتے کرتے تیرے باپ نے چند ہچکیاں لیں اور اس کی آواز پھر تجھے نہیں سنائی دی۔ اس عرصہ میں قابض ارواح نہایت سنجیدگی سے اپنا کام کرتا رہا۔ اتنے میں گھر کے گھنٹہ نے نو بجا دیئے اور چراغ جھلملا جھلملا کر خاموش ہوگیا اور ادھر تیرے باپ کا ستارہ حیات اندھیرے کے گہرے دلدل میں غائب ہوگیا تو یہ تمام تماشا خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر پیکر تصویر بنگیا۔ گویا تو ایک سنگ مرمر تھا جسکو سنگتراش نے انسانی جامہ میں کھڑا کر دیا تھا۔ اسوقت تجھ میں اور اس بوڑھی لاش میں جو تیرے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ کوئی فرق نہیں تھا کچھ دیر کے بعد تو ہوش میں آیا۔ تیرے حواس نے اس واقعہ کو معلوم کیا اور تیری عمر میں یہ سب سے پہلا موقعہ تھا کہ تو بے انتہا مضطرب اور غمگین ہوا۔ تونے زور سے ایک چیخ ماری اور باپ کی لاش سے لپٹ گیا۔ وہ سنسان مکان جسکی چار دیواری میں تیرے باپ نے جان دی تھی۔ اب تیری متواتر چیخوں سے گونج رہا تھا۔ تیری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور تو اس بیجان لاش سے کہ رہا تھا۔ اے باپ اے پیارے باپ۔ اے مہربان باپ۔ تو مجھ سے کیوں خفا ہوگیا۔ اے باپ تو مجھے چھوڑکر چلا گیا۔ اے باپ۔ ہاں ایک دفعہ وہ مبارک آواز میرے سوگوار کانوں کو پھر سنادے۔ اے باپ ایک بار شفقت کا ہاتھ میرے سر پہ اور پھیر۔

تونے اپنے باپ کا ماتم کیا اور پھر اسے اندھیری قبر میں چھوڑ آیا۔ جسپر پتھر کی وزنی سلیں لگادی گئیں۔ اور منوں مٹی ڈالدی گئی۔ تونے اس کے ماتم کے لباس کو بہت ہی کم دن اپنے بدن پر رکھا۔ اور اس کو بھول جانے کے لئے عیش وعشرت میں مشغول ہوگیا۔ وہ تنکا جو شہتیر بنکر تیری آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ اب نکل چکا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں تو نے بال و پر نکالے۔ اور اس راستہ چلنے لگا۔ جہاں گناہ کے

بیشمار بھوت دلچسپی کا لباس پہنے کھڑے تھے۔ تو اُنکی ظاہری آراستگی پر فریفتہ ہوگیا۔ حُسن ایک حسین پری کی صورت میں تیرے سامنے نمودار ہوا اور تو نے آنکھیں بند کرکے اُسے اپنا دل دیدیا۔ افسوس تو اس دام میں پھنس گیا جس سے اب تک حالانکہ چراغِ سحری ہو رہا ہے۔ تجھے رہائی نصیب نہیں ہوئی۔ عشق کے شیطان نے تجھ سے آنکھیں لڑائیں اور تو نے اپنی زندگی اُس کے ہاتھ بیچ دی۔ جہاں کوئی حسین صورت دیکھی۔ تیرے منہ میں پانی بھر آیا۔ جہاں کوئی اچھی شکل نظر آئی۔ تو مچل گیا۔ تیرا دلسوز باپ جواب جنت میں رہتا ہے۔ تیرے لئے اتنا اندوختہ چھوڑ مرا تھا کہ تلاشِ معاش کی فکر نے ایک منٹ بھی تیرے عیش طلب دل میں خلجان پیدا نہیں کیا۔ افسوس تو اُسکی اُس وصیت کو جو نزع کے وقت کی تھی بھول چکا تھا۔ اگر دنیا میں کوئی غم تجھے ستا سکتا تھا تو وہ غمِ معشوق تھا۔ اگر تیرا کوئی دشمن تھا تو وہ رقیبِ روسیہ تھا اور اگر کوئی ستم تجھ پر بلائیں توڑتا تھا تو وہ فراقِ یار تھا۔ زمانِ فراق میں تجھے اکثر موت آجایا کرتی تھی۔ لیکن پھر جی اُٹھتا تھا۔ اودھر فراقِ یار (خدا نکرے اب نصیب ہو) برسات کی گھٹاؤں کی طرح تیرے سر پر چھا گیا اور ادھر تو نے قبر کا کونا بسایا۔ یہ شمار کرنا مشکل ہے کہ تو کے دفعہ مرا اور کے دفعہ زندہ ہوا۔ مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہزاروں مرتبہ ملکِ عدم کی سیر کی۔ سینکڑوں بار صحرائے فنا کو چھان مارا۔ گویا موت ایک جامہ تھا۔ جسکو جب چاہا اُتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا اور جب جی چاہا پہن لیا۔ یا وہ ایک فانوس تھا کہ جب ضرورت ہوئی روشن کرلیا اور جب دل میں آیا گل کر دیا۔

اے ناموس برباد کنِ اسلاف! تو نے اس ہوس بازی میں وہ کمال پیدا کیا کہ قیس و فرہاد کا فسانہ تیرے نزدیک بچوں کا کھیل تھا۔ آبادی چھوڑی۔ ویرانہ پسند کیا اور سر پر مشتِ غبار ڈال کر گریبان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ کبھی اس جنگل کی خاک چھانی اور کبھی اُس بیابان میں اپنی آبلہ پائی کو خارِ مغیلاں سے روشناس کیا۔ آج اس صحرا کے

گُلِ خودرو کی بہاریں لوٹیں اور کل اس مرغزار میں غزالانِ ناکردہ رام سے رشتۂ مؤدت قائم کیا۔ کبھی جنگلوں میں تنکے چُنتے نظر آتا تھا اور کبھی کسی گلزار میں ایک سوکھی شاخ پہ آشیانہ بنا رہا تھا۔ کبھی تو دامِ صیاد میں پھڑک رہا تھا اور کبھی کُنجِ قفس میں اپنے ہمصفیروں کو یاد کر کے اُنکی آزادی پر رشک کر رہا تھا۔ کبھی فصلِ خزاں میں بہار کے موسم کی یاد میں دیوارِ چمن پر نوحہ خوانی کرتا نظر آتا تھا۔ میں حیران کہ تو کون تھا اور تیرے خیالات کیا تھے۔ تجھے خدا نے جامۂ انسانیت عطا کر کے اشرف المخلوقات کا قابلِ فخر خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ لیکن تو ایک مشت پرند کی زندگی پسند کرتا تھا۔ فراق کی تاریک راتیں جب بڑی نیند کی خوگرفتہ آنکھوں کو خواب سے باز رکھتی تھیں تو تو اسکا بدلہ اپنے ہمسایوں سے لیا کرتا تھا اور نالۂ نیم شبی سے محلہ بھر سر پر اُٹھا لیا کرتا تھا۔ آسمان تیرے نزدیک ایک نیلوفری سائبان تھا جو آہِ سحری کے گولہ بارود کے آگے ایک لحظہ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ کبھی تو دُعا سے لڑتا تھا اور کبھی اثر سے جھگڑتا تھا۔ دُنیا تجھ سے تنگ تھی اور تو دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اور دلِ یار کے گیسوئے پُرشکن میں اسیر تھا اور وہ بادِ صبا کے ظلم سے مجموعۂ پریشانی بنا ہوا تھا۔ مگر اس مظلوم گرہ کی دادرسی نوشیرواں جیسے عادل نے بھی نہیں کی۔ تیرا دل بھی خدا جانے کیا عجوبہ تھا کہ کبھی وہ شیشہ بنجاتا تھا اور کبھی آئینہ۔ کبھی وہ قطرۂ خون کی صورت میں جلوہ گر ہوتا تھا اور کبھی اسیرِ فرنگ بنکر زلفِ بُتاں کا سلسلہ جُنبان تھا۔ کبھی خیالِ یار کا جولانگاہ تھا اور کبھی وہ ایسی شے بنجایا کرتا تھا کہ تو اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یار لوگوں کی نذر کیا کرتا تھا۔ تو وہ بیمار تھا جسکے علاج سے طبیبوں نے ہاتھ اُٹھا لیا تھا۔ عیسیٰ آسمان سے اُتر آئے مگر انہیں بھی تیری شفا کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ الغرض تو نے یہ تمام مراتب طے کئے اور جب ان منزلوں سے گذر گیا تو پاک شہیدوں کے ٹولے میں داخل ہو گیا۔

پھر وہ کونسے ناکردنی کام تھے جو تو نے نہیں کئے۔ محلہ والوں کے لئے تو ایک مہیب

دیو تھا کہ صورت دیکھتے ہی دم فنا ہو جاتا تھا۔ ایک خبیث روح تیرے جسم میں حلول کر آئی تھی جس کا زہریلا اثر تمام بدن کی رگوں میں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ دوڑ گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

(محمود خاں شیرانی۔ ٹونکی)

دھوپ اور چاندنی

روزِ روشن میں مجھے کل ماہتاب آیا نظر — دھوپ کی تیزی تھی اور ڈھلنے لگی تھی دوپہر
یوں فلک پر ماند اور پھیکا نظر آتا تھا چاند — طفلِ مکتب کا پتنگ اُڑتا ہو جیسے اوج پر
روزِ روشن میں پڑھی کل میں نے اک شاعر کی نظم — اُس کو نثری سے بھی پایا میں نے بڑھ کر منتشر
لیکن آخر جذبۂ دل کے تلاطم کی طرح — چشمۂ خورشید کی موجیں گئیں یکسر گذر
اور شب نے آ کے شہر و وادی و کہسار کو — چھا لیا اپنی خموشی اور حیا سے سر بسر
چاند نکلا اوڑھ کر اس وقت چادر ناز کی — حورِ عیں آ کر ہوئی جنت سے گویا جلوہ گر
وادیٔ شب پر بہایا اُس نے دریا نور کا — نقرئی ابر اُس نے برسایا زمیں پر یا مگر
اب جو پھر اس چاندنی میں نظم وہ میں نے پڑھی — وجد طاری ہو گیا مجھ پر ہوا ایسا اثر

منکشف مجھ پر کیے بن کر مفسّر اس نے
وہ دقائق اور معارف تھے جو اس میں مستتر

ظفر علیخاں

جلسۂ احباب

تیسرے پہر کا آغاز تھا فرصت کا وقت پاکر میں اکیلا کمرے میں بیٹھا ادھر اُدھر خیال دوڑا رہا تھا کہ دفعتہ دروازے پر دستک ہوئی اور ایک صاحب کواڑ کھول کر یہ کہتے در آئے :-

ناظم (انکا نام ہے):- السلام علیکم - حضرت معاف کیجئیگا - جہانتک مجھے معلوم ہے آپ کا خالی وقت عموماً یہی ہوتا ہے -

مَیں (اُٹھ کر) علیکم السلام - آپ کی خیر خواہی کا ممنون ہُوں - میرا یہ وقت جیسا آپ نے فرمایا واقعی خالی ہی - جناب تشریف لائیے - سر آنکھوں پہ آئیے - (سامنے کی کُرسی کی طرف اشارہ کرکے) آرام فرمائیے -

وُہ صاحب بیٹھ گئے - مزاج پُرسی کے بعد ادھر اُدھر کی چند باتیں ہُوئی تھیں کہ میں نے کہا حضرت کچھ نقلیں بیان فرمائیے - جی بہلیگا اور فائدہ بھی ہوگا -

ناظم - بہت خوب - (ذرا سوچ کر اور عاشقوں کی بیتابانہ ہیئت بنا کر ایک طرف کو خطاب کرکے آسا کی دُھن میں) -

اپنی بلا سے ہو کہ کوئی خوب رُو نہ ہو سب کچھ مجھے بُرا ہے اگر پاس تو نہ ہو

مَیں :- سُبحان اللہ خوب ادا کیا آپ نے -

ناظم :- اور لیجئے (فلسفیوں کی سنجیدہ صُورت بنا کر مجھ سے خطاب کرکے کانہڑے کی دھن میں) :-

مانا کہ جی میں اپنے بڑی آرزوئیں ہُوں وُہ خاک جی ہی جس میں کوئی آرزو نہ ہو

مَیں :- واہ خوب فرمایا - پُورا نقشہ کھینچدیا -

ناظم:۔ اور لیجئے (بیوقوف شرابیوں کی حالت بنا کر مجھ سے خطاب کرکے اور ایک طرف اشارہ کرکے دھناسری کی دھن میں) ؎

فصلِ بہار و ماہِ تمام و بتِ نگار ساماں سب عیش کے ہوں یہ جام و سبو نہ ہو

میں:۔ واہ وا خوب ہی فرمایا۔ کمال کرتے ہیں آپ۔

ناظم:۔ اور لیجئے (فلسفیوں کی سنجیدہ صورت بنا کر مجھ سے خطاب کرکے مالکوس کی دھن میں) ؎

صورت جبھی بھلی ہے کہ سیرت بھی ساتھ ہو باطن کسی کا گر ہو بُرا خوب رُو نہ ہو

میں:۔ کیا خوب غضب کر دیا۔

ناظم:۔ اور لیجئے (عیش پسندوں کی صورت بنا کر اُوپر کی طرف دیکھ کر جیجے ونتی کی دھن میں) ؎

یہ چاندنی ہو اور وُہ آئینہ رُو نہ ہو پھولوں کی یہ مہک ہو یہ وُہ بھینی بُو نہ ہو

میں:۔ جزاک اللہ کیا فن ہے۔

ناظم:۔ اور لیجئے (عاشقوں کی صورت بنا کر ایک طرف کو خطاب کرکے دیس کی دھن میں) ؎

یہ حسن قہر منظر و مخبر بھلا ہی اچھا نہیں ہے فیض کی گر تجھ میں خو نہ ہو

میں:۔ ستم کر دیا ظالم۔

ناظم:۔ اور لیجئے (مسخروں کی ہیئت بنا کر ایک طرف کو اشارہ کرکے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے تحت اللفظ)۔

ان کی معرفی میں مجھے عذر کچھ نہیں اتنا تو دیکھ لو کہ کوئی جانگلو نہ ہو

میں:۔ بھئی واہ لوٹا دیا۔

ناظم:۔ اور لیجئے (شُہدوں کی ہیئت بنا کر مجھ سے خطاب کرکے زلہ کی چلتی لے میں

کچھ آبرو سے دل نہیں جاتا جہان میں　　پابوش سے ہماری نہیں آبرو نہ ہو

مَیں:- خوب!

ناظم:- اور سنیئے (سنجیدہ معقول صورت بنا کر مجھ سے خطاب کر کے تحت اللفظ) ۔ ۵

معقول خوردہ گیری سے مقصود ہے صلاح　　کیا لطف اعتراض اگر مُو بمُو نہ ہو

مَیں:- واہ صاحب واہ ۔

ناظم: (عیش پسندوں کی صورت بنا کر تعجب سے تحت اللفظ) ۔ ۶

صحبت ہو ایسی خوش تو کوئی شعلہ رو نہ ہو　　اور شعلہ رو بھی ہو تو کوئی خوش گلو نہ ہو

مَیں:- ارے ظالم!

ناظم:- اور سنیئے (عاشقوں کی ناصحانہ ہیئت بنا کر ایک طرف کو ملتفت ہو کر تحت اللفظ) ۷

الجھن اگر بڑی ہے نمائش کو کم کرو　　حُسن اور اُس کا شہرہ بھلا چار سو نہ ہو

مَیں:- آہا ۔ کیا معقول ۔ جادو کرتے ہو ۔

ناظم:- اور سنیئے (دیوانوں کی عالت بنا کر کے ٹوڑی کی دھن میں) ۔ ۸

دیوانگی میں نام و نشان کیا ضرور ہے　　عاشق ہی ہیچ نہیں ہے اگر آبرو نہ ہو

مَیں:- بہت خوب ۔

ناظم:- ایک اور اور بس (عاشقوں کی صورت بنا کر طنز سے ایک طرف اشارہ کر کے تحت اللفظ) ۹

او صاحب آئے وعدہ وفا کرنے والے آئیے　　ہو شرم پاس بھی تو کبھی رُو برُو نہ ہو

مَیں:- واہ وا سبحان اللہ ۔ کمال کرتے ہیں ۔

ناظم:- اچھا جناب اب اجازت چاہتا ہوں ۔ دیر ہوگئی ۔

مَیں:- آپ نے ممنون کیا ۔ جی تو نہیں چاہتا لیکن خیر ۔

ناظم:- (چلتے ہوئے) خدا حافظ ۔

مَیں:- فی امان اللہ ۔

(نذیر حسین احمد)

شاہ محمد عبد العلیم آسی

ہمارے کرم فرما مولوی محمد عبد الصمد صاحب آنریری مجسٹریٹ وزب غازی پور حضرت مولانا آسی کے کلام کے نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی غزلیں ہمیں بھیجتے ہیں اور چند سطور میں مولانا موصوف کی یوں تعریف کرتے ہیں۔

جناب من ایسے زمانہ قحط الرجال میں آپ سے ایک ایسے بزرگ اور استاد کامل الفن سے متعارف کراتا ہوں جنکی ذات بابرکات اس زمانہ میں مغتنمات سے معلوم ہوتی ہے۔ اور جنکی بہت زیادہ عظمت اب کی مرتبہ دہلی کی حالت دیکھ کر معلوم ہوئی۔ نام نامی انکا حضرت مولانا مولوی شاہ محمد عبد العلیم صاحب ہے۔ اور شعروں میں تخلص آسی فرماتے ہیں۔ مولد انکا قصبہ سکندر پور ضلع بلیا ہے جو ایک مشہور اور تاریخی مقام مردم خیز ہے۔ اور قیام انکا ہمارے شہر غازی پور میں رہتا ہے۔

آپ کے صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کا محصور کرنا ہمارے امکان سے باہر اور ہماری تحریر کے احاطہ سے خارج ہے۔ آپ ایک مستند عالم باعمل متبع شریعت محمدی ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ ایک صوفی صافی طینت محی طریقت محمدی ہیں۔ ہزار ہا طالبین نے آپ سے اکتساب کمال کیا ہے اور فیضیاب ہوئے ہیں۔ آپ ان سب کمالات کے ساتھ فن ادب میں بھی پورا کمال رکھتے ہیں۔ آپ عربی اور فارسی زبان پر بھی ویسی ہی قدرت رکھتے ہیں جو آپ کو اردو اپنی مادری زبان پر حاصل ہے۔ اسوقت سن شریف انکا قریب ستر برس کے ہوگا۔ سبحان اللہ صورت شکل کیسی متبرک و مقدس کہ صحابہ کرام کی یاد دلانے والی۔ اور اخلاق کیسے پاکیزہ کہ سچے اسلام کا یقین دلانیوالے۔ انسان اگر تھوڑی دیر بھی انکی صحبت میں بیٹھے تو دل میں گداز اور قلب میں ایک خاص سرور پیدا ہوجاتے۔ اعلیٰ درجہ کے مستغنی المزاج۔ پورے طور کے پابند اوقات۔ الغرض ہر طرح پر خیر مجسم اور اکابرین سلف کی یادگار ہیں۔ آپ کو زمانہ تحصیل علوم سے ایک قسم کا ذوق شعر و سخن سے بھی رہا اور آپ کو تلمذ اس فن میں خاندان جناب شیخ امام بخش صاحب ناسخ لکھنوی سے ہے۔ آپ نے بھی ان قیود کو جو بہ نسبت ترکیب الفاظ کے جناب میر علی اوسط صاحب رشک ارشد تلامذہ ناسخ مرحوم نے لازم رکھا تھا پسند فرمایا۔ ایک زمانہ میں ہمارے حضرت مولانا کے کلام کا رنگ

رنگ عاشقانہ اور تخیل پسندی لئے ہوئے تھا۔ لیکن جب سے آپ کی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی اور عشقِ حقیقی نے اپنا جلوہ دکھایا۔ پہلا رنگ باقی نہ رہا۔ آپ کے کلام میں وہ مذاق پیدا ہوگیا جسکا لفظوں میں بیان کرنا محال ہے۔ آپ کی فصاحت اور آپ کی بلاغت اور آپ کا قادر الکلام ہونا بڑے بڑے فصیح و بلیغ اہلِ زبان نے مان لیا ہے۔ آپ ہر صنفِ کلام پر پورے قادر ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نہ تو آپ اپنے کلام کو مجتمع کرتے ہیں نہ چھپنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مجھے اس وقت چند غزلوں کے اشعار جو یاد ہیں پیشکش کرتا ہوں :-

بڑھ کے شہ رگ سے گلے ملنے کو وہ آمادہ تھا ہائے رے وہمِ غلط ابتک میں دور افتادہ تھا
توڑنا مینائے مے کا دل شکن کیونکر نہ ہو محتسب کو کیا ہوا تھا میں تو مستِ بادہ تھا
دل کہاں تھا جذبِ دل پر میں جو کرتا اعتماد میں تو اک دل سوختہ دل باختہ دلدادہ تھا
زاہد و واعظ جو آتے سب تکلف برطرف خوب فرشِ بوریائے نقشِ موجِ بادہ تھا
حالِ دل کیا اس سے کہتا دل ہی میں جسکا ہو گھر گو نہ سودائی ہو عاشق پھر بھی کتنا سادہ تھا

عرش ہے دل میں نہ مسجد ہے نہ کعبا دل میں سب سہی یار مگر گھر ہے تمہارا دل میں
كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شان کی نیرنگی ہے دیکھ تو کیا نظر آتا ہے تماشا دل میں
ہر جگہ خالِ رخِ یار نے بدلا اک بھیس تل بنا آنکھوں میں عاشق کی سویدا دل میں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں کھوئے ہوئے دل کو اپنے ہم نے جس دن سے سنا گھر ہے تمہارا دل میں
کارِ امروز بفردا مگذار اے آسی آج ہی چاہئے اندیشۂ فردا دل میں

اہلِ ہمت کا کبھی بیجا نہ دیکھا اضطراب عینِ ہستی ہے برائے موجِ دریا اضطراب
کیا ہمیں چلنا نہیں ہے جانبِ ملکِ عدم دم تو لے لے اے شرارِ جستہ اتنا اضطراب
مثلِ سیماب آگیا آخر بہ کشتن قرار آرزوئے قتل ہی میں تھا وہ سارا اضطراب
بعدِ مردن ہو تو ہو اے پند گوئے تجرید عشق بازوں کو سکوں اچھا کہ اچھا اضطراب

کیا اُمیدِ زندگی اب آسیٔ بیتاب کی — جانگسل آزارِ اُلفت رُوح فرسا اضطراب

کیا تجھ سے طلب کرے یہ جانسوز — بس ایک نگاہِ دو جہاں سوز
کس دشت میں عشق نے تھکایا — ہر ریگِ رواں ہے کارواں سوز
شعلہ بھی ہے کیا شبیہہ مجھ سے — ظاہر - باطن - نہاں - عیاں سوز
وہ اور تبِ فراق پوچھیں — جانا کہ یہ ذکر ہے زباں سوز
بلبل ہے کہ آسمانِ اندوہ — نالہ ہے کہ برقِ آشیاں سوز
ہم اور خموش اے قیامت — گرمی جلوہ کی ہے فغاں سوز
ہر داغِ جگر ہے غیرتِ گل — ہر آتشِ گل ہے گلستاں سوز
وہ جانِ نزار آسیٔ زار — وہ تابِ گدازِ غم - تواں سوز

جب دلِ عاشق کو یارائے شکیبائی نہ تھا — حشر کا وعدہ کبھی طورِ دلارائی نہ تھا
حدِ حیرت دیکھتا تھا اپنی آرائش کے ساتھ — آئینہ خانہ میں وہ محوِ خود آرائی نہ تھا
اب وہی دیکھیں دلِ شیدا میں کیسی گل کہ ہر — مبتلا کرنا مرا شایانِ یکتائی نہ تھا
جو نہ بوجھ اُٹھا کسی سے وہ اُٹھایا کس طرح — ضعفِ خلقی میں اگر جوشِ توانائی نہ تھا
رو کے آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئیگی — کس طرح کہیے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

یار سے کہیے کہ فرقت ہے تو فرقت بھی نہیں — اور نسبت میں ہے تمیز تو وصلت بھی نہیں
جو دیا تو نے وہ سب تیرے لئے کھو بیٹھے — ہاں اگر شکر نہیں ہے تو شکایت بھی نہیں
بے نیازی بھی اُٹھا لوں میں ترے ناز کی طرح — کیا وہ طاقت نہ رہی مجھ میں تو ہمت بھی نہیں
زُہد و تقویٰ و صلاح و ورع و حسنِ عمل — کچھ نہیں مجھ میں مگر کیا تیری رحمت بھی نہیں

کبھی آسی سے ہم آغوش نہ دیکھا تجھکو
اثر جذبِ دلِ اہلِ محبت بھی نہیں

بُتِ پندار جب اس دل سے جُدا ہوتا ہے
یہی دل رُتبہ میں کعبہ سے سوا ہوتا ہے

غیر سے قطع نظر چاہیے عاشق کے لئے
حاصل خلوت و بزم ایک مزا ہوتا ہے

دشمنِ جاں ہے اگر ہجر تو وصلت کیا ہے
قطرہ دریا میں جو ملتا ہے فنا ہوتا ہے

انہیں کانوں سے انا الحق کے سُنے ہیں غوغے
آدمی عشق میں کیا جانئے کیا ہوتا ہے

غیر کو غیر جو کہیے تو غلط ٹھہرا دے
اور جو کہئے وہی ہے تو خفا ہوتا ہے

بیحجابی تھی پسند انکو ابھی کل کی ہے بات
آج پردہ میں ہیں پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ہمتِ شیخ کی صیقل کی بدولت آسی
یہی دل آئینۂ رُوئے خدا ہوتا ہے

لاکھ گلے لگائیں وہ رنگ نہیں قرار کا
موجۂ بوئے گل ہوں میں اُنکے گلے کے ہار کا

جوشِ بہار و سوزِ عشق اصل میں ایک ہی شئی ہے
رنگ ہے لالہ زار میں سینۂ داغدار کا

محشرِ وعدہ آ ابھی بات ہو آ ہمیں بھید کی
خون تو اپنے سر لے کُشتۂ انتظار کا

دل کی کشود ہوتے ہی جلوہ بیحجاب تھا
دل جسے سمجھے تھے گرہ تھا بُرقع روئے یار کا

ایک نظر میں جو کرے دونوں جہان کو خراب
دل ہے نظارہ جو اُسی آفتِ روزگار کا

آسی نامراد پر بھی وہی جلوہ جس سے کہ
مطلعِ آفتابِ حشر ذرہ میرے غبار کا

خدا سے ترا چاہنا چاہتا ہوں
میرا چاہنا دیکھ کیا چاہتا ہوں

جہاں تک ہو تجھ سے جفا چاہتا ہوں
کہیں امتحانِ وفا چاہتا ہوں

وہ جب کھو چکے مجھکو ہستی سے اپنی
تو کہتے ہیں اب میں ملا چاہتا ہوں

تمہارے سوا اب جو کچھ سوجھتا ہو
پر اس سے بھی میں کچھ سوا چاہتا ہوں

جو دل میں نے چاہا تو کیا خاک چاہا
کہ دل بھی تو بے مدعا چاہتا ہوں

سیرِ صبح

انوارِ صبح سے ہی عیاں ہے نشانِ سیرِ صبح کھلتے ہیں بات بات پہ سرو سامانِ سیرِ صبح
بیدار دل میں قائلِ فیضانِ سیرِ صبح الحق کہ کامیاب ہیں خواہانِ سیرِ صبح

ہنگامِ ذکرِ خالقِ لیل و نہار ہے
حیّ علی الفلاح کی ہر سو پکار ہے

وقتِ سحر ہے خواب ہے دورِ غنودگی پنہاں ہے سیرِ صبح میں گنجِ خوش اختری
شاداب کیاریاں وہ چمن کی ہری بھری سوکھی سے خشک پودوں کو بھی کیا ہری ہری

سالک رہِ صبح ابھی مستِ خواب ہیں
تختے کے تختے کیاریاں سیرابِ آب ہیں

پودے وہ سبز سبز وہ شاداب کیاریاں پھولوں بھری ہیں سیج وہ سیراب کیاریاں
لب تشنہ ہیں جو منتظرِ آب کیاریاں بر لب ہیں یا مسبب الاسباب کیاریاں

کیا قدرتِ خدا کہ اوس لگاتے ہی جھک گئیں
جھکنے کی بات نہیں کہ نیا پیچ کھا گئیں

باہم وہ آب و خاک کی اللہ رے کشش دم بھر میں دیکھتے ہیں تو سب صاف بے خلش
ہر سمت آبیارِ چمن کی وہ سرزنش پانی کو گھوم گھوم کے لاتا وہ ہر روش

چھپتی نہیں ہے آنکھوں میں پتلی بلور کی
جدول لگی ہوئی نظر آتی ہے نور کی

تختے اِدھر جو ہو گئے سیراب سر بسر پانی مڑا درختوں کے تختوں کی سمت اُدھر
چل پھول پر پہونچتی نہیں ہے ابھی نظر آنکھوں میں گھومتی ہے وہ پانی کی رہگزر

[illegible] شگفتہ سے مسرت سے ہوئے
[illegible] سے رنگ کے تقاضے سے بھرے ہوئے

پتّے [illegible] گویا کہ زرد ادھر تو اُدھر سبز کونپلیں
[illegible] ہیں کدھر سے کدھر سبز کونپلیں

[illegible] ہوا!
[illegible] نیا ہوا

آثار [illegible] گویا کہ [illegible] جسم میں آئی ہے تازہ جاں
قربانِ کارسازی [illegible] پانی پڑا تو پاؤں میں پہنچا کہاں کہاں

[illegible] ہے عقلِ فرنگ تک
[illegible] حیرت سے جنگ تک

[illegible] یہ لوہے کے ہیں یتنے
[illegible] حیرت سے کیوں نہ کس طرح بنے

[illegible] آئینہ [illegible]
[illegible] دیکھئے

پودوں کو دیکھئے [illegible] تو پھری انجمن کا طور
[illegible] آنکھوں میں کھب جائے نہالِ چمن کا طور

[illegible] ہوش کا
[illegible] سبز پوش کا

[illegible] بیاباں مہک گئے
[illegible] پروانے تو کچھ تو [illegible] کچھ بہک گئے

[illegible]

آنکھیں کھلی نہیں ہیں ابھی تک حضور کی!

وہ باغ کا سماں وہ نفس صبح کی ہوا ہر شے سے حسن جلوۂ قدرت ہے آشکار
کلیوں میں ہے امنگ تو پھولوں میں ہے نکھار طائر بھی وجد میں ہیں زہے صنعِ کردگار
کوئل کہیں ہے گرم فغاں فاختہ کہیں
چنپا کھلی ہوئی ہے کہیں موتیا کہیں

گلگشت میں نظر جو ادھر سے گئی ادھر جلوے گل کے تھی نظر آتے نہ ہے نظر!
شاید ہے دست برد کہ مجھ سے بھی پیشتر مشتاقِ سیر اہلِ نظر آئے ہیں ادھر
مجھ کو خجل کیا ہے یہاں میری دیر نے
کروٹ بھی لی نہیں ہے ابھی میرے شیر نے!

آموں کی کیریوں کے لٹکتے ہیں ہیں جو رس کچا ہی انکو کھا سکے کچھ ہو جو دسترس
ترشی پر انکی رال ٹپکتی ہے ہر نفس ہاتھ ان پہ ڈالنے کی ابھی کیا کروں ہوس
کم سن ہیں نامراد ہیں اور ناتمام ہیں
نورس نہیں رسیدہ نہیں محض خام ہیں

پھیلی شعاعِ نور نکلتا ہے آفتاب غنچوں کے چھیڑنے کو چلی بوئے مشکناب
نرگس کی آنکھیں کھل گئیں ٹوٹا خمارِ خواب شبنم نے چار چھینٹے دیئے ہنس پڑے گلاب
چھایا ہوا ہے جلوۂ قدرت نگاہ میں
اب تک حضور پڑے رہتے ہیں خوابگاہ میں!

(آزاد عظیم آبادی)

صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
اے ہمالہ تو چھپا لے اپنے دامن میں مجھے
ہے غضب کی بجلی اپنے نشیمن میں مجھے
مدتیں گذری ہیں مجھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اب اسکو وطن کہتے ہوئے
آہ! ویرانی ہے پنہاں یاں کی تعمیر میں
آشیاں اور اس گلستانِ خزاں تاثیر میں!
آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح!
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
دانہ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں!
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں!
حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو؟
ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں؟
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں؟

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

پھر بلا لے مجھ کو اے صحرائے وسطِ ایشیا!
آہ! اس بستی میں اب میرا گذارہ ہو چکا!
پار لے چل مجھ کو پھر اے کشتیِ موجِ اٹک!
اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک!
ہاں سلامِ آخری اے مولدِ گوتم[۵۱] تجھے!
اب فضا تیری نظر آتی ہے نامحرم مجھے!
الوداع اے مدفنِ ہجویری[۵۲] اعجاز دم!
رخصت اے آرامگاہِ شنکر[۵۳] جادو رقم!
الوداع اے سیرگاہِ شیخ شیراز الوداع!
اے دیارِ بالمیک[۵۴] نکتہ پرداز الوداع!
الوداع اے سرزمینِ نانکِ شیریں بیاں!
رخصت اے آرامگاہِ چشتیِ[۵۵] عیسیٰ نشاں!

۵۱ یعنے گوتم بدھ۔ ۵۲ سید علی ہجویری عرف حضرت گنج بخش۔ ۵۳ سری شنکر اچارج ہندوستان کا قدیم فلاسفر۔ ۵۴ ہندوستان کا قدیم شاعر۔ ۵۵ خواجہ معین الدین چشتیؒ۔

سرزمیں تیری قیامت کی نفاق انگیز ہے! وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے!
رمزِ الفت سے مرے اہلِ وطن غافل ہوئے کارزارِ عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے!
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب! ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب!
اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں کیا انساں ہیں یہ! غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب ناداں ہیں یہ!
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں
جس کا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے! صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے!
دل حزیں ہے جاں حزیں ہے رنج بے اندازہ ہے آہ! اک دفتر تھا اپنا وہ بھی بے شیرازہ ہے!
امتیازِ قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ! اور اس الجھی ہوئی گتھی کو الجھاتے ہیں یہ!
ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی! کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جوہر نکھرتا ہے اسی تدبیر سے آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں! خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں!
وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی! اک ریاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی

ایک ہی مے سے اگر ہر چشم دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

اقبال

چاندنی رات

[illegible] [illegible] نسیم [illegible] ضلع علی گڑھ

چاندنی رات! تیرا کیا کہنا — تو نے پہنا ہے نور کا گہنا
چاند سے پیار چاند [illegible] — [illegible] تیری صورت [illegible] دیکھے
رخ روشن کا [illegible] — [illegible] [illegible] کا
بزم عالم ہے تجھ سے نورانی — پھر گیا [illegible] کی آب پہ پانی
تجھ سے عالم میں [illegible] — تیرے دم سے [illegible]
[illegible] روشنی تجھ سے — فرش خاکی پہ چاندنی تجھ سے
پیش عالم کو تو دکھاتا ہے — [illegible] کا تجھ سے بول بالا ہے
پاسبانی کا تیری وہ شہرہ — پاؤں پھیلا کے سوتی ہے دنیا
پھول ہے تو روش روش خنک ہیں — چشمۂ نور سے ہے کیا نکلی
ہو مقابل اگر شبستاں تیری — قلعی کھل جائے سنگ مرمر کی
تجھ سے شہر دل میں زینت تازہ — چاندنی چوک ہر گلی کوچہ
جلوہ گر ہیں غیرت مہتاب — کوٹھے برج سپہر کے ہیں جواب
رشک فانوس نور کے وہ گلے — شمع بے نور جیسے دیپک سے
موج زن ہے جو نور کا دریا — بقعۂ نور بن گیا صحرا
نور کی آبشار ہے جاری — بھر گئی آب سے زمیں ساری
چاندنی ہے یہ دشت میں پھیلی — یا کہ چاندی کی بہتی ہے ندی
سکتے دیتی ہے قلب کو مخمور — چاندنی ہے کہ ہے شراب طہور
جلوہ باغ ہے عجب دلکش — چاندنی کی بہار پر دل غش

نور سے جھلکا حوض کا ساغر چادر آب نور کی چادر
شاہد گل پہ ہے عجب جوبن نور کا ہے گلے میں پیراہن
جلوہ گر حسن اسکا ہے کم کم اس کی محجوب ادا کا یہ عالم
خواب نوشیں میں ہو کوئی دلبر ق آنچل آب زلال کا ہو منھہ پر
ہے یہ نقشہ سپید عمارت کا کھا رہا ہے جو دست شیر میں غوطا
در و دیوار ہیں سراپا نور بیٹھے شہ بالا ہیں آنکھیں ہوتی چور
بالاخانہ پہ ہے عجب جلوا صحن بالا کے ہے نمایاں پیدا
اک پلنگڑی پڑی ہے نازک سی اس پہ بیٹھی سی ہے کوئی
پتلے پتلے ہیں مخملی تکیے پھول رکھے ہوئے چنبیلی کے
خواب راحت میں ایک مہوش ہے جس کے جوبن پہ چاندنی غش ہے
رنگ پوشاک کا ہے کافوری عطر میں کیوڑہ کے ہے جو بسی
چہرہ پر اک ادا قیامت کی لب نازک پہ مسکراہٹ سی
کچھ پسینے سے نم ہے پیشانی چاند کے عکس نے ہے نورانی
ہے تموج میں نور کا چشمہ یا ابھرتا ہے سانس سے سینہ
ذرا نیچے کو جھک گیا ہے سر ہاتھ رکھا ہے ایک تکیہ پر
دوسرا ہاتھ اس کا سینہ پر پہرہ بیٹھا ہوا ہے خنجر پر
ایک دلدادہ محو نظارہ اس کے پہلو سے ہے لگا بیٹھا
چہرہ پر اک سکوت کا عالم ذرا نیچے کو سر ہے اسکا خم
نقش حیرت ہے شکل حسرت ہے محو ہو جانے کی صورت ہے
ہمہ تن محو لذت دیدار سانس لینا بھی اسکو ہے دشوار
آنکھیں تاب جمال سے خیرہ اور نگہ لوٹ رخ کے عالم پر

کسی کا دھیان

اے دل میں اپنی شان سے رہنے والے کسی کے دھیان
اس بزم کی تو روح ہے اس جان کی ہے جان

تو جلوہ بہار ہے کسی کے جمال کا
اے سینکڑوں دلوں کی خوشی! تجھ پہ ہیں فدا

سونا پڑا ہے دل کا شبستان ترے بغیر
کیسے بسے یہ خانۂ ویراں ترے بغیر؟

ہے انتظار حسرت دیدار کو ترا
ارمان تک رہے ہیں تری راہ جلد آ

تو شمع ہے خیال کے فانوس کے لیے
روشن چراغ فکر ہے تیرے ہی نور سے

ذرہ صفت ہے واہمہ تو مہر خاوری
اس کی فسوں گری ہے تری ذرہ پروری

دیدار یار جام شراب طہور ہے
تو اس مے لطیف کا پیارا سرور ہے

دوری تری جدائی جاناں سے کم نہیں
تو ہو تو مجھ کو یار کی فرقت کا غم نہیں

اس دل کا غم بھی تو ہی ہے دل تنگ بار بھی
اس کی تڑپ بھی تو ہی ہے اس کا قرار بھی

خلوت کا تو انیس ہے جلوت کا تو رفیق
ہر حال میں تو ساتھ ہے اے باوفا شفیق

کیا تجھ سے نوک جھوک ہے کیا چھیڑ چھاڑ ہے
ہے صلح بھی تجھی سے تجھی سے بگاڑ ہے

ان تیرے روٹھنے میں منانے میں لطف ہے
اس دل لگی میں ہنسنے ہنسانے میں لطف ہے!

اپنے لیے جہان سے الگ اک جہاں ہے تو
گلگشت شوق کے لیے باغ جہاں ہے تو

تو میری جاں کے ہر رگ و ریشے میں موجزن
تو مجھ پہ ہے محیط تو میں تجھ میں ہوں مگن

یہ عمر بھر خدا کرے [illegible] جب سر میں تو نہ ہو
وہ دن نہ ہو کہ دل میں تری آرزو نہ ہو

نسیم

حاشیہ: خیال کا ایک نہایت عمدہ مضمون اور عجیب دلکش عنوان کہ دیر سے میری نظر سے گزرا تھا اور نہ صرف میری فہرست مضامین میں درج تھا بلکہ جو کچھ مجھے اس کی نسبت کہنا تھا اس کا ایک ابتدائی کچا سا خاکہ بھی موجود تھا۔ اسی اثنا میں میدان عمل میں نورالدین عنبر صاحب مجھ سے آگے نکل گئے اور ان کی نظم اسی عنوان سے مخزن میں نکل آئی۔ سوچا کہ اب اسکو جانے دو۔ مگر پڑھ کر جو دیکھا تو ابھی کچھ مجھ کو اور کہنا باقی تھا۔ اس لیے عنوان بدل کر یہ عرض کیا گیا ہے +

حالی

کوئی نہ تھا جو بنے ملکِ شعر کا والی دکھائے جوہرِ فکرِ طبیعتِ عالی
پڑی تھی سُشت ہر بزمِ سخن کی جا خالی زمانہ دیر سے تھا منتظر ترا حالی

بیا کہ فرشِ رہت دیدہ ہائے مشتاقاں
نوائے نغمۂ تو جاں گداز غمزہ کناں

اُٹھا کے ربطِ بالینِ سعدیٔ شیراز پڑے ہوئے تھے جو گذری تھی سالہائے دراز
گئے تھے جسکو بجانے کا بھول سب انداز کچھ اس ادا سے ہوا اُس پہ تو ترانہ نواز

کہ آتے جاتے کو شیدا بنا لیا تو نے
فسوں سا خلقِ خدا پر چلا دیا تو نے

جگر نشیں ہیں ترے تیرِ نالۂ موزوں تری نوائیں ہیں برقِ قرار و صبر و سکوں
ہے زخم زخمہ پہ ایک ایک والہ و مفتوں بطِ شراب میں ساقی نے گھولدی افیوں

کہ مستِ جامِ تو تنہا نہ مے گسار انند
"خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند"

ہیں حرف حرف میں تیرے چھپی ہوئی نشتر ہیں لفظ لفظ میں گویا بجھے ہوئے خنجر
دلِ اسکا چھیدتے ہیں جاتے ہیں اُس کا جگر ہوئی پکار کہ بزمِ طرب بنی محشر

"کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی"

صدائے رعد سے بھی تھے نہ چونکنے والے شرابِ لذتِ خوابِ سحر کے متوالے
گر اُٹھائے جگر دوز تو نے جب نالے تو پڑ گئے دلِ فولاد میں بھی تبخالے

ز خویشتن شدہ یک یک تپان نجا برخاست
کہ شورِ صُورِ سرافیل حالیا برخاست

ترا کلام ہے تفسیرِ دردِ اہلِ جہاں		ہے شرحِ رازِ حقیقت ہر ایک تیرا بیاں
شعاعِ مہرِ معانی سے ہے ترا دیواں		ضیائے مردمکِ دیدۂ سخنداناں

ہمیشہ بزم میں باقی رہیگی ضَو اُس کی
رہیگی زندہ دلوں کے دلوں میں لَو اُسکی

غزل میں ہو وہ تصوّف کہ سوز و ساز و گداز		ہے مست صُوفیِ صافی، رندِ محرمِ راز
دکھایا اُردو میں حافظ کا جو بھو انداز		بھرا ہے شیشۂ ہندی میں بادۂ شیراز

زلالِ چشمۂ حیواں ز خامہ ات بچکید
کہ رُوح در تنِ قومِ فسردہ جاں بدمید

چمن میں طوطیِ ہندوستاں ہو گرمِ سخن		کہاں ہے شورشِ آوازِ نالۂ سیرن
زبانِ ہند زبانِ جہاں اگر ہو جائے		تری نواؤں سے تسخیر بحر و بر ہو جائے

زمینِ شعر میں تازہ چمن لگائے ہیں		اور ان میں طرفہ مضامیں کے گل کھلائے ہیں
نگاہِ صادقِ مشتاق میں سمائے ہیں		ہزار طرح ہزاروں نے خار کھائے ہیں

نہ وُہ رہینگے نو مانہ میں اور نہ تو حالی
رہیگی تیرے گلستاں میں رنگ و بُو حالی

(صادق علی خاں از سری نگر)

اِنسانِ فانی

(از علی مردان شاہ قریشی المتخلص بہ مضطر)

نہیں معلوم مجھ کو کیا ہوں میں
راہ روِ منزلِ فنا ہوں میں

میں ہوں لہو و لعب کا پیرایہ
میں ہوں رنج و تعب کا سرمایہ

مائہ صد غرورِ باطل ہوں
موردِ صد بلائے نازل ہوں

معرضِ خطرہ ہائے فوت ہوں میں
مظہرِ جلوہ ہائے موت ہوں میں

شاہبازِ اجل کا صید ہوں میں
پنجۂ سوزِ غم میں قید ہوں میں

موت کے عرض کا میں جوہر ہوں
صدفِ نیستی کا گوہر ہوں

موجِ حسرت پہ اک حباب ہوں میں
سیخِ ماتم پہ اک کباب ہوں میں

میری ہستی کا شیشہ سنگِ فنا
ڈھونڈھتا ہے کہ ہووے اُس پہ فدا

ہے محلِ موت کا وجود مرا
میری ہستی ہے نیستی کا پتا

میرے بازار میں متاعِ ہموم
میرے گلزار میں ہوائے سموم

مخمصات اور حادثات عجیب
ہیں مقدر میں میرے ہائے نصیب

مخیمِ غم ہے میری ہر شادی
میری آبادی جائے بربادی

رنج لازم ہے بعدِ ہر آرام
جیسے آغاز کے لئے انجام

دم ہی دم پر ہے اب مدار اپنا
سخت موہوم ہے قرار اپنا

عدم آباد ہے ٹھکانا مرا
شہرِ خاموشاں آشیانہ مرا

کارواں میرے روز جاتے ہیں
لوٹ کر پھر نہیں وہ آتے ہیں

نہ صدائے جرس نہ شورِ درائے
نہ سراغِ قدم نہ نقشِ پائے

ہائے کیسا غضب ہوا ہے آج — چپکے لیٹے ہوئے ہیں کام نہ کاج
سرہانے ہیں انہیں پکارتے ہیں — روتے ہیں رو کے چیخیں مارتے ہیں
پر توجہ نہیں ذرا بھی ادھر — دیکھتے بھی نہیں اٹھا کے نظر
تھے یگانے ہوئے ہیں بیگانے — کیا ہوا ہے - کوئی کیا جانے
نہ خیال انکو آہ و زاری کا — نہ ملال ان کو بیقراری کا
نہ تفکر ہے سود و نقصان کا — نہ تردد ہے درد و درماں کا
نہیں معلوم کیسے آنا ہوا — نہ کھلا بھید کیسے جانا ہوا
نہ تمنا یہاں تھی آنے کی — نہ خوشی تھی یہاں سے جانیکی

انتظامِ سفر رکھو مضطر
کہ نہیں کوچ کی ذرا بھی خبر

اہلِ قناعت

بے مائگی سے غم کریں کیا اہلِ قناعت — رکھتے ہیں نظر سوئے خدا اہلِ قناعت
دنیا کے زر و مال کو کیا خیال میں لائیں — رکھتے ہی نہیں حرص و ہوا اہلِ قناعت
رہتے ہیں غنی فقر کی دولت سے ہمیشہ — خواہاں نہیں دولت کے ذرا اہلِ قناعت
جو آج فقیری میں رہے صابر و شاکر — کل پائینگے ہم سب سے سوا اہلِ قناعت
جاگیرِ توکلت علی اللہ کے مالک — ہیں منصبِ عالی پہ سدا اہلِ قناعت
اللہ نہ کیونکر رہے خوش ان سے ہمیشہ — ہیں اہلِ تسلیم و رضا اہلِ قناعت
درگاہِ خداوندِ دو عالم میں شب و روز — کرتے ہیں تہِ دل سے دعا اہلِ قناعت
یاری کرے تقدیر چھٹیں قیدِ ہوس سے — ہو جائیں سب اے بخت رسا اہلِ قناعت

(سید امیر حیدر بخت - اکبرآبادی)

کچکول

غیروں کو بھیجتے ہو عیادت کے واسطے
یہ اُور آفتیں ہیں مری جان کے لئے

وُہ مُسکرا کے دیکھنا کافر نگاہ سے
اِک تیر تھا کہ بیٹھ گیا جان کے لئے

سر رکھدیا ہے جھُوٹ کے اُس نے جو دوش پر
مر مر گیا ہُوں اتنے سے احسان کے لئے

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

اِک قیامت ہے بپا کیا دُھوم ہے بیداد کی
تم نے تو صورت بدل دی عالمِ ایجاد کی

مر کے بھی لذت نہ بھُولا میں تری بیداد کی
ہائے ظالم کیا روش تھی خنجرِ فولاد کی

ہمصفیروں میں کسے مہلت نہیں فریاد کی؟
اِک ہمیں پر تیز رہتی ہے چھُری صیاد کی

چھانٹ کر مارے ہیں خنجر جا بجا بیداد کی
عمر دو گنی چو گنی ہو اُس ستم ایجاد کی

دھیان تو ہے دل میں مُنہ سے نام لے وُہ یا نہ لے
بھُول جانے پر بھی اُس کے اک جھلک ہے یاد کی

تم کہیں آتے تو ہم تک حشر ہوتا تو کہیں
کچھ تو ہم کو داد ملتی داد کی بیداد کی

عاشق و معشوق میں دو ہی کماں کا فرق تھا
عرش پر ایسی رسائی اور آدم زاد کی!

جب مزہ ہے زیست کا قیدِ علائق میں نہ ہو
اِس چمن میں زندگی ہے سروِ آزاد کی

نزع کا عالم ہے پیارے دیدنی ہے زندگی
دیکھ جاؤ آ کے صورت عاشقِ ناشاد کی

یہ کہاں سے جھُومتے آئے اِن آنکھوں کے نثار
مر مٹا میں آپ نے اچھی روش ایجاد کی

(〃)

میری بھی سُن لے دامنِ رحمت دراز ہے
بندہ نیاز مند ہے تو بے نیاز ہے

جوشِ سرورِ بادۂ پندار کیفِ حسن
کس کس نشے میں چُور مرا مستِ ناز ہے

جس طرح مجھ کو کہہ لیا محفل میں آپ نے
میں جانتا ہُوں غیر بھی اِس کا مجاز ہے

ناکہ پاک صاف ہے دل بھی تو پاک ہو　　زاہد خدا کے واسطے یہ کیا نماز ہے
اُس کا نصیب اُس کی ہی قسمت سے پوچھئے　　شانے پہ جس کے یار کی زلفِ دراز ہے
اپنے میں دیکھتا ہوں تصور سے یار کو　　محمود آج آپ ہی اپنا ایاز ہے
اب ہوں سی کے پھر جگرِ زخم زخم کو　　پھر اُن کو اپنی نیم نگاہی پہ ناز ہے
محبوب کو بلا لیا موسے سے کھنچ گئے　　شاعر یہی تو شوخیِ ناز و نیاز ہے

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

سب کو سیراب کیا اک ہمیں ترسیں ساقی!　　ہاں ادھر بھی کوئی چھینٹا ملے میخواروں کو
مدتیں گذریں تڑپتے تری فرقت میں اُنہیں　　پوچھنے آؤ بھی ظالم کبھی غمخواروں کو
ساری باتیں گئیں دِن رات کا جلنا نہ گیا　　بھر لیں ہم چیر کے پہلو میں نہ انگاروں کو؟
ہجر میں تیرے ہمیں چین کہاں خواب کہاں　　تکتے رہتے ہیں پڑے سقف کو دیواروں کو!
دشت میں وحشت مری فرقت میں ہوا ہے پھرتا　　آنکھیں تلووں سے ملیں شوق ہے یہ خاروں کو
ہر نفس ناصحا پھرتا ہے چمن آنکھوں میں　　ضبط کس طرح سے ہو تازہ گرفتاروں کو!

(نذیر حسین احمد)

میں اپنے ضعف کے ہاتھوں تڑپ نہیں سکتا　　وہ جانتے ہیں مرے دل کو اضطراب نہیں
وہ میرے شکوہ پہ کہنا نقاب اُٹھائے ہوئے　　نہیں نہیں مجھے تم سے کوئی حجاب نہیں
پیئے بغیر چڑھی رہتی ہے حسینوں کو　　وہاں شباب ہے کیا کم اگر شراب نہیں
اُٹھی شباب کی آندھی تمہیں مبارک ہو　　تمہارے منہہ پہ ٹھہرنے کی اب نقاب نہیں
غرور اُنکا جو ٹوٹا تو عاجزی سے مری　　بجز نیاز کوئی ناز کا جواب نہیں
جلیل بند نہ ہو دورِ جامِ مینائی　　کہ اس شراب سے بڑھ کر کوئی شراب نہیں

(جلیل جانشین امیر مینائی مرحوم)

(شیخ محمد اکرام)

اپنا دکھڑا ہر گھڑی ہر جا نہ رونا چاہئے　　حالِ دل کہنے کیلئے ناداں سلیقہ چاہئے

شش جہت میں سینکڑوں جلوے کھڑے ہیں منتظر ہاں درِ آئینۂ دل ہر طرف وا چاہیے
جیسے وہ آئینگے سب ظاہر ہے۔ پہلے انتظار کچھ نہ کچھ تو اپنے جینے کا سہارا چاہیے
جلوۂ دیدار۔ لطفِ ہم کلامی۔ ذوقِ وصل اس دلِ بے صبر۔ ظالم! کو بھی کیا کیا چاہیے
محفلِ اغیار میں جاتے ہیں یہ آیا جواب نا اُمیدی خط کو سر آنکھوں پہ رکھا چاہیے
پھر چلے اُس بزم میں اے حضرتِ دل خیر ہے شرحِ رمزِ خلد و آدم کیا دوبارا چاہیے
کچھ ہنسی ٹھٹھا نہیں اعجاز یہ تو عشق ہے اس کو دل لوہے کا پتھر کا کلیجا چاہیے

(مرزا اعجاز حسین۔ بی اے)

ہے کلیجا فگار ہونے کو دامنِ لالہ زار ہونے کو
کیا ادا تھی وہ جاں نثاری میں تھے وہ مجھ پر نثار ہونے کو
جستجوئے قفس ہے میرے لئے خوب سمجھے شکار ہونے کو
عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قرار چاہیئے بے قرار ہونے کو
یارِ جانی کہیں نہیں ملتا یوں تو ہم سے ہیں یار ہونے کو
لالہ اور داغِ دل بہانہ ہے دل جلوں میں شمار ہونے کو
زخم اور سوزنِ رفو۔ توبہ! کھل گیا بستہ کار ہونے کو
پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے کس کی راہ کا غبار ہونے کو
وعدہ کرتے ہوئے نہ رک جاؤ ہے مجھے اعتبار ہونے کو
اُس نے پوچھا یہ کون چھپتا ہے ہم تھے آشکار ہونے کو
ہم نے اقبال عشق بازی کی پی ہے مے ہوشیار ہونے کو

(شیخ محمد اقبال ایم-اے)

آپ پیری و جوانی پہ نہ جائیں صاحب دلِ عاشق کو بدستور وہی دل سمجھیں

(منشی رحیم بخش صاحب ایم-اے اکسٹرا اسسٹنٹ)

اُلٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بیطاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
مانگا کرینگے اب سے دعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی — ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
اللہ رے سوزِ آتشِ غم بعدِ مرگ بھی — اُٹھتے ہیں میری خاک سے شعلے ہوا کے ساتھ
آتے ہی تیرے چل بسے سب ورنہ یاس کا — کیسا ہجوم تھا دلِ حسرت فزا کے ساتھ
اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر — مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

(لیاقت حسین ساحر) — (مومن دہلوی)

بوستانِ آرزوئے دشمناں سرسبز ہے — نخلِ ارماں کو مرے نشو و نما کچھ بھی نہیں
وائے قسمت کب عیادت کے لئے آیا ہے وہ — جبکہ بیمارِ محبت میں رہا کچھ بھی نہیں
دیکھئے تو ملکے خوں بسمل کا اپنے ہاتھ میں — اس کے آگے شوخیٔ رنگِ حنا کچھ بھی نہیں
نجفت! دیکھا انقلابِ دہر کہلاتا ہے یہ — اُنکے آگے میں کبھی سب کچھ تھا اب کچھ بھی نہیں

(سید امیر حیدر نجفت)

شعلۂ عشقِ بتاں دل میں چھپا کر رکھا — ہم نے اس آگ کو چھاتی سے لگا کر رکھا
دردِ فرقت سے کبھی آہ نہ آئی لب تک — آگ کے ساتھ دھوئیں کو بھی دبا کر رکھا

(سید حفیظ الدین) — (میر طالب حسین شائق مرحوم)

عشق میں مر ہی گئے لیکن کبھی اے چارہ گر — زخمِ دل اپنے ذرا واقف نہ مرہم سے ہوئے
یہ غضب دیکھو نہیں وہ بھی ہمیں کہتے بھلا — واسطے جنکے بُرے ہم ایک عالم سے ہوئے

(سید محمد محسن) — (ظفر)

پایا تو اُس کو ہم نے دل کے مکاں میں پایا — دیر و حرم میں بیجا تھی جستجو ہماری
نازاں ہے کیوں غیر ناحق اپنی مصاحبت پر — رہتی تھی یوں ہی صحبت اُنسے کبھو ہماری
اُس گل کے تا بدامن پہنچے نہ اے صبا ہم — برباد خاک تو نے کی کُو بکُو ہماری



رسٹ واچ
ترکی ٹوپیاں
جیبی لیمپ
ہنسی کا آلہ
تمام درخواستیں بنام شیخ رحیم بخش سوداگر متصل انارکلی بازار لاہور آنی چاہئیں



شیخ رحیم بخش سوداگر متصل انارکلی بازار لاہور

تین نقشے

ایک روپیہ میں

آجکل حجاز ریلوے کے متعلق اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور اس لین کی تیاری کی خبریں روز بروز مشتہر ہوتی رہتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ناظرین اخبار کو خاص دلچسپی اس ریلوے کے حالات اور اس ملک سے جس میں سے ہو کر وہ ریل گذریگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور مسلمانوں کو خصوصاً بہ سبب مذہبی تعلق کے اور بھی زیادہ دلچسپی ہے۔ اسلئے حمیدیہ ایجنسی لاہور نے تین نقشے اپنے حمیدیہ پریس میں نہایت کوشش اور صفائی سے چھپوائے ہیں۔ ایک میں یورپی روم کی تمام ریلوے لینیں دکھائی گئی ہیں اور ساتھ ہی مشہور مقامات جو انپر واقع ہیں۔ دوسرے میں ایشیائی روم کی ریلیں۔ اور تیسرے میں مجوزہ حجاز ریلوے۔ اچھے کاغذ پر چھپے ہیں اور اسپر بھی تینوں کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ شائقین ایک سٹ منگوائیں۔ اور دیکھیں اور اگر پسند ہو تو احباب تک بھی پہنچائیں

المشتہر

محمد انشاء اللہ۔ مالک حمیدیہ ایجنسی و ایڈیٹر و مالک اخبار وطن لاہور

بچوں کا اخبار

کا نام پیسہ اخبار سے بیٹا ہمارا رسالہ بچوں کے خاص مطالعہ کے لئے شائع ہونا شروع ہوا ہے پہلا نمبر ماہ مئی میں شائع ہو چکا ہے۔ معزز ہمعصروں نے پہلے پرچہ کو نگاہ پسندیدگی سے دیکھا ہے اور متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ کہ بچوں کے اخبار کی ملک میں بہت ضرورت تھی۔ کوشش کی جائیگی۔ کہ اسے ہر پہلو سے بچوں کے لئے دلچسپ بنایا جائے۔ اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ تعلیمی فائدہ بھی حاصل ہو۔ افسرانِ محکمہ تعلیم نے بھی اس ارادہ سے بہت ہمدردی ظاہر فرمائی ہے مگر اس کی پوری کامیابی ملک اور اہلِ ملک کی قدردانی پر منحصر ہے۔ اسکی لکھائی چھپائی کی عمدگی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحہ کا (۲۲×۱۸) کی تقطیع پر ہے اور اس کی قیمت سالانہ پیشگی عہ مع محصولڈاک ہے۔ درخواستیں بنام مشتہر آنی چاہئیں +

المشتہر

منیجر۔ پیسہ اخبار۔ لاہور

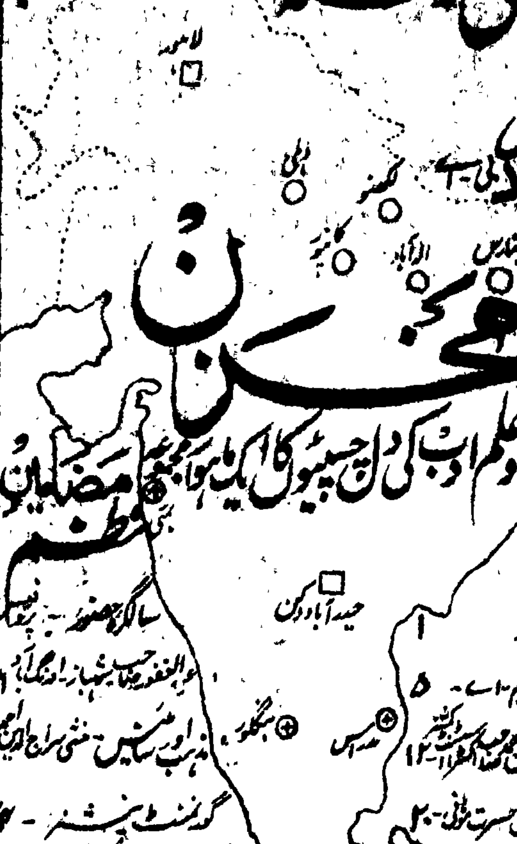
جلد ۳ جولائی سنہ ۱۹۰۲ء نمبر ۴

ایڈیٹر

شیخ عبد القادر بی۔ اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ



ان شہروں میں ... اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

◎ ان شہروں میں ... □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں ... ہے۔

مطبع ... میں ... محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا

اور شیخ عبد القادر بی۔ اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور مضمون نگاروں کے علاوہ ایک معقول تعداد نئے اور ہونہار اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں پائے ہوئے اصحاب جنکو آج تک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا۔ شوق سے اس کے بنانے میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کی طرف سے نہ ہوں۔ مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کیجاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود ہو۔ رسالہ کا حجم (۲۲×۱۸) کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ صفحہ کا ہے۔ قیمت عمدہ دبیز ولائتی کاغذ پر بلا محصول تین روپیہ۔ اور دوم درجہ کے کاغذ پر دو روپیہ ہے۔ اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا۔ محصول ڈاک دونوں صورتوں میں ۶ آنہ سالانہ ہے۔

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنی چاہئے۔ مابعد کا کوئی حساب نہیں۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر

شرح اجرت اشتہارات

مخزن۔ اشتہارات کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ اس کے خریداروں کی لمبی فہرست میں پنجاب کے لوگ بھی ہیں اور صوبجات متحدہ و اودھ کے بھی۔ اضلاع دکن اور حیدر آباد میں بھی بکثرت بکتا ہے۔ اور وہاں کے امرا اور رؤسا کی ایک کثیر تعداد اس کے قدردانوں میں ہے۔ شمالی ہندوستان کے بھی معزز ترین مسلمانوں کے اسمائے گرامی اسکی فہرست میں شامل ہیں اس لئے اس کے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیت اشتہار کا اندازہ کر سکینگے۔ ایک ماہ کے لئے تجربہ اگر فائدہ منظور ہو تو سال بھر کا معاہدہ کریں۔ آٹھ صفحہ اشتہارات فی صفحہ سال بھر کے معاہدہ کرنے پر ششماہی کے لئے ۱۲ اور سہ ماہی کے لئے ۸ روپیہ۔ فی نصف صفحہ سال بھر کے واسطے ۸ روپیہ ششماہی کے لئے ۵ اور سہ ماہی کے لئے ۳ روپیہ۔ اتفاقی اشتہارات کے لئے ۲ فی سطر۔ اس شرح میں کمی کی گنجائش نہیں۔ شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر

مخزن

اسرارِ وجود

نشوی واقفِ یک نقطہ ز اسرارِ وجود
گر تو سرگشتہ شوی دائرہ دوراں را (حافظ)

حافظ کا کلام جس پایۂ قبول کو پہنچ چکا ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ اور اس قبولیت کی بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ اس دریائے عرفان کے شناور کی زبان سے بیساختہ رموزِ معرفت کے ایسے ایسے نکتے نکل گئے ہیں۔ جو اور شعرا میں کم پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اس خاص صیغہ میں بیشتر شعرائے فارس و ہندوستان حافظ کے خوانِ علم کے زلہ ربا ہیں۔ انہیں نکات میں وہ نکتہ ہے۔ جو شعر مندرجہ بالا میں نہایت پرزور الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ گو اس کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر اس کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ اس شعر کا اور اس قسم کے اور اقوال کا اثر مختلف آدمیوں پر مختلف پڑتا ہے۔ جہاں یہ منتہیوں کے لئے چراغِ ہدایت ہیں۔ وہیں یہ مبتدیوں کے لئے باعثِ گمراہی بھی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ حافظ اور اس رنگ کے اور مصنفین اور شعرا کی تصانیف کی بابت ہمیشہ سے دو رائیں چلی آئی ہیں۔ ایک فریق انکو نہایت اعلیٰ سمجھتا ہے اور انکی تعریف کرتے نہیں تھکتا۔ اور دوسرا فریق اُن کی مذمت کرتا اور اُن کے مطالعہ سے لوگوں کو روکتا ہے۔ اور اپنی اپنی جگہ دونوں حق بجانب ہیں۔ اُن

لوگوں کے لئے جو ان حقائق کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو ایسی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ اِن کے مطالعہ سے بہتر شغل نہیں ہو سکتا۔ اور اُن کے لئے جو اُس فہم سے بہرہ ور ہی نہیں ہوئے۔ جو ان کے مطالب کے ادراک میں مدد دے۔ اِن کا مطالعہ نہایت مضر ہی اب اسی مسئلہ اسرارِ وجود کو دیکھئے۔ اِس سے زیادہ سچی بات کیا کہی جا سکتی ہو۔ کہ اسرارِ وجود اسقدر پیچیدہ ہیں۔ ان کی تحقیقات کی راہیں ایسی باریک اور دشوار گذار ہیں۔ اور اُنکی علم کا احاطہ ایسا وسیع اور ان کی اصلیت کا سمندر ایسا ناپیدا کنار ہو۔ کہ آپ عمر بھر ٹوہ لگاتی رہیں۔ اس کی تھاہ کو پہنچنا محال ہو۔ لیکن اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی یہ سنکر تلاش اور تجسس کو ہی چھوڑ بیٹھے۔ اور ہمت ہار دے۔ تو اُس سے زیادہ غلطی اور خسارہ میں پڑنے والا کون ہو سکتا ہو۔ دُنیا میں جتنے فلسفی گذرے ہیں۔ جن کا نام اُن کے علم و فضل اور خردوری کے سبب سے آج تک ادب سے لیا جاتا ہے۔ سب مدت العمر اسرارِ وجود کی دریافت میں مصروف رہے۔ اور شاید مقصود ہاتھ لگا یا نہ لگا۔ مگر اُن کی یہی تلاش اُن کے بقائے نام کا سبب بن گئی۔ جتنے نامور اہلِ دین و بانیانِ مذاہب گذرے ہیں۔ اُن کی زندگی کا سب سے اعلےٰ مقصد اسرارِ وجود پر روشنی ڈالنا تھا۔ اور جہانتک اُن کے وسائل نے اجازت دی انہوں نے خود تلاش سے کام لیا۔ اور جو کچھ انہیں اس تلاش میں ملا۔ اُسے اُنہوں نے کھلے دل سے اپنے ابنائے جنس کے سامنے رکھدیا۔ آگے یہ دُوسروں کے نصیبوں پر رہا۔ کہ وُہ کس حدتک اس تحقیقات سے مستفید ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی محدود انسانی عقل اور اپنی محدود حدِ نگاہ کے مطابق کچھ نہ کچھ اخذ کر لیا۔ اگر یہ لوگ سب اس نصیحت کے بدیہی معنوں پر عمل کرتے جو حافظ کے مندرجہ عنوان شعر سے حاصل ہوتی ہو۔ تو یقیناً یہ مسئلہ سخت تاریکی میں رہتا اور اسرارِ وجود سے تھوڑی بہت آگاہی رکھنے والے بھی دُنیا سے مفقود ہوتے۔ جو لوگ اس رمز سے آگاہ ہیں جو حافظ شیرازی نے اِس شعر میں بیان کی ہو۔ وُہ یہ تسلیم کرینگے۔ کہ یہ

اِنتہائے مقصد بسی کا اظہار ہے ۔ علم ابتدائی حالت میں انسان کو اپنی معلومات کی وسعت پر نازاں کرتا ہے ۔ اس درجہ میں آدمی دُوسرے ابنائے جنس کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے یا اُن کی کم علمی پر رحم کرتا ہے ۔ اپنی بڑائی پر فخر کرتا ہے ۔ اور سمجھتا ہے ۔ کہ ہمچو من دیگرے نیست ۔ اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے ۔ کہ صاحبِ علم وسعتِ علم کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے اور اُس کی خاموشی اُسے تصویرِ حیرت بنا دیتی ہے ۔ ؎

جو طبلِ تہی ہیں وُہ بنکارتے ہیں جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کہ کچھ

اس مرحلہ سے گذر کر ایک منزل آتی ہے ۔ جہاں خاموشی پھر مبدّل بہ گویائی ہوتی ہے ۔ مگر اِس گویائی میں نخوت و غرور و تکبر کا کہیں پتا نہیں ہوتا ۔ ہر بُنِ مُو سے صدائے "من نیم و من نیستم" نکلتی ہے ۔ اور علامۂ دہر پکار اُٹھتا ہے ۔ "ایں قدر دانستم کہ ہیچ نہ دانستم" ۔ یہ تھا قول ایک مشہور ترین حکیم کا ۔ اپنے بسترِ مرگ پر ۔ موجُودہ زمانہ کا ایک بڑا بلند پایہ جرمنی مصنف جس کے تبحرِ علمی کا سارا فرنگستان معترف ہے ۔ مرتے وقت آبِ حیاتِ علم کے لئے العطش العطش پکارتا ہوا گیا ۔ اور اُسکے آخری الفاظ یہ تھے ۔ "اور روشنی ! اور روشنی" ! اِسی بےچینی کا اظہار حافظ نے کیا ہے ۔ جب اُس نے یہ کہا ہے ۔ کہ اسرارِ وجُود کی تحقیق کے میدان میں خواہ آپ کتنے گھوڑے دوڑائیں ۔ اس کے کوہ و دشت میں کتنا ہی سر ٹکرائیں ۔ اور آخر کسی حد تک اپنی معلومات کو لے جائیں ۔ مگر یہ سمندر اتنا وسیع ہے ۔ کہ اِس کے ایک قطرہ سے بھی آپ آشنا نہ ہونگے ۔ یہ دائرہ اتنا بڑا ہے ۔ کہ اِس کے ایک نقطہ پر بھی آپ حاوی نہ ہونگے ۔ اِس کا مطلب جو کچھ ہم سمجھتے ہیں انتہائے علم انسانی کے محدود ہونے کا اعتراف ہے ۔ ورنہ اس سے یہ غرض ہرگز نہیں ۔ کہ ہر نوجوان زندگی کا آغاز کرنے والا ۔ ہر طالبِ علم طلب علم میں عازمِ سفر ہونے والا ۔ ہر متلاشی اور ہر متجسس تلاش و جستجو سے دست بردار ہو جائے ۔ کیونکہ ایک صاحبِ عرفان نے کہدیا ہے کہ اِس جستجو سے حاصل کچھ نہیں ۔ طالب کو چاہیئے کہ سرگرمِ جستجو رہے ۔ بلکہ جستجو کا ہی کوچہ وُہ

کوچہ ہے جسکی خاک چھاننی انسان کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اور جس کی خاک چھانتے چھانتے انسان حقائق و معارف کے اتنے ریزہ ہائے زر و جواہر جمع کر سکتا ہے۔ کہ سمیٹے نہ سمٹے بائیں اور اُس کا دامن گوہر مقصود سے مالامال ہوکر ایسی دولت بے انتہا نظر آتی ہے کہ وُہ مجبور کہہ اُٹھے۔ ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار		گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

لاثانی اُستانی - چودھری خوشی محمد صاحب بی۔اے المتخلص بہ ناظر کے نام نامی سے پنجاب اور صوبجات متحدہ کے اکثر اصحاب واقف ہیں علیگڈھ کالج میں وُہ مذاق علمی میں ممتاز رہے ہیں۔ کئی مجالس اور کانفرنسیں انکی نظموں اور تقریروں سے رونق پاتی رہی ہیں اور آجکل وُہ ریاست جموں و کشمیر میں صاحب کمشنر بندوبست مددگار خاص (پرسنل اسسٹنٹ) ہیں۔ اُنھوں نے ایک بیش بہا کتاب لکھی ہے جس کا نام "لاثانی اُستانی" ہے۔ اور مقصد اس کا یہ ہے کہ تعلیم نسوان کے لئے خاص طور پر مفید ہو۔ ہمارے ملک میں یہ شکایت عام ہے۔ کہ مستورات کے مطالعہ کے لئے کتابیں موجود نہیں۔ یہ کتاب اِسی ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس ضرورت کو خوب پُورا کرتی ہے۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ طبعیات۔ حفظ صحت اور دیگر امور اطلاع عامہ کے متعلق دلچسپ معلومات اس میں بطور سوال و جواب کے جمع کی گئی ہیں۔ ایک لڑکی اپنی اُستانی سے مختلف سوال کرتی ہے۔ اور اُستانی سیدھے سادے صاف اور بامحاورہ الفاظ میں جواب دیتی جاتی ہے۔ ہم چودھری صاحب کو اُن کی مساعی کے کامیاب ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ ملک کی لڑکیاں اس "لاثانی اُستانی" کی قدر کرینگی۔ کیونکہ ایسی مشفق اُستانیاں اور ایسی باخبر اُستانیاں ابھی یہاں بدقسمتی سے کمیاب ہیں۔ یہ کتاب عمدگی سے ہلالی سٹیم پریس۔ ساڈھورہ۔ ضلع انبالہ میں چھپی ہے اور غالباً وہیں سے مل سکتی ہے۔

گوتم بدھ

بدھ دنیا میں ایک بڑے مہاتما ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے زمانہ کے موجودہ مذہب میں اصلاح کی اور بودھ مت دنیا میں چلایا اور گمراہ شدہ لوگوں کو نیک راستہ پر لائے انکی پیدائش اور مذہبی عقیدوں کا مختصر سا حال قلمبند کیا جاتا ہے۔

خاندان اکشواکو یا گوتم نسل سے کپل وستو دیش میں ایک شاکی راجا بنام شدھودن تھا اور اس کی رانی کا نام مایا دیوی تھا۔ ان کے ہاں ایک لڑکا بنام سدھارتھ پیدا ہوا جو بعد میں بدھ یا گوتم رشی کے نام سے تمام روئے زمین پر مشہور ہوا۔ بدھ کی شادی کولی راجا کی لڑکی یشودھرا سے ہوئی۔ ان دونو کے ہاں ایک لڑکا راہولا پیدا ہوا ایک دن جب بدھ اپنے رتھ بان مسمی چنا کے ساتھ شہر کی گلیوں میں سیر کرتا پھرتا تھا اُسے مختلف اوقات میں تین مختلف حالتیں نظر آئیں۔ ایک دفعہ سڑک کے کنارے ایک بوڑھا آدمی ملا جسکا بدن ضعیفی سے خم کھا گیا تھا۔ چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور پیشانی پر فکر و غم کے آثار نمایاں تھے۔ سر سفید۔ آنکھیں چندھیائی ہوئیں اور جسم مرجھایا ہوا۔ لکڑی کے سہارے بھی بمشکل کھڑا ہو سکتا تھا۔ دوسری بار راستہ میں ایک مریض ملا جو بیماری کے مارے سسک رہا تھا۔ جس کے بدن کی حالت بگڑ چکی تھی اور درد و تکلیف کے باعث آہ و زاری کر رہا تھا۔ تیسری بار ایک مردہ لاش ملی جسکو چار آدمی کندھوں پر اٹھائے مرگھٹ کی طرف لے جا رہے تھے اور باقی آدمی پیچھے پیچھے روتے ہوئے جا رہے تھے۔ ہر حالت میں جب شہزادہ نے رتھ بان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دنیا میں صرف ان خاص شخصوں کی یہ حالت نہیں ہے بلکہ یہ تمام حالتیں دنیا کے سب لوگوں کو پیش آتی ہیں۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں۔ سب کو ایک دن فنا ہو

ہے اور اس دار ناپائدار سے رحلت کر جانا ہے۔ کوئی شخص بھی موت کے پنجہ سے نہ بچا اور نہ بچیگا۔ یہ سُنکر شہزادہ بُدھ نہایت ہی ملول خاطر ہوا۔ اور معلوم کیا کہ بس یہ دُنیا ایک سراب ہے۔ کیا مایا کا جال بچھا ہوا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس جسم کو ایک دن ضرور خاک میں ملجانا ہے۔ مگر پھر بھی لوگ بے پروائی سے اسی دُنیائے دُوں میں زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں اور عاقبت کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ ان سب باتوں سے بدھ مہاراج کی طبیعت نے یکایک پلٹا کھایا اور فوراً اُنہوں نے دُنیا کے عیش و عشرت۔ ہر طرح کی لذت۔ تمام راج پاٹ کے سکھ اور بیوی بچّوں کے آنند کو تیاگ کرکے جنگل کا راستہ لیا اور تارک الدنیا ہوکر پرم آتما حقیقی کی تلاش میں پھرتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ حالتیں ہر ایک شخص کو اس دُنیا میں اکثر بلکہ ہر لمحہ اور ہر ساعت پیش آتی رہتی ہیں اور موت کی حالت کو دیکھ کر فوراً طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے آخرت کا خیال آجاتا ہے اور دِل اُسوقت اس دنیا کے چھوڑنے پر مستعد ہو جاتا ہی اور خداوند حقیقی کی طرف رجُوع کرنے لگتا ہی۔ مگر افسوس یہ خیال مثل ایک حباب یا پانی کے بُلبلے کے ہے جو اُٹھتے ہی بیٹھ جاتا ہے۔ مثل اُس خلا کے ہے جو پرندوں کے اُڑنے سے ہوا میں پیدا ہو جاتا ہی۔ اور جہاں پرندے ہٹے اُسیوقت پُر ہو جاتا ہی۔ سمندر کے پانی میں مثل اس شگاف کے ہی جو کسی جہاز کے چلنے سے پیدا ہو جاتا ہی۔ اور جہاں جہاز آگے بڑھا اُسیوقت وُہ شگاف مِل جاتا ہی۔ یہی حال انسان کا ہی کہ وُہ دُنیا کے دھندوں میں اس قدر مستغرق ہی کہ خالقِ حقیقی اور عاقبت کا خیال اوّل تو پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چند ہی لمحہ رہتا ہی۔ بہت ہی کم شخص بُدھ جیسے خوش نصیب ہیں جو فوراً اس دُنیا کی راحت و کلفت کو چھوڑ کر سچا راستہ ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اور پھر کبھی اپنا رُخ اس دُنیا کی طرف کرنے کی آرزو نہیں رکھتے :۔

خوشا وقتِ شوریدگانِ غمش ! اگر ریش بینند وگر مرہمش

قبل مشہور ہی جو ئیندہ یابندہ - کچھ عرصہ کے بعد بُدھ جی مہاراج کو گیان ہو گیا اور اُنہوں نے چار گیان یا معرفت کے مسئلے قائم کئے۔

(۱) پہلا عمدہ گیان یہ ہے کہ دُنیا مصیبت اور غم کا گھر ہے۔ چنانچہ پیدائش یا ایام پرورش - بیماری اور موت - اِن میں سے ہر ایک شئے دُکھ سے بھری ہُوئی ہی۔ پس جس چیز کو ہم پسند نہیں کرتے اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے بھی رنج ہوتا ہے اور پھر جس چیز کو ہم محبت کرتے ہیں اس سے جُدا ہوتے ہُوئے اَور بھی زیادہ ہوتا ہی اور جو چیز کہ میسّر نہیں ہو سکتی - اُس کی خواہش رکھنے سے بہت ہی رنج حاصل ہوتا ہی۔

(۲) دُوسرا عمدہ گیان یہ ہی کہ اس تمام دُکھ یا رنج والم کا باعث خواہش یا لذت نفسانی ہے - اونکہ دکی دُنیاوی چیزیں ہماری طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور ایسی زبردست خواہش پیدا کرتی ہیں جسکو فوراً پُورا کئے بغیر انسان رہ نہیں سکتا۔ مایا رُوپی خودی یا اہنکار پیدا ہو کر دُنیا کی چیزوں میں ملکر اپنے آپ کو پرکاش کرتا ہی - پھر یہ اہنکار خوشی بھوگنے کے لئے زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہی اور دُکھ کے جال میں پھنس جاتا ہے - دُنیاوی لذتیں اور خوشیاں ایک قسم کا طعمہ ہیں اور انجام اُس کا دُکھ ہے -

(۳) تیسرا عمدہ گیان یہ ہے کہ دکھ دُور ہو جائے - جس نے خودی کو جیت لیا وہ خواہش نفسانی سے بری ہو گیا گویا اُس نے نفس امارہ کو مار لیا - اب اُسے کسی قسم کی حاجت نہیں رہی اور کوئی چیز نہیں رہی جس سے کہ یہ خواہش کا شعلہ بڑھے - پس اُسے اہنکار یا خودی کا خیال نیست و نابُود ہو جائیگا -

(۴) چوتھا عمدہ گیان وُہ طریق ہی جسکے ذریعہ یہ دُکھ درد بالکل معدوم ہو جائے - جو شخص معرفت کے سامنے اپنی خودی کو چھوڑ دیتا ہے جو مستقل ہو کر صرف ایسے کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو اُسے کرنے چاہئیں اور جسے اپنا فرض ادا کرنے کی دلی اور اعلیٰ آرزو

ہوتی ہے۔ یہی شخص نجات حاصل کرتا ہے۔ جو عقلمند شخص اس طریق پر چلیگا۔ اُسکا دُکھ جاتا رہیگا۔

یہ طریق پیراستہ ہے جو راستی پر مبنی ہے۔ (ا) فہم راست (ب) صحیح ارادے (ج) راست گفتار (د) کاروبارِ راست (ہ) جائز وسائل سے معاش حاصل کرنا (و) صحیح اور سچی کوششیں (ز) صحیح خیالات اور (ح) شائستہ سُوبھاؤ۔

عام طور پر بدھ کی تلقین کا لب لباب اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔ دیانتداری کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا۔ نیک رویہ اختیار کرنا۔ مصیبتیں اور تکلیفیں صبر سے جھیلنا۔ ہر ایک نیک کام مستعدی سے کرنا۔ نیکوں کے ساتھ ملنا جلنا اور بدوں کی صُحبت سے گریز کرنا۔ نیکی کرنا۔ بدی سے احتراز کرنا۔ طبیعت کو قابو میں رکھنا۔ نیک کام کرنے میں ہمت نہ ہارنا اور نیک اصولوں پر قائم رہنا۔

بدھ کی مبارک تعلیم کے بہت سے پیرو ہوگئے۔ اور بہت سے بڑے بڑے شخص اور بعض راجہ بھی اُنکے معتقد ہوگئے۔ انکا اصل منشا یہ تھا کہ دُنیا میں رہکر ایسا نہ ہو کہ انسان بالکل دنیاوی لذتوں اور خواہشوں میں مُبتلا رہے اور اپنے خالق حقیقی کو بالکل فراموش کر دے۔ بلکہ جہانتک ہو سکے دنیا کی خواہشوں سے بتدریج کنارہ کش ہو جائے اور نیکی خدا پرستی خدا ترسی محبت اور ہمدردی کا طریق اختیار کرے۔

اُن کے دس احکام مندرجہ ذیل تھے یعنے دس قسم کی بُرائیوں یا بدیوں سے بچنا لازم ہے۔ تین بدیاں متعلق جسم۔ قتل۔ چوری۔ زنا۔ چار بدیاں متعلق زبان۔ جھوٹ بولنا۔ بُرا بھلا کہنا۔ یا اتہام لگانا۔ گالی دینا۔ بیہودہ بکنا۔ تین بدیاں متعلق ذہن۔ طمع۔ نفرت۔ گمراہی۔

(۱) کسی کو جان سے نہ مارو۔ جان کی حفاظت کا خیال رکھو۔ یعنے اہنسا اور جیو رکشا پرم دھرم سمجھو۔

(۲) چوری نہ کرو اور نہ کسی کا مال زبردستی چھینو۔ بلکہ اس امر کے ساعی رہو کہ ہر ایک

شخص اپنی اپنی محنت کا ثمرہ خود کھائے۔

(۳) ناپاکی سے اجتناب کرو اور عفت عصمت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرو۔

(۴) جھوٹ نہ بولو بلکہ راستباز رہو۔ بے باکی سے اور صدقِ دل سے جو حق ہو ذمہ بے کم و کاست بیان کر دو۔ بقولِ سعدیؒ

راستی موجبِ رضائے خدا است کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

(۵) کسی کی نسبت بُری افواہیں اپنی طبیعت سے اختراع نہ کرو اور نہ تم ایسی باتوں کو اپنی زبان پر لاؤ۔ اپنے ہمجنسوں کی عیب گیری نہ کرو بلکہ اُن کے ہنر اور صواب کے متلاشی رہو تاکہ تم صدقِ دل سے اُنکے دشمنوں اور حرف گیروں کے برخلاف موقع پر اُنکی مدد کر سکو۔ سعدی شیرازی نے کیا خوب کہا ہے

مرا شیخ دانائے روشن شہاب دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ در خویش خود بیں مباش دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

(۶) قسم نہ کھاؤ بلکہ اپنی عزت اپنے رتبہ کا خیال رکھ کر معقول طور پر گفتگو کرو۔

(۷) بیہودہ بکواس میں وقت ضائع نہ کرو۔ بلکہ جو کام کی بات ہے وہ کہو ورنہ خاموش رہو۔

(۸) طمع نہ کرو۔ حسد نہ کرو بلکہ اور لوگوں کی خوش قسمتی پر خوشی مناؤ۔ بقولِ شاعر

طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی ازاں نیست مر طامعاں را بہی

(۹) دشمنوں سے بھی دل میں کینہ بغض اور نفرت نہ رکھو۔ ہر ایک کے ساتھ خواہ دشمن ہو خواہ دوست مہربانی اور تلطف سے پیش آؤ۔

(۱۰) جہالت کو دل سے دور کرو اور نیکی اور معرفت کا راستہ سیکھنے اور اُس پر عمل کرنے میں مستعد رہو نیکی اور راستی صدق دل سے قبول کرو۔ اور ٹھیک راستہ چھوڑ کر گمراہ نہ ہو جاؤ۔

بدھ جی مہاراج کے بہت سے چیلے جابجا ہو گئے اور یہ بھکشو کہلاتے تھے۔ اور یہ

جا بجا دھرم کا اپدیش کرتے رہتے تھے۔ اب بھی یہ مذہب دنیا میں بہت مروج ہے۔ اور اس میں دھرم اور اخلاق اور نیکی کی باتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ بھکشو لوگوں کے لئے نہایت عمدہ عمدہ قواعد بنائے گئے چنانچہ چند ہدایات دربارۂ سلوک زنان و پابندیٔ عفت جن پر ہر ایک بھکشو کو عمل کرنا لازم ہے درج کیجاتی ہیں:-

اگر کوئی بوڑھی عورت ہو تو اسے اپنی والدہ کے برابر تصور کرو۔ اگر جوان ہو تو اُسے اپنی بہن کے برابر جانو اور اگر بہت چھوٹی ہو تو اسے اپنی دختر کے برابر سمجھو۔

انسانوں میں شہوت نفسانی زیادہ ہوتی ہے اور یہ اندیشہ ناک امر ہے پس پُرجوش اور سرگرم استقلال کی کمان اور دانائی کے تیروں کے تیز نشانوں سے اس پر غالب آؤ۔

اپنے سر پر راستی اور نیکی کی زرہ پہنو اور نہایت مستعدی سے پانچوں قسم کی خواہشوں کو قابو میں رکھو یعنے پانچوں اندریوں کو بس میں رکھو۔

شہوت سے انسان کا پاک دل بگڑ جاتا ہے اور طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے۔ یہ انسان کو جہنم پہنچانے والی شے ہے۔ اس بلا کو ہرگز پاس نہ آنے دو۔

بجائے اس کے کہ بُرے خیالات تمہارے دلوں میں پیدا ہوں یا کسی عورت کو بُری نظر سے دیکھو۔ بہتر ہوگا کہ تپتی ہوئی نہایت سُرخ لوہے کی سلائیوں سے اپنی دونو آنکھیں پھوڑ ڈالو۔

بجائے اس کے کہ کسی عورت کے ساتھ رہو اور فاسد خیالات کو اپنی طبیعت میں راہ دو۔ بہتر ہوگا کہ تُند شیر کے منہ میں پڑ جاؤ یا جلاد کے تیز خنجر سے ذبح کئے جاؤ

اس سے ثابت ہے کہ بُدھ نے اپنے پیروؤں کو جنہوں نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا بُرائی سے روکنے کے لئے کسقدر سخت احکام اور فرمان جاری کئے تھے۔ ہر ایک دنیادار آدمی کو بھی انہی قواعد پر کاربند رہنا چاہئے۔

یہاں پر صرف چند باتیں بیان کی گئی ہیں ورنہ بُدھ جی مہاراج نے جو کچھ دھرم کے بارہ میں وقتاً فوقتاً تلقین کیا ہے اگر ان سب کو لکھا جائے تو اخلاق کی کئی عمدہ کتابیں

بن سکتی ہیں۔ انگریزی دانوں کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک کتاب مسمٰی "دی گوسپل او بدھ" یعنے بدھ کی مقدس کتاب جو پال کیرس نے تالیف کی ہے اور جو مقام شکاگو میں اوپن کورٹ پبلشنگ کمپنی کی طرف سے چھپی ہے اور جو لندن میں کگن پال۔ ٹرنچ۔ اور ٹربنر اینڈ کو سے مل سکتی ہے۔ اسکی چھٹی ایڈیشن ۱۹۰۸ء کو بغور پڑھیں اور حظ اٹھائیں۔ اس مضمون میں اکثر باتیں اسی کتاب سے اقتباس کر کے لکھی گئی ہیں۔ آج کل کے نوجوانوں کے لئے اس کا پڑھنا نہایت مفید ہوگا کہ اس سے اُن کی طبیعتیں رُوحانی دنیا کی طرف زیادہ میل کرینگی اور بد اپیل سے بلند نیکی کی طرف رجوع ہونگی۔

بدھ جیسے ریفارمروں کی دنیا میں بہت کچھ ضرورت ہے۔

م۔ ل

ایذائے حیوانات

احباب میں اپنے اُسے شامل نہ کروں گا
اطوار خجستہ ہوں کہ فہمید ہمیں ہو

۔۔۔ اُن کے ضرورت کوئی مجبور کرے جو ق
روندے کسی کیڑے کو جو ہو راہگذر میں

غفلت کا قدم ایک کچل سکتا ہے جھینگر
جو وقت پئے رہگذر عام ہیں رینگے

۔۔۔ گی شرافت جسے وہ آگہی پا کر ق
ٹک ہٹ کے چلیگا اُسے مرجانے نہ دیگا

اک رینگتا کیڑا جو ہو مکروہ نظر میں ق
جو سانپ ہی شاید ہو بھرا زہر ستم سے

آجائے اگر ملنے کو بن پوچھے پچھائے
خاموشی و آرام کی پاکیزہ جگہ میں

اور ہاتھ سے اک شخص کے مرجائے تو مرجائے ق
الزام نہیں امر ضروری میں کسی پر

ایسا نہیں" جب اپنی ہی خاص حدوں کے اندر ق
بے جُرم و خطا پھرتے ہیں وہ کھانے ہوا کو

حق انکا وہاں ہے وہ ہیں مختار وہاں کے
جو اُن کو ستاتا ہے وہ ملزم ہے گنہ کا

دخل اپنے تئیں دیتا ہے فطرت کی نسق میں
جس نے اُنہیں رکھا ہے کسی اپنی غرض کو

(ترجمہ از ولیم کوپر) (نذیر حسین احمد انبالوی)

تبادلۂ خیالات

(از مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر)

حِسّی۔ حسّاسی بصر۔ سمع۔ خیال۔ غور اور قیاس سے متعلق ہو۔ بہت سے واقعات کو ہم نظری اور حسّی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ اور اکثر کو خیالی اور قیاسی طریق سے کوئی سا طریق ہو۔ ہر ایک حالت اور ہر ایک طریق عمل میں بالاحساس تبادلہ خیالات کا ہوتا رہتا ہے۔ ایک حالت کے احساس کے ساتھ ہی ہمارے رگ و پے میں ایک قسم کی حرکت طاری ہوتی ہے۔ اور ہم اپنے دل میں ایک نئی قسم کا جوش پاتے ہیں۔ اس حرکت اور اس جوش سے ہم واقعی ایک طاقت اور ایک عمل حاصل کرتے ہیں۔ وہ جدید طاقت یا وہ جدید عمل ہمارے دماغ پر بمقابلہ دیگر محصولہ صورتوں کے ایک اور ہی اثر کرتا ہے جو اپنی ذات میں متمیز ہوتا ہے۔ یہی صورت اور یہی حالت ایک حسّی تبادلہ ہے۔ ہر ایک قسم کا احساس ایک قوی الاثر عمل ہے اور وہ قریبًا ہر ایک طاقتِ انسانی سے وابستہ ہے۔

لمسی۔ ہم بہت سی حالتیں اور کیفیتوں کو قوتِ لمس سے پاتے اور دریافت کرتے ہیں اور اس عمل سے تبادلۂ خیالات صورت پذیر ہوتا ہے۔

وجودی۔ وجودی تبادلہ وہ ہے جو بحیثیت ایک وجود یا ایک حس کے عمل پذیر ہو خواہ وجود محسوس بالوجود ہو اور خواہ محسوس بالمعقول۔ اس قسم کا تبادلہ ناگہانی یا اتفاقی نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ارادی۔ ہم ایک خیال کو ایک دوسرے شخص کے روبرو بحیثیت ایک کلیہ یا ایک مسئلہ کے پیش کرتے ہیں اور اسکو بدلائل مناتے ہیں۔ یہ ایک وجودی تبادلہ

ہے۔ ایک چیز یا ایک شے کسی شخص کو دیتے اور اس سے کوئی اور شے پاتے ہیں۔ یہ ایک حسی تبادلہ ہے۔ ان دونوں صورتوں میں انسان کے دل و دماغ پر ایک فوری اثر ہوتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اثر کس قدر عرصہ تک قائم رہے۔

خیالی۔ تبادلہ کی یہ قسم باعتبار ایک عام اصول کے تمام قسم کے تبادلوں پر حاوی ہے۔ کوئی قسم لیجاوے وہ تخیل کے عمل سے خالی نہ ہوگی گویا یہ شق تمام اقسام کی جامع ہم نے اوپر تشریح نہیں کی ہر اس شق میں کئے دیتے ہیں کہ تبادلہ بلحاظ ذہنی قوتوں کے مندرجہ ذیل صورتیں رکھتا ہے۔

اتفاقی ۔

ارادی ۔

اتفاقی وہ حالتیں ہیں جو ناگہاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ہم عام طور پر بلا کسی تخصیص کے جو کچھ دیکھتے اور جو کچھ کہتے سنتے ہیں۔ یہ سب اتفاقی حالتیں ہیں جب ہم ارادتاً کوئی بحث کرتے یا معلومات بڑھاتے یا کسی امر کی تفتیش اور ادراک میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ ایک ارادی صورت ہے۔

ان صورتوں کے سوائے کہ جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ یہ شق وہم اور ظن پر بھی حاوی ہے۔ خیالی حالتوں سے خیالات کا اظہار ہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ ظنی اور وہمی صورتیں بھی مزعوم ہیں۔

اگرچہ دنیا میں ہر ایک قسم کے تبادلہ کی ضرورت اور وجود پایا جاتا ہے لیکن اس بحث میں ہماری اعلیٰ غرض خیالی تبادلہ سے ہی ہے۔ درحقیقت تبادلہ خیالات سے ہی انسانوں کی معاشرت اور معاد پر ایک غیر محدود اور قوی اثر پڑتا ہے۔ گو ہم نے اس شق کو خیالی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مگر دراصل یہ حقائق کا تبادلہ ہے۔

دیکھیے اب ہماری بحث کا رخ بدل گیا اور اس تبدیلی سے ہم یوں کہیں گے کہ دنیا کے

حقائق۔ عمدگیاں۔ اور غیر عمدگیاں۔ تبادلۂ خیال کے ذریعہ سے خواہ وہ کسی قسم سے ہی کیوں نہ ہو۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ میں اتفاقی یا ارادی طریق سے منتقل ہوتی ہیں۔ اور صرف تبادلۂ خیال ہی اس انتقال کا قوی باعث ہے۔

حقائق ہمیشہ اِدھر اُدھر آتے جاتے اور تبادلہ پذیر ہوتے ہیں اور اس تبادلہ کی وجہ سے ملکوں اور قوموں میں شائستگی اور تہذیب یا خرابی اور نقص کی بنیادیں پڑتی ہیں۔ یہ بحث طلب ہے کہ انتقال حقائق یا تبادلۂ خیالات کی صورت عملاً کیونکر واقعہ ہوتی ہے۔

اس کی یہ صورتیں ہیں۔

(الف) انسانوں کا اختلاط اور میل جول۔

(ب) سیاحت یا سفر۔

(ج) تجارت۔

(د) مذہب۔

(ہ) حکومت۔

انسان ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہیں کوئی سیاحت اور سفر کے ذریعہ سے مختلط ہوتا ہے اور کوئی تجارت اور حکومت یا مذہب کے وسائل سے اثر ڈالتا ہے۔ یہ سب حالتیں بجائے خود قوی الاثر ہیں۔ زبردستی اور جبر سے اوّل تو کوئی تبادلہ خیالات ہوتا نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کا اثر اور اُس کی بنیاد بہت ہی کمزور اور بودی ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے قوموں کی تاریخی حالتوں کو غور کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ جبری تبادلۂ خیالات کا اثر آخر کس حیثیت سے ظاہر ہوتا رہا ہے اور وہ کہاں تک موثر ثابت ہو چکا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ بعض دفعہ حکومتیں

بعض خیالات کو منوالیتی ہیں اور مذہبی جوش کا اثر ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی حالتوں کو قیام اور ثبات نصیب نہیں۔

وہی تبادلۂ خیالات قوی الاثر ثابت ہوتا ہے کہ جو بلا کسی جبر اور جوش کے بتدریج ہوتا چلا جاوے۔ ایسی حالت میں لوگوں کو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ اُن کے دلوں اور دماغ میں کیا کچھ صورتیں اور نقوش منعکس ہو رہے ہیں۔ مخلوق خدا میں باہمی نفرت محبت عداوت۔ بیزاری کی گرم بازاری چلی جاتی ہو مگر تبادلۂ خیالات کی حکومت کا سکہ ایک دلاویزی اور خاموشی کے ساتھ کس و ناکس اور نافروشائی کے دل و دماغ پر جمتا چلا جاتا ہے۔

قومیں ایک دوسرے سے نفرت کرتی اور فرقے ایک دوسرے کو بُرا سمجھتے ہیں لیکن جن حقائق اور جن خیالات کو اُن کے دلوں اور انکے دماغوں اور اُن کے وطن اور اُن کے ملک پر پھر اثر ڈالنا ہے۔ وُہ ایک خاموشی اور سلامت روی سے موثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

(۵) لوگ ایک دوسرے کو مطعون کرتے اور بری نظروں سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک کا جادو دُوسرے پر نہ چل جاوے۔ ایک دوسرے کا معمول نہ ہو سکے۔ یہ سیلاب روکنے سے رُکتا نہیں۔ دنیا اپنی دُھن میں لگی رہتی ہو اور تبادلۂ خیالات کی بجلی چپکے سے اپنا کام کرتی جاتی ہو۔

ہر زمانہ میں قوموں۔ نسلوں۔ لوگوں نے تبادلۂ خیالات کی اثر پذیری سے نفرت ظاہر کی تھی اور اس عمل کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا مگر زمانہ نے اپنی چال نہ بدلی۔ آخر ثابت کر کے دکھا دیا کہ تبادلہ ہو کے رہنا تھا۔ یہ ایک شدنی تھی۔

دل۔ دماغ۔ زبان سب اُسی رنگ میں رنگے گئے۔

تاجروں۔ سیاحوں۔ حاکموں۔ اور فاتحوں نے کوششیں کیں کہ مفتوحہ قوموں کے

مفتوحہ قوموں مفتوحہ نسلوں مختلطہ لوگوں نے
ثار اور خیالات اُن پر موثر نہ ہوں ۔ لیکن جن جن خیالات کا عکس پڑتا تھا
ہتیرے زور مارے کہ اس رو سے محفوظ رہیں ۔ قوموں اور فرقوں نے مخصوص فرقوں کو جدا کر کے بھی دیکھ لیا تب بھی
پا کے ہی رہا ۔
یہ ہوا نہ رُکی ۔

رُکتا نہیں ہو کبھی ہا ایں قربند
بے قید ہیں پائے طلب علم و کمالات

شہروں کے نقشے ۔ آبادیوں کے نمونے ۔ لباس کی تراش خراش ۔ لوگوں کی
چال ۔ ڈھال ۔ نشست برخاست ۔ میل جول ۔ امنگ اور آرزو یہ سب چیزیں کہے
دیتی ہیں کہ تبادلہ خیالات کے اثرات نے کہاں تک نفوذ کیا ہے اور کس عمدگی و خاموشی سے
دیار قلوب پر یہ اثر اور یہ عمل ہو رہا ہے ۔ مان لیا جاویگا کہ کسی پہ کم اور کسی پر زیادہ
لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ کم و بیش معمول ہر ایک پر ہے ۔

(۲) تبادلہ خیالات یا انتقال حقائق نہ تو ہمیشہ سود مند ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی نا سود مند
تبادلہ یا انتقال ایک حقیقت کی حقیقت یا ایک امر کی اصلیت کو تبدیل نہیں کرتا جس حیثیت
اور جس حقیقت سے کوئی حقیقت ہوتی ہے اسی حیثیت سے منتقل ہوتی ہے ۔ ہاں یہ دوسرا امر
ہے کہ اس کی اصلیت کو باسباب دیگر اور حالت پر لایا جاوے ۔ جیسے ہم نے یہ کہا تھا کہ
تبادلہ خیالات درحقیقت حقائق کا تبادلہ یا انتقال ہے ۔ ایسے ہی یہ کہا جاویگا ۔ کہ
ایسا تبادلہ یا ایسا انتقال اکتساب حقائق ہے ۔ ہم ہمیشہ اتفاقی یا ارادی طریق
پر اوروں سے خود کچھ سیکھتے اور انکو کچھ سکھاتے بھی ہیں ۔

معیار تبادلہ ۔ یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ ایسے تبادلہ خیالات کا باعتبار سود مندی
یا ناسود مندی کے معیار کیا ہے ۔ ہماری رائے میں تحقیق حق کے واسطے جو جو اصول اور
ضوابط عام طور پر مقرر ہیں ۔ وہی تبادلہ خیالات کا معیار بنا سکتے ہیں ۔
تبادلہ خیالات کی کیفیت اس امر کی مستلزم نہیں کہ ہم سرسری طور پر یا ایسے تبادلہ

ساتھ ہی ایسے خیالات مبتذلہ کے تسلیم کرنے کی آمادگی ظاہر کریں یا اُن سے محترز ہوں ہمیں ضرور ہے کہ اُسی ضابطہ اور اُسی قاعدہ سے اُنکو بھی دیکھیں اور پرکھیں جو ضابطہ اصولاً تحقیقِ حق کے لئے مرعی ہے۔

ہم اپنے سلسلۂ زندگی میں اکثر تغیرات کو دیکھتے اور اکثر تبدلات کو پاتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اکثر ہوائیں آتی اور ہمیں چھُو کر گذر جاتی ہیں۔ کیا یہ ضرور نہیں ہے کہ ہم اُن سب کو غور کی نگاہوں سے دیکھیں اور سودمندی یا ناسودمندی کے اعتبار سے اُن کا خیر مقدم کریں یا اُن سے بچیں اور سوچیں کہ اُن میں سے کون حالت یا کون کیفیت مناسب ہے اور کون نامناسب۔

وہ شخص جو ایک شاہراہ پر بیٹھے بیٹھے تمام گذرنے والوں کو ہی اپنا رفیق یا حریف قرار دیتا ہے وُہ اپنے اور اپنے حالات کے واسطے سچا فیصلہ نہیں کرتا۔ وُہ اپنی زندگی کو ایک جھمیلے میں ڈالتا اور اپنے اغراض کو گرداب ناکامیابی میں دھکیلتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اُن گذرنے والوں سے کون اس کی طبیعت اور اُس کے حالات کے موافق ہے اور کس کو اُس سے مغائرت اور منافرت ہے کیا ایسا جلد باز یہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں نے تمیز سے کام لیا ہے۔

ہم ہمیشہ سُرعت سے خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ہمارے دماغ سے کچھ خیالات دوسرے دماغوں میں حلول کرتے ہیں اور کچھ دوسرے دماغوں سے نکل کر ہم میں آتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جو کچھ پاتے ہیں اُسے میزانِ عقل میں وزن کرنے کے بعد قبول یا رد کریں اور محکِ سودمندی اور ناسودمندی پر پرکھیں۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جو جو خیالات یا جو جو آثار اوروں سے لئے جاتے ہیں۔ وہ بہیئتِ مجموعی حقائق کا درجہ رکھتے ہیں یا وہ حقیقتاً حقیقت سے معرا محض ہیں۔

بہت سے خیالات اس قسم کے ہم اوروں سے پاتے ہیں مگر وُہ اپنی ظاہری چمک

ونگ کے اعتبار سے فی الواقع خوشنما ہیں۔ حقیقت الامر میں گو وُہ اَوروں کے حق میں گو سود مند ہوں لیکن ہمارے کوائف کے مخالف ہوتے ہیں۔ اُن کی خوش نمائی تو ہمیں اُنکے اخذ پر مجبور کرتی ہے لیکن اپنے کوائف کی مخالفت مانع ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں پُورے حزم و احتیاط اور تامل سے کام لینا چاہیئے۔ اگر ہم بلا غور مزید انکو اپنا دستور العمل بنائینگے تو یقیناً ہمیں ایسے ناسُود مند عمل سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور ہم ایک ایسی راہ اختیار کرینگے جو ہماری منزلِ مقصود کو نہیں جاتی ہے۔

(۸) عام اصُول کے لحاظ سے ہمارے خیال میں ہر ایک مندرجہ خیال کی سود مندی اور ناسود مندی کا معیار مندرجہ ذیل امور ہو سکتے ہیں۔ اگر ان امُور کے لحاظ سے اُن کا اخذ یا ترک عمل میں آویگا تو ہمیشہ کامیابی کا پلّہ بھاری رہیگا۔

(۱) اس کی ضرورت۔

(۲) اپنی موجودہ حالت سے مقابلہ۔

(۳) اس کی حقیقت اور اس کا ثبوت۔

(۴) اس کی وسعتِ سود مندی۔

ہم تبادلہ میں اَور دل سے یہ خیال لیتے ہیں کہ ہماری طرز معاشرت اس اصُول پر پہنچنی چاہیئے اور ہماری طرز زندگی ان لوازمات سے زیادہ تر مفید اور روشن ہوسکتی ہی اس سے پہلے کہ ہم ان تازہ اصُولوں پر عمل کریں۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ انکی ہمیں ضرورت کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہماری پہلی یا موجُودہ طرز معاشرت کیسی ہے۔ اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کا ثبوت کیسی دلائل اور کن واقعات پر مبنی ہے۔ وُہ بلحاظ اپنی سود مندی کے کیسے اصُول ہیں۔

اگر ان مراتب کے اعتبار سے وُہ پُورے اتریں تو اُن کے اختیار کرنے اور معمُول بنانے میں کوئی قباحت نہیں اور اگر ان شرائط کے منافی ہیں تو اس اخذ

فضول کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بحث کہ وہ اوروں یا بعض دیگر افراد کے واسطے اچھے اور سودمند ہیں ایک دوسری بات ہے۔ بہت سی حالتیں اوروں کے مناسب حال ہیں لیکن ہمارے لئے اُن کا وجود اور ان کا عمل موزوں نہیں ✦

جنّت الفردوس

(ماں بچے کا مکالمہ)

بچہ۔ پیاری اماں! میں اکثر تمہیں جنّت الفردوس کا تذکرہ کرتے سنتا ہوں۔ تم وہاں کو مسکن مسرت و شادمانی مجسم نام دیتی ہو۔ آہ۔ وہ وادی پُر بہار کہاں ہے؟ کیا ہم اُسے تلاش نہیں کر سکتے۔ کیا ہم اُسے گریہ و زاری۔ شیون و بکا۔ نالہ و فریاد سے حاصل نہیں کر سکتے؟ کیا یہ وہاں ہے جہاں نارنگی کے شگوفے کھل کر تمام گرد و پیش کو عطر آگین بنا دیتے ہیں اور جہاں کرم شب تاب کی چمک مسرت بخش دلربا ہوتی ہے۔

ماں۔ نہیں۔ میرے لختِ جگر وہاں نہیں۔

بچہ۔ کیا یہ وہاں ہے جہاں کھجوروں کے درخت آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور اپنا لطیف و لذیذ پھل اہل عالم کے لئے مہیا کرتے ہیں یا سمندر کے اُن دلآویز اور خوشنما جزیروں میں جہاں لہلہانے والے نظر فریب سبزہ زاروں میں نسیم عنبر شمیم ہر چہار طرف اٹکھیلیاں کرتی ہے اور عجیب و غریب پرندے اپنے سنہری دلفریب پروں پر اُڑتے ہوئے اپنی اپنی دلکش راگنیاں گا کر چمنستانِ قدرت کے گل چینوں کو محوِ حیرت بناتے ہیں۔

ماں۔ نہیں اے جانِ مادر وہاں نہیں۔

بچہ۔ کیا یہ اُن نامعلوم طبقاتِ ارض میں ہے جہاں کہ دریا ریگِ زر پر لہریں لیتے ہیں۔ جہاں یاقوتِ احمر ہیرے سے چمکتا ہے اور الماس بے بہا بکثرت پایا جاتا ہے یا وہاں جہاں ساحلِ مرجان پر گوہر یکتا اپنی دلکش چمک دکھاتا ہے۔ ہاں پیاری اماں بتاؤ کیا گلزارِ جناں وہی ہے۔

ماں۔ اے میری روح وہاں نہیں۔ انسانی آنکھ نے کبھی اس کے دلکش نظاروں کی سیر نہیں کی۔ کسی کان نے بھی وہاں کے ترانہائے شادمانی کو نہیں سنا۔ اس راحت افزا مقام کا نقشہ تک بھی ہم اپنے خواب و خیال میں نہیں لا سکتے۔ غم اور موت کا وہاں کوئی کام نہیں۔ خوف و ہراس وہاں سے کوسوں بھاگتے ہیں۔ یاس و ناامیدی کا وہاں کچھ پتہ نہیں۔ کوئی ایسی

متروک الفاظ

(۳)

ہم نے پہلے ہی بیان کر دیا ہو کہ کسی لفظ کا ترک کرنا صرف اُسوقت جائز ہوسکتا ہو جبکہ اس کے حروف میں کسی قسم کا ثقل موجود ہو۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو نے اپنے دیوان میں "آنسوؤں" کی بجائے "انجھواں" استعمال کیا ہو۔ اسکا ترک کرنا بالکل بجا ہے کیونکہ "انجھو" سے "آنسو" کہیں زیادہ سبک و لطیف ہو۔ لیکن اسی بنا پر "کبھو" یا "کسو" کو چھوڑ دینا بڑی غلطی ہو۔ "کسو" اور "کسی" میں سوا اس کے اور کچھ فرق نہیں ہو کہ ایک میں حرف سین مضموم ہو۔ اور ایک میں مکسور کیونکہ "و" اور "ی" کا فرق تو اسی اختلاف حرکات کا نتیجہ ہے۔ اور یہ فرق کوئی بڑا فرق نہیں ہو کیونکہ اس سے سلاستِ لفظ میں ذرا بھی ترقی نہیں ہوتی۔ اور جب یہ نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان الفاظِ قدیم کو چھوڑ کر اپنی زبان کو اُن کے استعمال سے محروم کر دیں۔

میری رائے میں "کبھی" اور "کسی" کے ساتھ "کبھو" اور "کسو" کا بھی استعمال ضرورت کے موقعوں پر جائز ہونا چاہیے۔ مثلاً مطلعہائے غزل میں اس قسم کے قوافی کی اکثر ضرورت پڑتی ہو۔ اور ایسی حالتوں میں صرف متروک ہونے کے لحاظ سے ان الفاظِ عزیز سے اِحتراز کرنا اُنپر بڑا ظلم ہے۔

میر صاحب کے زمانہ سے لیکر مومن و غالب و بعض شاگردانِ مومن تک انکا استعمال بہت عام تھا لیکن شیخ ناسخ کی زور از وریوں نے یہ بہت بُرا کیا کہ خواہ مخواہ اِن غریبوں کو نکال باہر کیا۔

میر صاحب کے شعر کی بیساختگی دیکھنا۔ فرماتے ہیں ؎

دِل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا تاکنا جھانکنا "کبھو" نہ گیا

مصحفی کے مطلع بھی مُلاحظہ ہوں۔ کہتے ہیں ؎

خطرا ہے مجھے اِس دِلِ کمبخت کی خو سے ڈرتا ہُوں کہ ہو جائے محبت نہ "کسو" سے

؎

رات پردے سے ذرا منہہ جو "کسو" کا نکلا شعلہ سمجھا تھا اُسے میں پہ "بھبھوکا" نکلا

جرأت کا اندازِ درد بھی شنیدنی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

بیکس وُہ ہوں کہ نکلی نہ حسرت "کبھو" مری ہوگی بعد مرگ مجھے آرزو مری

میرزا غالب کا اندازِ بیان سب سے نرالا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھدیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بیحوصلگی سے یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد "کسو" کی

مومن مرحوم کا شعر ہے۔ ؎

کون کہتا ہے دمِ عشق عدو بھرتے ہیں کہ ہوا باندھنے کو آہ "کبھو" بھرتے ہیں

مرقومہ بالا اشعار میں ایک قسم کی بدگمانی ستم پرور کی گنجائش ہے یعنے اس بنا پر کہ ان الفاظ کے حسن کی دلنشینی کا ایک یہ بھی سبب ہو سکتا ہے کہ اوّل وُہ مطلعہائے غزل میں واقع ہوئے ہیں۔ دوم اُنھوں نے ایک پُر لطف و نازک ضرورت یعنی ضرورت قافیہ کو رفع کیا ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مطلعوں کو چھوڑ کر متفرق اشعار میں بھی جہاں کہیں انکا جلوہ نظر آتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ محبوبی بھی اُن کے قدموں پر پڑی لوٹتی ہے۔ تو ہمیں مجبوراً اُنکا مستانفش ہونا پڑتا ہے۔

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

کیا کہوں دن کا کسو سے قصۂ آوارگی   کوئی بھی بے ربط ہوتی ہی کہانی اس قدر

مصحفی لکھتے ہیں ؎

اُس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات   غنچے نے مسکرا کے کہا ہم نے پائی بات
وہ مجھ سے ان دنوں میں جو کچھ بولتا نہیں   شاید کسو نے جا کے اُسے کچھ لگائی بات

میر حسن مرحوم صاحبِ مثنوی کے شعر میں قیامت کی دلچسپی ہی۔ کہتے ہیں ؎

شبِ وصلِ صنم ہی آج اے ہمدم کسو ڈھب سے   گریبانِ سحر کو ٹانک دیجو دامنِ شب سے

معترض صاحب فرمائینگے کہ ان اشعار میں اگر "کسو" کی بجائے "کسی" ہو تو کیا حرج ہے۔ اور حسرت وارفتۂ سخن عرض کریگا کہ صاحب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ نقص کیا ہوگا اور حرج کیا لیکن یہ میرا عقیدہ ہی کہ ان میں "کسو" کی بجائے "کسی" لانے سے وہ لطف نہیں باقی رہیگا۔ نہیں رہیگا۔ ہرگز نہیں رہیگا۔

اصل یہ ہی کہ آفرینندۂ سخن نے نظم کے دل میں نہیں معلوم ایسا کیا مادہ رکھدیا ہے کہ اُسی پُرانے الفاظ سے کچھ ایسی محبت ہوتی ہی۔ جسکا بیان تحریر و تقریر سے ناممکن ہی۔ اس کا ثبوت ہر ملک کی نظم میں ملتا ہی۔ اور اِس لئے زبانِ اُردو بھی اِس قاعدہ کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہوسکتی۔

حسرت موہانی

رُوئے زمین کا سفر

اگر کوئی شخص تمام رُوئے زمین کا دَورہ ازراہِ بحری کرنا چاہے۔ تو اُسکو جنوبی سمندروں کے راستے سفر کرنا پڑیگا وُہ جہاز جو انگلستان سے روانہ ہوگا۔ بحرِ ظلمات سے گذر کر راس امید ہوتا ہوا بحرِ ہند میں داخل ہوگا اور وہاں سے آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ ہوتا بحرالکاہل جنوبی کی وسیع شاہراہ طے کرتا بحر ظلمات کی تھپیڑیں کھاتا پھر جزائر برطانیہ میں واپس آجائیگا۔ چونکہ اس سفر میں صعوبتہائے شاقہ اور تکالیف مالایطاق کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جابجا قیام کرنے کی وجہ سے بہت سے وقت کا بھی خون ہوتا ہے لہذا ہم ایک اور راہ سے اسی سفر کو طے کرتے ہیں۔ یہ سفر لورپول سے شروع ہوتا ہے۔ جسکو انگلستان کا تجارتی دارالخلافہ کہنا بجا ہے۔ اس شہر کی حیرت انگیز ترقی اُنیسویں صدی کا ایک معجزہ ہے سنہ ۱۷۰۱ء میں یہ شہر صرف ایک چھوٹا سا بندرگاہ تھا جس میں آٹھ ہزار باشندوں کی آبادی تھی۔ ایک صدی کے اندر اندر اس کی آبادی ...،، ہوگئی۔ اور آجکل اُس کی آبادی سنہ ۱۷۰۱ء کی آبادی سے قریب قریب نوّے گُنا ہے۔ جزائر برطانیہ میں یہ دُوسرے درجہ کا شہر ہے۔ مگر تجارتی بندرگاہ کی حیثیت سے دُنیا میں یہ اپنا نظیر آپ ہی ہے۔ اس کی لنگرگاہیں سات سو ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہیں اور اِس کے گھاٹ سترہ میل تک چلے گئے ہیں۔

ہمارا جہاز لورپول سے روانہ ہوکر مُرغ آبی کی طرح سطحِ سمندر پر فراٹے بھرتا چلا جارہا ہے دھیمی دھیمی ہوائیں بادبان سے شوخیاں کر رہی ہیں۔ بحر ظلمات کی لہریں ہمارے قدم لے رہی ہیں۔ نظارہ کچھ ایسا دلکش اور دلفریب ہے کہ آسمان بھی کچھ عرصہ کے لئے اپنی سرد مہری بھلا بیٹھا ہے اور لب ہائے اشتیاق جُھکا کر سمندر کی پیشانی پر بوسہ دے رہا ہے الغرض ہمارا جہاز بحرِ ظلمات کی پُر خمار موجوں کو نیچا دکھاتا نو روز کی مسافت کے بعد نیویارک

میں لنگر ڈالتا ہے۔ دریائے ہڈسن اس شہر پر دانت پیس پیس کر رہ جاتا ہے اور جب کچھ پیش نہیں چلتی تو بحر ظلمات کی ظلمت میں گود کر فنا ہو جاتا ہے۔ یہ شہر ایک جزیرہ پر آباد ہے جسکا رقبہ ۲۲ مربع میل ہے۔ اس گوشۂ عافیت پر کھڑا ہو کر یہ شہر دریائے ہڈسن کے پیچ و تاب کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے اور بحر ظلمات کی موجوں پر طعنہ زن ہوتا ہے جو اپنا سر اسکے قدموں پر ٹکرا ٹکرا کر رہجاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اس شہر کو بحر ظلمات کی ملکہ کہیں تو بجا ہے۔ یہ شہر مغربی دنیا کا لورپول ہے۔ ممالک متحدہ کے مشرقی کنارہ پر نیویارک واقع ہے اور مغربی کنارہ پر سان فرانسسکو۔ ان دونوں شہروں کو پیسفک اینڈ اٹلانٹک لائن ملاتی ہے۔ یہ عظیم الشان لائن ۳۳۱۵ میل لمبی ہے۔ نیویارک سے سوار ہو کر ساڑھے چھ دن شبانہ روز سفر کرنے کے بعد سان فرانسسکو پہنچ سکتے ہیں۔ اس سفر میں ہر قسم کے سین نظر آئینگے۔ نباتات کے مختلف منطقوں اور تہذیب و شائستگی کے ہر طبقہ میں سے ہو کر گذرنا پڑیگا کہیں دیکھینگے کہ سینکڑوں میل تک سرسبز و شاداب کھیت ہماری نظروں کے سامنے اڑے چلے جاتے ہیں۔ کہیں ریل اُن وسیع غیر مزروعہ گھر سے بھرے میدانوں میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ جو سوائے امریکہ کے اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ کہیں میلوں سنگلاخ زمین چلی گئی ہے۔ کبھی ریل بلند ہوتی ہوتی ایک خال بدنما کی طرح کسی پہاڑ کی پیشانی پر نمایاں ہوتی ہے اور پھر گویا اس گستاخی کے پاداش میں سر عجز خم کر کے عمیق گھاٹیوں میں اپنی پستی پر آہ جگر سوز بھرتی چلی جاتی ہے۔ کوہ راکی کی بلند عزلت گاہ بھی اس مرکب آہنی کے جولانگاہ ہونے سے محفوظ نہ رہی۔ ایک مقام پر تو ریل سطح سمندر سے ۸۲۴۲ فیٹ کی بلندی تک اُونچی ہوگئی ہے۔ اس سے زیادہ بلندی پر ریل آج تک دُنیا کے کسی حصہ میں نہیں گئی۔ ان بلند مقامات میں ریل کو برف سے محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط شہتیروں کی سلامی دار چھت بنائی گئی ہے۔ بعض مقامات پر پہاڑ کو برما کر سڑک بچھادی ہے۔ اس طرح میلوں تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم سرنگ میں سفر کر رہے ہیں۔

اس لائن کے چار بڑے حصّے ہیں - پہلا حصّہ نیویارک سے شکاگو تک جاتا ہے - شکاگو اضلاع غربی کا تجارتی مرکز اور نیویارک سے ۳۰ گھنٹہ کی مسافت پر جھیل میچیگن پر واقع ہو اس شہر کی ترقی نیویارک کی ترقی سے بھی کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے - ۱۸۴۰ء میں اس کی آبادی محض ۵۰۰۰ متنفس کی تھی لیکن ایک ہی پشت کے اندر اندر اس کی آبادی تین لاکھ کی ہوگئی - دُنیا بھر میں اس سے بڑھ کر غلہ اور لکڑی کی منڈی کوئی اور نہ تھی مگر افسوس زمانہ کی نظرِ بد نے اس شہر کو محفوظ نہ رکھا - ۱۸۷۱ء کی آتش زدگی نے ماسکو کی آتش زدگی کو بھی بھلا دیا - اس سے اس شہر کا ایک تہائی حصّہ جل کر خاک سیاہ ہوگیا

دُوسرا حصّہ ۵۰۰ میل لمبا شکاگو اور اوماہا کو وصل کرتا ہو - لائن کے اس حصّے پر بہت سے خوشنما قریے اور شہر واقع ہیں جن کی ترقی اور شوکت کا زمانہ دامنِ استقبال میں پوشیدہ ہو - اسی راہ میں کوئلے کی بڑی بڑی کانیں اور غلّہ کی منڈیاں نظر پڑینگی جو اس سرزمین کی آئندہ ترقی کی ضامن ہیں - اس حصّہ میں سب سے زیادہ مشہور شہر برلنگٹن ہو جو دریائے مسپی کے کنارے پر آباد ہے - اوماہا دریائے مسوری کے مغربی کنارے پر واقع ہو - اس شہر کی ابتدا ۱۸۵۴ء میں ہُوئی - لیکن اس مدّتِ قلیل میں ہی اس کی مردم شماری ۲۵۰۰۰ تک پہنچ گئی - ہماری رائے میں عنقریب وُہ زمانہ آنیوالا ہے کہ اضلاع غربی اس پر ناز کرینگے -

اوماہا سے مغرب کیطرف وسیع سبزہ زاروں کی سرزمین ہو جنکو پریری کہتے ہیں - سبزۂ زمردین ان میدانوں کی وسعت وشادابی پر لوٹا ہوا ہے - اس سبزے کی دلفریب ادائیں اور جابجا ہوا کے جھونکوں کی پھُولوں سے دست بازیاں دل پر وُہ عالمِ سرور پیدا کرتی ہیں جسکے بیان سے زبانِ قلم عاجز ہے - عروسانِ سبزہ زار اپنے خوابِ ناز سے بیدار ہوکر ہمہ تن چشم بنی نگاہِ شوق سے ہماری آمد آمد کے انتظار میں سرو قد استادہ ہیں - جب ہمارا مرکب دُخانی اس دلفریب منظر کے اشتیاق میں ہانپتا

اور خوشی کے نعرے بلند کرتا قریب پہنچتا ہے تو بفحوائے الحیاء من الایمان۔ دوشیزگانِ عفت پناہ عصمت کدۂ لم یزلی اپنا سر مارے شرم کے جھکا لیتی ہیں اور مقنعہائے اطلسین سروں پہ ڈال کر سبز آنچل کی آڑ سے جھانک جھانک کر دیکھتی ہیں۔ نسیم سحری پر تاکید ہے کہ جا جلد جا اور خوشبوؤں کی کشتیاں ان رہ نوردانِ عزلت کدۂ قدرت پر نثار کر۔ اے صلِ علیٰ ان جھونکوں نے دشت و بیابان۔ کوہ و صحرا سب کو معطر کر دیا۔ اے نازپروردگانِ آغوشِ تنہائی و اے پردہ نشینانِ قصرِ زمردین۔ سچ بتا دو یہ آئینِ مسافر نوازی تم نے کہاں سے سیکھے۔ ان کم سخن نازنینوں کی خاطر و مدارات کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔ سبزہ ہے کہ ایک طرف بچھا چلا جاتا ہے۔ نغمہ سرایانِ قدرت ہیں کہ لحنِ داؤدی میں ترانہائے خیر مقدم گا گا کر ہم پر نثار ہو رہے ہیں۔ آہوانِ خوشخرام کی ڈاریں ترچھی نگاہیں پھینک پھینک کر اچھلتی کودتی چوکڑیاں بھرتی چلی جاتی ہیں۔ البتہ دریا ہماری مداخلت بیجا سے مکدر و نالاں دشت و بیابان کو اپنی شکوہ و شکایت کی داستان سناتا چلا جاتا ہے۔ ناگاہ بادِ صرصر کی تھپیڑوں نے اُس کی زبان درازیوں کے پاداش میں اُس کا نقشہ بگاڑ دیا۔ اب نہ وہ جوش ہے نہ خروش اپنے کئے پر پشیمان اور اپنی بے آبروئی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا عرقِ ندامت میں ڈوبا مہرِ سکوت لگائے چلا جا رہا ہے۔ اے نورسیدگانِ گلشنِ عصمت تمہاری عنایتیں لوحِ دل پر کندہ ہو چکی ہیں۔ خوش رہو۔ پھولو پھلو۔ سرسبز ہو۔

سیر کی پھول چنے۔ خوش ہوئے۔ دلشاد رہے
باغباں جاتے ہیں۔ گلشن ترا آباد رہے

الغرض اس خطۂ جنت نشان کو خیرباد کہتے ہم کوہ راکی کی دشوار گذار گھاٹیوں کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اوماہا اور اگڈن کی نصف راہ میں ہی وہ بلند مقام واقع ہے جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ امریکہ کے ایک مشہور سپہ سالار کے نام پر اسکا نام شرمن رکھا گیا ہے۔ ۵۰۰ میل تک ریل سطح سمندر سے ۸۲۰۰ فیٹ اونچی چلی گئی ہے۔ اگڈن سے ۴۰ میل اس طرف ریل اُس گھاٹی

میں داخل ہوئی ہے جسکا نام ایکو کریک ہے۔ اس سے بڑھ کر حیرت انگیز سین اس تمام سفر میں کہیں نظر نہ آیگا۔ شان اسکی یہ ہے کہ ایک نہایت عمیق۔ پتھریلا۔ ناہموار نالا سات میل تک پیچ وتاب کھاتا چلا گیا ہے۔ اس کی چوڑائی بعض مقامات پر آدھ میل اور بعض پر پون میل ہے دائیں طرف ۲۰۰ فیٹ سے ۸۰۰ فیٹ تک کی اونچی ڈھالو پہاڑیاں سیدھے جیسے کھڑی ہیں ان کی پشتہ بندی صانع قدرت نے اپنے دست اعجاز سے کی ہے جس کی صنعت پر طبیعت بیساختہ لوٹی جاتی ہے۔ زمانے کی اکھاڑ پچھاڑ کرنے والی رفتار نے اپنا سکہ ان پہاڑوں پر بھی بٹھا دیا ہے۔ بارشوں اور جنوبی ہواؤں کے صدمات سے بعض مقامات پر پتھر گھس گئے ہیں۔ سبزہ ان پہاڑیوں کو مسکن پرخطر سمجھ کر ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکا ہے اور مقابل کی پہاڑیوں پر اپنی صفیں آراستہ کئے طوفان حوادث کی ستم شعاریاں دیکھ دیکھ کر کھلا جاتا ہے سچ ہے۔ ؎

کوئی نا اُمیدی سے ہے جاں کنی میں
کوئی دیکھتا ہے تماشا کسی کا

ان دونوں پہاڑیوں سے مصافحہ کرتی ایک نہایت شفاف ندی منافقین ستم کیش کی طرح انکی بیچ کنی میں شبانہ روز مصروف اور اُن کی جڑوں میں پانی دینے پر تلی ہوئی مار آستین کی طرح لہرائی چلی جاتی ہے۔ اس گھاٹی کے وسط میں دونوں پہاڑیاں دو بچھڑی ہوئی بہنوں کی طرح جن میں سے ایک ہری بھری اور دوسری کو کہہ مانگ جلی ہو فرط محبت سے لپک کر ایک دوسرے سے معانقہ کیا ہی چاہتی ہیں کہ آہ اس ظالم سفاک ندی نے للکار کر ان دونو بہنوں کو ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا۔ ہریالی بہن پر یہ جدائی اس قدر شاق گذرتی ہے کہ اس غریب کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اب وہ تسلسل و تناسب رخصت ہوا ہے فرقت زدہ کہیں مینار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کہیں کنگرہ کی شکل قبول کر لیتی ہے کہیں اس کی چھاؤں سے برباد شدہ معبدوں کی شان ٹپکتی ہے اور کہیں نگاہ کو برج منہدمہ کا دھوکا ہوجاتا ہے۔ الغرض یہ ستم رسیدہ پہاڑی اس شان سے نظر آتی ہے کہ گویا یہ خطہ کبھی ستان

ہوگا۔ مگر امتداد زمانہ نے اسکو پتھر بنا دیا۔ ہمارے شعرائے قادر الکلام اور مصوران معجز نظام کے لئے اس سے بڑھکر اپنی اعجاز نمائیوں کے دکھانے کا موقع بہت کم دستیاب ہوگا۔

لائن اگڈن سے سان فرانسسکو کی طرف جاتی ہے وہ گریٹ سالٹ لیک کی شمالی حد پر سے گذرتے ہوئے امریکہ کے صحرائے اعظم کو طے کرتی پیسفک الپس کی بلند چوٹیوں کو ٹھکراتی سطح سمندر سے ۷۰۰۰ فیٹ بلند ہوجاتی ہے۔ مگر آخر یہ بلند پروازیاں کہانتک۔ سو میل کی مسافت قلیلہ کو دیکھو اور ۷۰۰۰ فیٹ کے اتار کو ملاحظہ کرو۔ سچ ہے

جنہیں ملا انہیں افتادگی سے اوج ملا
انہیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

اب ہم شہر سکرمنٹو میں داخل ہوگئے۔ یہ شہر کیلیفورنیا کا دار الخلافہ ہے جو معدن طلا ہے۔ اسی مقام سے آثار مشرقیت ظاہر ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ اس شہر کی آبادی کے ادنے طبقہ میں چینی بکثرت نظر آتے ہیں۔ سان فرانسسکو اس مقام سے قریب ہے۔ بحر الکاہل سے اسکا نظارہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ یہ شہر خلیج سان فرانسسکو کے غرب میں ایک جزیرہ نما پر واقع ہے۔ اسکا شمالی حصہ متفرق طور پر خشک اور ریتلی پہاڑیوں پر آباد ہے جن میں سبزے کا نام تک نہیں۔ البتہ جنوبی حصہ جسکو شہر کا تجارتی حصہ بھی کہہ سکتے ہیں باقاعدہ آباد ہے۔ اس میں بڑے بڑے بازار ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی ہیں اور عموماً گھاٹوں تک چلے گئے ہیں۔ سان فرانسسکو میں اکثر چوبی مکانات ہیں۔ لیکن بتدریج انکی جگہ پتھر کی عمارتیں بکثرت بنتی چلی جاتی ہیں۔ ان عمارتوں میں بعض تو نہایت ہی خوشنما اور آراستہ پیراستہ ہیں۔ شہر کی مالی ترقی کے ساتھ بہت سے خوشنما و نفیس پتھر کی عمارتیں تیار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اضلاع متحدہ کی تجارتی شہروں میں یہ شہر چھٹے درجہ پر ہے۔ اگرچہ فی زماننا اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے مگر عنقریب وہ زمانہ آنیوالا ہے کہ مغربی امریکہ میں اس سے بڑھکر غلہ کی منڈی کوئی نہ ہوگی۔ آب و ہوا یہاں کی ایسی خوشگوار ہے کہ جو نازک بوٹے اضلاع

مشرق میں پائے نہیں جاتے۔ وُہ یہاں بارہ مہینے کثرت پھولتے پھلتے ہیں۔ اِس شہر کی شانِ و تنوع سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہو کہ نیچر اِس شہر کی عظمت و شوکت بڑھانے پر کمر بستہ کھڑی ہے۔ گر اِس جنگ زرگری نے اِس سرزمین کو ایسا زرخیز بنا دیا ہے کہ اِس کی رتیلی گھاٹیوں میں وُہ وُہ نفیس باغ پوشیدہ ہیں جن پر باغ ارم بھی رشک کھاتا ہے۔

اب ہمارا جہاز بحرالکاہل کی سُست موجوں پر تیرتا ٹلے بھرتا ذرا کی ذرا یوکوہاما میں قیام کرکے جزیرہ ہانگ کانگ میں جا پہنچتا ہے۔ یہاں سے ازراہ خشکی بھی سفر ممکن ہو۔ مگر سواری اور باربرداری کے سامان مہیا کرنے میں اس قدر دقتیں پیش آتی ہیں کہ مجبوراً اس راہ کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اور اُس راہ کو اختیار کرنا قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے جس پر پائنٹ ڈی گیل۔ عدن۔ سویز اور اسکندریہ واقع ہیں اسکندریہ سے براہ برنڈسی۔ لورپول تک ۲۵ روز کی راہ ہے جن میں سے تین روز سفر بحری میں صرف ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں برنڈسی سلطنت روما کا ایک عظیم الشان بحری مقام تھا۔ آجکل یہاں سے ایک لائن فلورنس ہوتی ہوئی ٹیورن تک گئی ہو۔ ٹیورن سے کمبری تک ریل کوہ الپس کو برماتی ہوئی چلی گئی ہو۔ اِسی راہ میں مونٹ سینس کی عظیم الشان سرنگ واقع ہے جس پر زمانہ حال کے انجنیروں کو بڑا ناز ہو۔ سچ پوچھو تو یہ ناز ہرگز بیجا نہیں۔ اس سرنگ کو ۱۸۵۷ء میں پہاڑ کی مخالف سمتوں سے کھودنا شروع کیا اور بیس سال کی کوہکنی کے بعد جس کے آگے فرہاد کی کوہکنی منفعل ہوتی تھی۔ یہ دونوں ہمت کے بہادر کوہکن ایک دوسرے سے مل گئے اس سرنگ کو جو آٹھ میل لمبی ہو اور جو ۴ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوئی ہو۔ اوّل مرتبہ ریل نے ۱۷ ستمبر ۱۸۷۱ء میں طے کیا۔ یہاں سے پیرس چند گھنٹہ کی راہ ہو اور وہاں سے لورپول پہنچنا کوئی بات نہیں۔ اس سفر میں ۲۳۰۰۰ میل طے کرنے پڑینگے اور دو ماہ سترہ یوم کے بعد تمام دُنیا کا چکر لگاکر لورپول میں واپس آجاؤگے۔

سید شریف حسین بی۔ اے (الہ آباد)

گناہ

[illegible]

اے [illegible] تیرا دل ایسا [illegible] [illegible] یہ وہی
دل تھا جو کبھی ایسے چراغ کے مانند تھا [illegible] روشنی [illegible] اور ٹھنڈی ہوا [illegible] یہ وہی دل
تھا جو اس مبارک زمین کی طرح تھا جس پر برکتوں کا نور [illegible] بہاروں کی جھڑی کی
طرح ہر وقت برستا ہو۔ اور اب وہی [illegible] گناہوں کا مندر بنگئی تھی۔ جس میں ایک طرف
گناہوں کا [illegible] لگا ہوا تھا اور دوسری طرف ناپاکی کی موجیں طوفان برپا کر رہی تھیں۔ اب ہی
چراغ آگ کے بڑے ڈھیر کی صورت میں تبدیل ہوگیا تھا جسکے بے پناہ شعلے آسمان تک کی
خبر لاتے تھے۔ اور اب وہی زمین ایسا خشک قطعہ بنگئی تھی۔ جس کے ذرّوں سے پلیدی
کے پودے پھوٹ کر بلند درخت بنگئے تھے اور جن میں نامبارکی اور بدفالی کے پھول بکثرت
کھل رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تیرے سیمابی زنخدان پر سیاہی اپنا رنگ جما چکی تھی۔
تیری یہ مونچھیں جو اندنوں بالکل سفید ہو رہی ہیں۔ اسوقت بنگالی کوّے کے پروں کی طرح
سیاہ تھیں۔ اب تو تیرے رخساروں پر جھرّیاں پڑگئی ہیں۔ اور انکی رنگت سیاہی مائل ہوگئی
لیکن وہ اسوقت بالکل سُرخ و سفید تھے اور تیرے دانت جو اب پرانی دیوار کے بوسیدہ
کنگروں کی طرح ایک ایک کرکے گر گئے ہیں۔ اسوقت ان میں موتیوں کی سی سفیدی تھی
اور تیرے مسوڑوں میں اسطرح پیوست تھے۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ یا گوشت میں ناخن۔
ترا قد جو اسوقت بارِ گناہ سے میوہ دار شاخ کی طرح زمین پر جھک گیا ہے۔ اندنوں بالکل
ایک سیدھے اور لمبے شہتیر کے مشابہ تھا۔ تیرے سر کے بال جن پر اب اوس پڑگئی ہے اور
برف کی مانند سفید ہوگئے ہیں۔ اسوقت بالکل کالا بھونرا تھے۔ دیکھ اے خاکی ذلیل۔ یہ

فرق تھا یہ تیری جوانی کے مرقع اور بڑھاپے کی تصویر ہیں۔ تو کمزور بوڑھے کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے اُن دنوں مضبوط نوجوان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اے غافل شخص! ذرا تیرے بڑھاپے اور بچپن کی تصویر کا بھی فرق دیکھ۔ دل پہ بھی تیری صورت حسرت اب مایوسی اور اداسی برس رہی ہے۔ اسوقت اس سے جوانی اور امیں آئندہ تھیں۔ تیرا چہرہ جس پر اب بیشمار کافور کے درخت کھڑے ہیں تب بالکل ارغوان زار تھا۔ تیری آواز جس سے ضعف گر عیاری ٹپک رہی ہے۔ اسوقت بالکل سریلی تھی۔ تیری صورت سے فریفتگی اور بھولا پن ظاہر تھا اور تیری آنکھیں جو اب جوانی کے غم میں بے نور اور خلوت نشین بنگئی ہیں۔ تب بالکل صاف اور چمکیلی تھیں۔ اب تو پیر سالخوردہ ہے تب طفل نوخیز تھا اب ایک ایسا کانٹا ہے جسکا زہر نیش عقرب ہے۔ اُسوقت ایسا پھول تھا جس کی مہک باغ میں اُڑ رہی تھی اب تو باپ بنگیا ہے اسوقت بیٹا کہلاتا تھا وُہ صبح زندگانی تھی۔ یہ شام حیات ہے وُہ اقبال تھا۔ یہ زوال ہے۔ وُہ آغاز تھا اور یہ انجام ہے۔ اُس وقت تو ایک مرغزار تھا جس کو سدابہار پھولوں کی خوشبو سے جنگل مہک اُٹھا تھا اور اب ایسی زمین ہے جسکے لمبے لمبے گھاس میں بیشمار زہریلے انعی رینگ رہے ہیں اور پھن کھولے کھڑے ہیں۔ کیوں اے نامراد شخص۔ اب بھی تجھے کچھ فرق معلوم ہوا۔ ہاں ذرا اب تو اُن کرتوتوں کو سُن جنکا تو زمانہ شباب میں مرتکب ہوا۔ تجھے خدا نے آنکھیں دی تھیں کہ اُن سے اُس کے مناظرِ قدرت کو دیکھے اور اس کی صنعت کی داد دے لیکن تو ہمیشہ اس غایت کے برخلاف اُنسے کام لیتا رہا۔ تجھے کان دئے گئے تھے کہ نیک باتیں سنے۔ مگر بجائے اس کے تیں گوش پر از زمزمہ جنگ و رباب تھا کا مضمون تھا۔ تجھے ہاتھ دیئے گئے تھے مگر وُہ خونریزی کے مشتاق ہوگئے تھے۔ تیری تلوار جسکا نام تونے "مرگ دشمن" رکھا تھا ہمیشہ خون سے رنگین نظر آتی تھی اور تیرے دامن و آستین پر اکثر خون کے چھینٹے نظر آتے تھے۔ جو ہر ایک میں بجائے خود ایک خونِ ناحق

کی داستان کی سُرخی تھا۔ تو نے عورتوں کی عصمت دری کی۔ اُنکے پردہ ناموس میں رخنے ڈالے اُنہیں بے آبرو کیا۔ بچوں کو یتیم کیا۔ خاندانوں کو برباد کیا۔ دوستوں پر تہمتیں تراشیں بیبیوں کو خاندان آوارہ کیا۔ سہاگ سر تو نے کندھوں سے اتار دیئے۔ لوگوں پر جھوٹے الزام قائم کئے۔ امانتوں میں خیانت کی۔ دوسروں کے حقوں کو ہضم کر گیا اور ڈکار تک نہ لی۔ تو ہمیشہ اپنی مطلب براری کے لئے کمینہ وسائل استعمال کرتا تھا فریب تو نے کئے۔ دغا تو نے کی۔ شاہی قانون تیرا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ انصاف کے رُو سے تو ہمیشہ پہلو بچاتا رہا اور جب کبھی قابو میں آیا تو زر پرست قانون دان جن کی ملت غائی القصان کا خون کرنا ہے تجھے اس کے عقوبت سے نجات دیتے رہے۔ یہ تیرے وہ مظالم ہیں جو تو نے اپنے ابنائے نوع کے ساتھ کئے۔ خدا کے ساتھ بھی تیرا برتاؤ اسی طرح کا تھا۔ دین میں تو نے رخنے ڈالے مذہب کو تو نے خراب کیا نبیوں کے وجود سے تو انکاری ہوا۔ کتب سماوی اور اُن کی تنزیل میں تجھے کلام تھا اور پھر تیری آزادی یہاں تک پہنچی کہ خدا کی ذات سے بھی منکر ہو گیا۔ تف ہے تیری اس زندگی پر۔ لعنت ہو تیری اس حیات پر۔ تیرے کاتب اعمال تیرا سیاہ نامہ لکھتے لکھتے تھک گئے مگر تو گناہوں کے ارتکاب سے ہرگز ہرگز نہیں تھکا۔ ؎

تھک گئے نامۂ اعمال کو لکھتے لکھتے کیا فرشتوں کا بُرا حال بشر کرتے ہیں

اب تیرا شباب گذر چکا تھا اور تو نے طوعاً و کرہاً زمان پیری کو آہ سرد کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ اس ناخوش آئند مہمان کی دقت میں تو کچھ اور ہو گیا۔ تیری حرارت برودت سے بدل گئی۔ تیرے بال سفید ہو گئے۔ پھر دانتوں نے رفاقت چھوڑی۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئیں۔ بدن میں خون نہیں رہا۔ کمر خم ہو گئی۔ اعضا سُست ہو گئے اور جسم میں رعشہ آ گیا۔ ان خوبیوں نے تیری صورت میں سنجیدگی پیدا کر دی اور تیرا چہرہ نورانی معلوم دینے لگا ؎ شیخے مذ قبیلہ معزز۔ ریشے چو گلِ سفید یک گز۔

اور کون شخص تھا جو ایسی مرتاض اور پرہیزگار شکل والے شخص کے دھوکے میں نہ آتا جس کی ایک گز بھر داڑھی ہو اور ایک مقدس زاہد عابد کا لباس پہنتا ہو اور زبان پر ہر وقت دنیا کی بے ثباتی کا مضمون رکھتا ہو۔ لیکن تو اور تیرا دل خوب جانتے ہیں جیسا تو تھا تیرے بالوں سے سیاہی چلی گئی تھی۔ لیکن قلب اسی طرح سیاہ تھا ؎

هوس از سرت بکسر مو نرفت
سیاهی ز مو رفت و از رو نرفت

اے او آقا کے سرکش غلام جس کی فرمانبرداری سے تو نے سرتابی کی جس کی حلقہ بگوشی سے تجھے ہمیشہ انکار رہا۔ اور جس کی اطاعت کے لئے تو نے کبھی اپنے مغرور سر کو نہیں جھکایا۔ ذرا اپنی حالت کو دیکھ اور اس پر غور کر گنہگاری تیری طبیعت ثانیہ بن گئی ہے تیرا جسم خطا کاری کا پیکر بن گیا ہے اور تو جرائم کی زندہ مثال ہے۔ تو اللہ کے گھر سے بالکل پاک اور معصوم آیا تھا اور اب اس کی خدمت میں مظالم اور معصیت کی پوٹ لیکر جائیگا۔ سوچ۔ اور ظالم سوچ تو کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ تو نے تمام عمر گناہوں میں بسر کی اور اب بھی اسی راستہ پر چل رہا ہے۔ ہائے تو بوڑھا ہو گیا مگر نیکی کا کبھی تجھے خیال تک نہیں آیا۔ اب تو مرنے والا ہے لیکن انجام کا کچھ اندیشہ نہیں۔ ؎

تن میں رعشہ پڑ گیا پیری سے گردن جھک گئی
اب تو جھک سجدے میں او سرکش خدا کے سامنے

اے ظالم! اے سیاہ کار۔ اپنی حالتِ زار پر رو۔ ایام رفتہ پر ہاتھ مل۔ گذشتہ عمر جو برباد ہو گئی ہے اور نہیں لوٹیگی۔ افسوس کر۔ مگر اے نادان اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ دن گذر گئے ہیں اور کبھی نہیں آئینگے۔ وہ بہاریں اب تجھے خواب میں بھی نصیب نہ ہونگی۔ وہ چاندنی راتیں واپس نہیں آئینگی۔ آہ تو کیا یہ امید کر رہا ہے کہ تیرا وہ زمانہ لوٹ آئیگا۔ جہاں تیرے مرنے والے باپ نے کھڑا کیا تھا۔ اوہ یہ ناممکن ہے

تو بڑا تدن ان لوگوں کو جنہوں نے زندگی کے دروازہ میں تیرے ساتھ یا تیرے بعد قدم رکھا تھا۔ اس جہان سے کوچ کرتا ہوا دیکھتا ہے۔ مگر اُن میں کوئی بھی ایسا بدقسمت نظر نہیں آتا جیسا تو ہے۔ ان میں ایک بھی ایسی مایوس اور غمگین صورت نہیں جو تیرے ہم مشرب بن بیٹھے تو ایام طفلی کو یاد کر رہا ہے اور رو رہا ہے۔ لیکن وہ وقت چلا گیا جب تجھے رونا چاہیے تھا اب تیری حسرت بیسود ہے تیری ندامت بیفائدہ ہے۔ وہ سہانی چاندنی راتیں چلی گئی ہیں اور وہ بہار کی فصلیں گذر گئیں۔

اے حسرت نصیب غم اندوز شخص۔ اب تیرا وہ آخری دن ہے جس کے بعد تو دنیا کے روشن آفتاب کو قیامت تک نہیں دیکھ سکیگا۔ اس کے مرغان سحر کی دلفریب زمزمہ پردازی پھر نہیں سن سکیگا۔ اور تو اپنے اہل وعیال کو اسی طرح چھوڑ جاویگا۔ جس طرح تجھے تیرا باپ تنہا چھوڑ جاویگا۔ اے خدا کے گنہگار بندے اسوقت ہزاروں آفتیں ہیں۔ جو تیرے مجروح دل کو ستا رہی ہیں۔ کبھی اس بھولی ہوئی اور مدت سے بچھڑی ہوئی ماں کی دھندلی تصویر تیری نگاہوں میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ جس کے مرجھائے ہوئے چہرہ سے سرزنش کے آثار ظاہر ہیں۔ جو تجھے ملامت کرنے کے لئے لب کھولا چاہتی ہے۔ ادھر بوڑھے باپ کا خیال آتا ہے جس کے پاس تو آسمان پر جا رہا ہے۔ آج تجھے اُس کی فراموش شدہ وصیتیں یاد آ رہی ہیں جنپر تو نے عمل نہیں کیا۔ اور جب تو اُس سے ملیگا تو وہ غصہ کے ساتھ تیری طرف سے مُنہ پھیر لیگا۔ اُس کی وہ نگاہیں جو تیرے چہرہ پر پڑینگی غضب آلود ہونگی۔ وہاں برسوں کی بچھڑی ہوئی ماں بھی ملیگی۔ لیکن افسردہ خاطری کے ساتھ تیرا استقبال کریگی۔ ہائے تو اسوقت کیسا پشیمان ہے۔ اُن نیکیوں کے نہ کرنے سے جو تیرے امکان میں تھیں۔ اب تجھ وہ خطائیں یاد آ رہی ہیں جو تو نے اپنی عمر کے حصہ میں کیں۔ وہ ناقابل معافی جرائم یاد آ رہے ہیں۔ جنکا تو راہ حیات میں مرتکب ہوا۔ اے گمراہ شخص اب تو بستر مرگ پر پڑا ہے اور تجھ پر جان کندنی کی حالت طاری ہو گئی ہے۔ پیغام اجل آ پہنچا ہے اور ملک الموت نے تیرا سر آغوش

میں نے لیا ہے اور یہ تیرا آخری منٹ ہے۔ جس میں تو چند سانس لے سکتا ہے۔ ہائے اسوقت تو کسقدر بیتاب ہے اور کتنا بےچین ہے اور افسوس کہ اس حسرت اور غم میں وہ سانس بھی ضائع ہو گئے۔ اب ایک سانس باقی ہے اور صرف ایک سانس۔ اے قابلِ رحم غافل بوڑھے ابھی تیرے لئے وقت ہے۔ ابھی امید ہے۔ اٹھ اور اس پاک خدا کی درگاہ میں گردنِ نیاز جھکا دے۔ اٹھ اور اس بے نیاز سے معافی مانگ۔ دو آنسو اپنی شرمسار آنکھوں سے نکال اور اپنے گناہوں کے دفتر کو دھو ڈال۔ اے شرمسار بندے تجھے مبارک ہو کہ تو بچ گیا ہے۔ عذاب کے فرشتوں اور دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ سے بہت دور نکل گیا ہے۔ تجھے خوشخبری ہو کہ تو معاف کر دیا گیا ہے اور تجھے بشارت ہو کہ تو آزاد ہے۔ بہشت اور اس کی حوریں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔ اب تو آرام سے جان دے اور یہ شعر پڑھتا ہوا چلا جا۔

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرقِ گناہست میرود بہشت

ح۔ م۔ شیرانی۔ ٹونکی۔ منشی فاضل

کہوں کس سے قصۂ درد و غم۔ کوئی ہمنشیں ہے نہ یار ہے ۔۔۔ جو انیس ہے تیری یاد ہے جو شفیق ہے دلِ زار ہے
تو ہزار کرتا لگاوٹیں میں کبھی نہ آتا فریب میں ۔۔۔ مجھے پہلے اسکی خبر نہ تھی ترا دو ہی دن کا یہ پیار ہے
یہ نوید اوروں کو جا سنا ہم اسیر دام ہیں اے صبا ۔۔۔ ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہے
مجھے رحم آتا ہے دیکھکر ترا حال اکبرِ نوحہ گر
تجھے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جسکا عاشقِ زار ہے

(نجم الدین احمد) ——— (مولوی اکبر حسین خان بہادر سشن جج)

حکّام کی تقلید

ہندوستان کا روز بروز مغربی طرزِ معاشرت کی طرف غیر معمولی رجحان دیکھ کر بعض قدرتاً بے چین دلوں میں بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک دن ہندوستان بھی اور ممالک کی طرح اہل یورپ کا مقلد ہو کر "کالا یورپ" بنجائیگا؟ ساتھ ہی دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو کن اسباب سے ہوگا۔ پہلے سوال کا جواب اکثر موقعوں پر اثبات میں دیا گیا ہے اور دوسرے سوال کے جواب میں عام طور پر اَلنَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِھِم کا زبردست قانون پیش کیا جاتا ہے یعنے انسان میں حکام وقت کی تقلید طبعی طور پر پائی جاتی ہے اور جو رنگ حکام میں مقبول ہو وُہ مقبولِ عام ہو جاتا ہے۔ مجھ کو اس موقعہ پر پہلے سوال کے جواب سے بالکل بحث نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں دخل دینا ایک دریائے بے پایان میں غوطہ مارنا ہے مگر فی الحال میں دُوسرے سوال کے جواب کو لیتا ہوں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے حکمران قوم کی تقلید کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ حکمران قوم اس ہماری تقلید سے بجائے خوش ہونے کے ناراض ہوتی ہے اور بجائے اس کی ترغیب دینے کے بعض اوقات اس پر تادیب کرتی ہے تو ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ پھر کس طرح سے اوّل الذکر قانون اہل ہندوستان کے اس رجحان پر عاید ہو سکتا ہے؟

بعض ملکوں میں البتہ ایسا ہوا ہے کہ بادشاہِ وقت نے زبردستی رعایا کو اپنی خواہش کے موافق کسی خاص طرزِ معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ چنانچہ رُوس کے مشہور عادل بادشاہ پیٹر اعظم نے نہ صرف اپنی رعایا پر ڈاڑھی رکھنے کا ٹکس لگایا بلکہ ڈھیلے ڈھیلے

ایشیائی چوغوں کے بجائے یورپ کے چست لباس کو لباسِ عدالت کر کے نہایت سختی سے ملک میں مروج کیا۔ یہ اُسی مدبر اور دُور اندیش بادشاہ کی بدولت ہو کہ آج یورپین رُوس کم از کم طرزِ معاشرت میں اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب یافتہ قوموں کا ہم پلہ ہے۔ بعض اور ملکوں میں کسی زمانہ میں شاید ایسا ہوا ہو کہ بادشاہ وقت نے اپنی مرضی کے موافق رعایا کی طرزِ معاشرت کو تبدیل کر دیا ہو مگر موجودہ ہندوستان میں اس طرح کا کوئی جبر موجودہ منصف مزاج حکمران قوم سے عمل میں نہیں آیا۔ پھر کیوں دن بدن ہم ہر ایک مشرقی چیز سے نفرت کرتے جاتے ہیں؟ اگر محض یورپ کی تقلید ہی اس عظیم انقلابِ تہذیب کی بانی ہے تو البتہ یہ امر ایک درجہ افسوسناک ہو۔ لیکن اگر کوئی اور نامعلوم مگر زبردست قانون اپنا اثر ڈال رہا ہے۔ اور قانونِ قدرت کی طرح معیشت کو نیچی سطح سے اُوپر کی سطح پر لانیکا عمل کر رہا ہو تو ہم کو بجائے بحرِ تفکر میں غوطہ لگانے کے خوش کن خوابوں میں محو ہونا چاہئے

اس مسئلہ کے معلوم کرنے کے لئے اگر ہم تاریخ سے مدد لیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ ہم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں۔ اُنکا حال پڑھنے سے اور اُنکے تبدلِ معیشت کے اسباب پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ وُہ کونسا زبردست قانون ہو کہ جو ایک قوم کو بلا لحاظِ ملت و مذہب دُوسری قوم کی طرزِ معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ گال کی نیم وحشی قوم نے قدیم روما کی مشہور و مستند مہذب قوم کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ پھر قدیم روما نے یُونان کو جہاں کا فلسفہ اور لٹریچر دُور دُور مشہور تھا اپنے زیرِ فرمان کر لیا۔ تو کیا قدیم روما کی مستند تہذیب بھی قوم گال کی وحشت کے تابع ہو گئی؟ کیا یُونان کا فلسفہ اور علمِ ادب قدیم روما کے قانون کے آگے معدُوم ہو گیا؟ اگر ایسا نہیں ہوا تو گویا فاتح کا اثر مفتوح پر صرف ملک ستانی ہی تک رہا اور الناسُ علیٰ دینِ ملوکِھم کا قانون ٹوٹ گیا۔ اور واقعی ایسا نہیں ہوا۔ قوم گال کو اہل روما کی تہذیب ماننی پڑی اور اہل روما کو یونانی فلاسفروں اور ادیبوں کا شاگرد ہونا پڑا۔

اسی طرح سے مشرقی دنیا میں عبّاسی خلافت کے نام و نشان مٹانے والے ہلاکو خاں کی اولاد کو ایک دن ایسا آیا کہ عرب کی تہذیب اور مذہب سے فائدہ اُٹھانا پڑا اور جو خونخوار ترک عرب کی ہر ایک چیز کو مٹانے کے پیچھے پڑا تھا آخرش وُہی انکے نقش پا کی طرح اُن کی یادگار رہگیا۔ مغلوں نے ہندوستان میں آکر اعلیٰ طبقہ میں ایران کی تہذیب جاری کی بلکہ خود بھی اُسی کے مرید ہوگئے فاتح مفتوح کا خیال دل سے مفقود ہوگیا اور وہ دن آیا کہ جو کتاب بابر نے اپنی مادری زبان میں لکھی تھی (یعنی ترکی میں) وہ اس کے پوتوں کے لئے ایک غیر زبان میں ہوگئی۔

دُور کیوں جائیں۔ ہندوستان کی تاریخ ہی ملاحظہ کیجئے۔ آریا آئے قدیمی باشندوں کو مار بھگایا۔ اُنسے زبردست تہذیب والی قوم اُنپر حملہ آور ہُوئی اُس نے اپنا سکّہ جمایا یُونہی ایک تہذیب سے مقابلہ ہوتا رہا۔ حتّٰی کہ اب مشرقی تہذیب کا مغربی تہذیب سے معاملہ آن پڑا اور چونکہ یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ہندوستان مغرب کی تہذیب کی طرف نہایت تیزی سے چلا جارہا ہے۔ اس مسئلہ کے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی کہ مغربی تہذیب مشرقی تہذیب سے زیادہ زبردست ہی۔ کیونکہ جس قدر تاریخی واقعات اُوپر بیان کئے جاچکے ہیں۔ اُن سے صریح طور پر ظاہر ہورہا ہے کہ جب کبھی دو تہذیبوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ اعلیٰ طبقہ کی تہذیب ادنیٰ طبقہ کی تہذیب پر غالب آجاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک امر قابلِ غور ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مغربی طرز معاشرت زیادہ تر اُن ممالک ہندوستان میں جلد مقبول ہُوئی اور ہوتی جارہی ہے جو اصلی ہندوستانی تہذیب کے دائرہ سے دُور تھے۔ مثلاً بمبئی کلکتہ مدراس۔ پنجاب وغیرہ۔ عام طور پر اس کا جواب یہی ہوگا کہ چونکہ ہندوستان میں اوّلی اہل یورپ کا قدم بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس میں آیا تھا اس وجہ سے اُنکی تہذیب بھی وہیں زیادہ پھیلی۔ مگر اصل وجہ یہ نہیں ہی۔ اصل وجہ یہ ہے

کہ ان ممالک کی کوئی مستند تہذیب نہ تھی جو تہذیب انکو ملی اس کو انہوں نے فوراً منظور کر لیا۔ برخلاف اس کے ہندوستان اپنے زمانہ میں تہذیب کا منبع تھا۔ اسی لئے دلی اور لکھنؤ اور ان کے نواح آجتک ہر ایک مغربی چیز کی خوبی قبول کرنے میں حیلہ و حجت کئے بغیر نہ رہینگے۔ کیونکہ ان کی بھی برسوں کی محنت کی کمائی انکی تہذیب ہی تھی۔ اب اسکو بھی یہ مغرب کے حملہ آور اور شرقی یادگاروں کے ساتھ پاؤں تلے روند ڈالیں۔ تو کیوں نہ اس تہذیب کے فدائی زبانِ حال سے یہ شعر پڑھیں ؎

کن محنتوں سے ہائے بنا تھا یہ قصرِ دل
قسمت میں تھا مرے اسے برباد دیکھنا

مگر دنیا کا یہی دستور ہے اور خواہ اسے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی دنیا کہیے۔ مگر قانونِ قدرت یونہی ہے کہ ہر ایک کمزور شے کو اس سے زیادہ طاقتور شے اس کی جگہ سے ہٹا کر اپنا قبضہ کر لیتی ہے۔ ہر سیر کو سوا سیر اور ہر فرعونے را موسٰے۔ اسی طرح انتظامِ دنیا چلتا ہے۔ ہندی تمدن عرب کے تمدن کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس کے رنگ سے بہت کچھ رنگا گیا۔ گو بالکل مغلوب نہیں ہوا۔ اب جو قوم ہم پر حکمراں ہے اس کا طرز معاشرت ہمارے طرزِ معاشرت سے کہیں اعلیٰ درجہ کا ہے اور جو کچھ اس کا اثر ہم پر پڑ رہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ مگر پھر یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ یہ اثر اس وجہ سے نہیں کہ وہ حکمران قوم ہے۔ بلکہ محض اس وجہ سے کہ مغرب مشرق سے بڑھا ہوا ہے۔ (کیا گردشِ زمانہ ہے) مصر و روم و جاپان کی طرز معاشرت کو دیکھکر اس کا عینی ثبوت ملتا ہے۔ یہ خود مختار سلطنتیں ہیں اور انپر کسی طرح کا حاکمانہ اثر مغربی طرزِ معاشرت کا نہیں پڑ سکتا۔ اور تو اور "دولت خداداد" افغانستان پر بھی جو اس قدر امن سے بسم اللہ کے گنبد میں مغربی تہذیب کے اثرات سے محفوظ معلوم ہوتی تھی۔ یہ عالمگیر اثر اپنا جادو چلا گیا۔ جس سے یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا کہ الناس علےٰ دینِ

ملاوا کھر کی مشہور ضرب المثل بھی زمانہ کی اور پُرانی چیزوں کی طرح مستعمل ہوتے ہوتے بیکار ہو گئی ہے - پس یہ شکایت کرنی کہ یہ انقلاب کیوں ہو رہا ہے - ایک طرح سے قانونِ قدرت پر اعتراض اور اس بات کا گویا خدا کے دین کا کفران ہے - ہمارے خیال میں یہ جو کچھ بھی رجحان مغربی طرزِ معاشرت کی طرف ہو رہا ہے - تقاضائے وقت ہے اور بہت خوب ہو رہا ہے - اور خوش نصیب ہیں وہ ملک اور وہ قومیں جنکو یہ ضرورت جلد تر محسوس ہو گئی +

مُشتاق احمد زاہدی

ایک بچّہ کی لوحِ تربت

یہیں پڑا ہے ہمارا غنچہ - نہیں جو پایا تھا مُسکرانے
گرایا ٹہنی سے دیکے جھٹکا - ستم کیا اک دمِ صبا نے
وُہ روح تھی تو نے پاک پائی - کرن کی صورت جہاں میں آئی
جھلک تھی اک نور کی دکھائی - گئی مگر پھر کدھر وُہ جانے؟
لئے نہ گنتی کے سانس تو نے کہ توڑ دی دل میں پھانس تو نے
مٹائی جینے کی آس تو نے - کہ دم لگا تیرا رُک رُک آنے!
چراغ میں جیسے تیل ہو کم - گئی ضیا تیری پڑ گئی مدّھم
ہُوا نگاہوں میں تیرہ عالم - کہ گل ہُوئی شمع دودمانے
وُہ اپنی اماں کے دل کا پارہ - وہ بابا کی پُتلیوں کا تارہ
جہان سے کر گیا کنارہ - لحد میں جا کر لگا ٹھکانے
ہُوا تو آزادِ رنجِ دنیا - گیا تو بے لوث گنجِ دنیا
کہ ہے سرائے سہ پنج دنیا - گذشتنی رفتنی مکانے
جگر ہے گو غم سے پارہ پارہ - نہیں ہے صادق قضا سے چارہ
کہ تھا نہ ممتاز کچھ ہمارا - دیا خدا نے تھا لیا خدا نے

سالگرۂ مبارک حضور نظامِ دکن

(از خیالاتِ تازہ حضرت شہباز)

کیا صبح ہے کہ خندۂ گل مبتسم ہے نور کی ! کیا شام ہے کہ زلف بکھرتی ہے حور کی !
کیا کیا نسیم چلتی ہے عیش و سرور کی ! اے مرحبا ! یہ زمزمہ سنجی طیور کی
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

ہر باغ میں ہیں بلبل و طوطی کے چہچہے ہر بزم میں ہیں مے کے صراحی کے قہقہے
پھرتے ہیں جام سیل میں مے کی بہے بہے کیوں جوشِ سرخوشی میں نہ ہر رندیوں کہے
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

جس دل کو دیکھو اُس میں خوشی ہے اُبل رہی ہے ناز سے نسیم گلستاں میں چل رہی
آفت بلا کی طرح ہے ہر سر سے ٹل رہی پتھر کے دل سے بھی یہ صدا ہے نکل رہی
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

اِس دن نے کر دیا ہے زمانے کا غم غلط رہنا حزیں ہے آج خدا کی قسم غلط
ہے غم غلط زیادہ وہ ہو یا کہ کم غلط کہتی خوشی ہے غم سے .. نہ کھا غم ہے غم غلط
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

شاخوں پہ بلبلیں ہیں چمن میں چہک رہی پھولوں کی بدھیاں ہیں گلوں میں مہک رہی
فوجیں شرابیوں کی ہیں پی کر بہک رہی کلیاں کہ تھیں خموش ہیں وہ بھی چہک رہی،
خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

جتنے ٹھکانے ملک میں ہیں کارزار کے ہیں وردیوں سے فوج پہ عالم بہار کے
ڈالے گی جب یہ دھوم سلامی اُتار کے بندوق بھی بکھے گی یہ سب سے پکار کے

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

بیٹھے ہیں اپنے کشورِ عیش و سرور کر — زخموں سے دم میں سینۂ اعدا کو چور کر
ہاں ہاں عیاں نیام سے اک تیغ طور کر — تلوار زنگ غم کو ابھی دل سے دور کر

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

کاغذ کے صفحے پر جو ہے پارۂ گہر بہ سے — رنگیں ہر ایک حرف ہے جس کا صفیر سے
زیر و زبر ہے جس کا بڑھا نام سے زیر سے — ہر لحظہ ہے عیاں یہ قلم کی صریر سے

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

ناحق تو اپنے دل میں ذرہ اس طرح اداس — اے چرخ اتار پھینک تو یہ نیلگوں لباس
طرب کو بعد کے تو بلا جلد اپنے پاس — ساقی سے ابر کے تو منگا بھر کے اک گلاس

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

کیوں اڑ رہی ہیں منہ پہ تیرے یوں ہوائیاں — چہرے سے اپنے دور کر اے چاند چھائیاں
آنکھوں میں پھیر نور کی اپنی سلائیاں — پھیلا کے چاندنی کی جہاں میں صفائیاں

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

توسِ قزح کی یوں نہ غضب سے کماں چڑھا — بدلے تو آستیں کے نہ یوں ندیاں چڑھا
عشرت کی مے سے بھر کے کوئی جام ہاں چڑھا — او ابر اس طرح سے نہ تو تیوریاں چڑھا

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

سورج دکھا خوشی کی ادا اپنی چال سے — لا ندیاں تو نور کی دشت و جبال سے
اس دم کا منتظر تھا جہاں ایک سال سے — نصف النہارِ عیش ہو مت ڈر زوال سے

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

طوفان اپنے یوں تو پریشاں نہ بال کر • غصے سے اور غضب سے برا یوں نہ حال کر
بادِ صبا کی طرح قدم رکھ سنبھال کر • نرگس کی طرح دل کو کھلا دیکھ بھال کر

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

ہاں اَے دوات جلد سیاہی سے دُور ہو — ہیں کشتیاں قُصُور۔ تو جلد ان میں حُور ہو
الماس ہو عقیق ہو چاہیے بلور ہو — پی کر شراب لعل نشے میں تو چُور ہو

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

سُرخی کی ہے دوات ترا جام اور سبُو — مستوں کی طرح جوش سے کر خوب گفتگو
سجدے کے بدلے جھُوم کے مے پی۔ نہ کر وضو — لکھ کر یہ خمسہ تو بھی ہو۔ اے خامہ سُرخ رُو

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

جھگڑے میں کیوں پڑی ہو فراموش و یاد کی؟ — دیکھو تماشے بیٹھ کے دلہائے شاد کے
لوٹو مزے فِرِکس[1] کی جا ابر و باد کے — لڑکو ڈرو نہ جور سے تم اوستاد کے

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

وُہ دِل کہ دامِ رنج میں تھے کل تلک پھنسے — مہمان اُنہی میں آج خوشی کے ہیں آ بسے
اُستاد بھی ہیں لہو و لعب پر کمر کسے — چھٹی ملی۔ ہیں بند سب اسکول مدرسے

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

شہباز کی ہے فکر نہ بیٹھ اس طرح ملول — لازم ہے باغِ عیش میں تُو ابھی ہو شمول
بلبل کی طرح جلد خوشی میں تو آ کے پھول — ہنس ہنس کے کہ رہے ہیں تجھی سے تو سب یہ پھول

خوش ہو کہ آج سالگرہ ہے حضور کی

---

[1] علم طبعیات۔ یہی مضمون ہے جو پروفیسر لزّتو اورنگ آباد کالج میں پڑھاتے ہیں۔ ایڈیٹر

مذہب اور سائنس

منشی سراج الدین احمد صاحب گورنمنٹ پنشنر جن کی ایک بسیط نظم اس سے پہلے درج ہو چکی ہے۔ اور جسے اکثر اہلِ دل اور سخن فہم حضرات نے نگاہ قبولیت سے دیکھا ہے۔ مذہب اور سائنس کا مندرجہ ذیل مناظرہ ارسال فرماتے ہیں جسے ہم شکریہ کے ساتھ زینتِ اوراقِ مخزن بناتے ہیں:—

ایک دن سائنس نے مذہب سے کی یوں گفتگو
سچ بتا آیا ہے اس دنیا میں کس مطلب سے تو

سمجھ میں میں پاتا نہیں معقولیت کا نام تک
وہم و مظنونہ ہے تو آغاز سے انجام تک

وہ بڑی ہستی مفروضہ جو ہے تیرا خدا
آج تک اس کا لگا یا کچھ نہیں تو نے پتا

گاہ تو نے اس کا بتلایا اولمپس[۱] پر مقر
تھا بلندی ہمالہ سے تو ناواقف مگر

گاہ سنگیں بت میں تو نے اس کا بتلایا ظہور
اور کہا گاہے جوالا مکھی[۲] کو تو نے شمعِ طور

گاہ تو نے روح اور مادہ[۳] کو بتلا کر قدیم
خلقِ عالم میں بنایا آپ نے خالق کا ندیم

گاہ تو آتش کدے میں اسکا دیتا ہے نشاں
آب و خاک و باد میں شاید نہ تھا کوئی مکاں

گاہ تو نے اس کو نورِ وادیِ ایمن کہا
وہ بھی پر "میں ہوں[۴]" جو ہوں" سے کچھ نہ آگے کہہ سکا

گاہ تو نے اس کو پہنایا مسیحا کا لباس
جو ہوا آخر کو قربانِ صلیبِ رنج و یاس

گاہ کیا ایجاد تو نے مسئلہ تثلیث کا
تین میں ایک ایک میں پھر تین تھے تیری خدا

جب تیری کاریگری کوئی نہ نکلی کارگر
تو نے پھر پیدا کیا اپنے میں اک خیر البشر

اس نے بتلایا کہ وہ ہستی ہے واحد بے بدل
جس نے سب پیدا کئے عالم میں اکثر اور اقل

ابتدا اس کی نہ کوئی ہے نہ کوئی انتہا
جسم ظاہر سے بری بالاتر از فہم و ذکا

---

۱ یونان میں ایک پہاڑ ہے جسکو یونانی خدا کا تختگاہ خیال کرتے تھے۔ ۲ کانگڑہ میں جوالا مکھی کوہ آتش فشاں ہے جسے ہندو جوالا کی جگہ بتلاتے ہیں۔ ۳ آریہ دھرم کا اصول۔ ۴ توریت کتاب خروج باب سوم آیت ۱۲

لامکاں اُس کا مکاں ہے لازماں اُس کا زماں | کنہ پر حاوی نہیں ہیں اس کے سب کب اور کہاں
سچ بتا مجھ کو کہ تو سمجھا ہے اس نکتہ سے کیا | کیوں نہ اقلیدس کا نقطہ تو نے اُس کو کہہ دیا
وہ کتابیں جنکو بتلاتا ہے تو حق کا کلام | تیری معلومات کی خوبی پہ شاہد ہیں تمام
خلقِ موجودات کی ترتیب ہے جو واں بیاں | اس سے اے ناداں تیری تکذیب ہے خود ہی عیاں
تین دن[1] میں عرش و فرش و صبح و شام و بحر و بر | سب کے سب بنکر زمیں میں سے اُگے نخل و ثمر
پر عجب تر یہ کہ چوتھے دن[2] بنے شمس و قمر | تا جماویں سلطنت اپنی وہ دن اور رات پر
ان کتابوں کے مصنف کو اگر ہوتا پتا | شمس ہی مرکز ہے دورِ عالمِ دوّار کا
گر زمیں کی ہر دو حرکت کی اُسے ہوتی خبر | جس سے ہوتے ہیں ہویدا موسم شام و سحر
واقفی ہوتی جو تاثیراتِ شمسی سے اُسے | ابخرے جن سے اُٹھے بادل بنے برسنے لگے
الغرض گر جانتا اسرارِ خلاقِ کبیر | تب وہ یوں کہتا کہ پہلے دن بنا مہرِ منیر
نوح کے طوفاں[3] سے کی غرقاب تو نے سب زمیں | پر نہ شامل تھے ترے جغرافیہ میں ہند و چیں[4]
تو نے جو کشتی بنا لی بہرِ نوحِ حق شناس | تین سو[5] ہاتھ اُسکی لمبائی تھی چوڑائی پچاس
یہ نرالے ڈھب کا گھر تھا گرچہ تنگ اور مختصر | پر بنا وہ تیری خوش فہمی سے زنبیلِ عمر
جس میں[6] کل روئے زمیں کے جملہ حیوانات کا | زادِ شش ماہہ سمیت ایک ایک جوڑا آ گیا
تو نے بخشے تھے جسے احیارِ موتے کے قوا | خود اُسی[7] کو تین دن تک قبر میں مُردہ رکھا
آسمانوں کی حقیقت سے اگر ہوتی خبر | تو نہ جسمِ عنصری کو بھیجتا افلاک پر
گر سنے تجھ سے حکایت سیرِ ذوالقرنین کی | اور روایت تیرے مشرق اور مغرب کی کوئی
گرم چشمے میں سنے خورشید کو گر ڈوبتا | فہم اور ادراک پر تیرے کہے سو مرحبا

[1] توریت کتاب پیدائش باب اوّل آیت اوّل تا ۱۳ - [2] توریت کتاب پیدائش باب اوّل آیت ۱۴ تا ۱۹
[3] توریت کتاب پیدائش باب ششم آیت ۴ - [4] چین اور ہندوستان کے حکما طوفان کے قائل نہیں اور کہتے ہیں کہ انکے ہاں طوفان سے پہلے کی کتابیں اور نوشتے موجود ہیں - [5] توریت کتاب پیدائش باب ششم آیت ۱۴ -
[6] توریت کتاب پیدائش باب ششم آیت ۱۹ - [7] حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ ہے جنکی نسبت روایت ہے کہ تین دن تک قبر میں رہے پھر زندہ ہو کر مع جسم آسمان پر چلے گئے ۱۲

یہ تو ہے تیری علووات کے بالاختصار | گشتے از خروار ہیں اور اندکے از صد ہزار
تیری کرتوتوں کا اک شمہ اگر کیجے بیاں | سیکڑوں دریائے خوں چشم بیاں سے ہوں رواں
تو نے ہی سقراط[۱] ایسے ہی کو بے جرم و خطا | دے کے حکم موت پلوایا پیالہ زہر کا
نار میں شیروں کے وہ مظلوم و بیکس دانیال | کر رہا ہے تیرے ہی ظلم و ستم کی قیل و قال
ہاں بگاڑا تھا تیرا بیچارے زکریا نے کیا | جسکو ہاتھوں نے تیرے آرے سے دو ٹکڑے کیا
کر رہا ہے طشت میں اس بیگنہ یحیے کا سر | راز طشت از بام خونریزی کا تیری سر بسر
ابن مریم کے لئے تو نے دیا حکم صلیب | تیرے نیزہ کا ہوا زخم اسکے پہلو کو نصیب
تو ہی بتلا دے کہ جون آف آرک[۲] کا تھا کیا قصور | جسکو جیتے جی کیا تھا تو نے ہی نذر تنور
بھاگتا پھرتا ہے کیوں لوتھر مقدس کو بہ کو | گر تعاقب میں نہیں ہے اس کے اے سفاک تو
کس نے ابن آمنہ کے قتل پر باندھی کمر | کس نے بندھوایا وطن سے آپ کا رخت سفر
کس نے رکھی اس جہاں میں سال ہجری کی بنا | ہر محرم میں یہاں ہوتا ہے کیوں محشر بپا
جعفر و زبیر و عمار و حباب و بلال | کر رہے ہیں تیرے ہی ہاتھوں سے کافر حال حال
ہو رہے ہیں آج تک صدیق و فاروق و غنی | مورد تشنیع کرتوتوں سے اے ظالم تری
شافعی کو دیکھ اور اس کے پانو کی زنجیر کو | بوحنیفہ کی دل آزاری کو اور تکفیر کو
بند قفل جیلخانہ میں ہوا کس جرم پر | اور بخاری کو وطن سے کس نے کروایا بدر
ہاتھ مالک کا ہی یوں بازو سے کیوں اکھڑا ہوا | کس کے کوڑوں سے بہا ہے خون اس کے جسم کا
صحن مسجد میں نسائی کو کیا کس نے شہید | خوار و رسوا کس نہ کروائے سعید و بایزید
کھال کیوں بو بکر نابلسی کی کھچوائی گئی | کیوں غزالی کی ہر اک تحریر جلوائی گئی
کون یورپ کو چڑھا لایا صلاح الدین[۳] پہ | لشکر رچرڈ کو کس نے تھا کیا زیر و زبر

[۱] ایتھنز دار الخلافہ یونان کا باشندہ ۱۲ [۲] ایک مقدس عیسائی عورت ۱۲ [۳] عیسائیوں کے صلیبی جنگ کی طرف اشارہ ہے جس میں رچرڈ شیر دل عیسائی فوج کا سپہ سالار ہو کر آیا تھا اور بڑی خونریزی اور قتل کے بعد نہایت ندامت سے واپس ہوا۔

ہسٹری اسپین کی کرتی ہے دل کو پاش پاش ۔۔۔ تھی جہاں صدیوں تلک اسلامیوں کی بود و باش
کر کے فرڈ ننیڈ کو آمادۂ ظلم و ستم ۔۔۔ تو نے ہی ایک ایک کے اخراج کی کھائی قسم
اک کو مارا تو نے چھینی دوسرے کی جائداد ۔۔۔ موج دریا کو کسی کا تو دشمن اب تک ہے یاد
ان دنوں میں سید احمد خان نے جب باندھی کمر ۔۔۔ قوم کی اصلاح پر اور خود تری بہبود پر
تو نے اسکو سیکڑوں باتیں کہیں ناگفتنی ۔۔۔ تجھ سے ہی اس نے خرافاتیں سنیں ناشنیدنی
خون ہزاروں بیگناہوں کا ہے گردن پر تری ۔۔۔ سینکڑوں سلجھاؤ قرباں ہیں اک الجھن پر تری
آگ غضب کی تو نے بھڑکائی ہے سب قوموں میں آگ ۔۔۔ باپ سے بیٹا جدا ہے ماں کو ہے بیٹے سے لاگ
کوئی زردشتی ہے کوئی بدھ موسائی کوئی ۔۔۔ کوئی ہندو ہے مسلماں کوئی عیسائی کوئی
شاذ و نادر ان میں ہم دردی ہو گر باہم کر ۔۔۔ آنکھ میں تیری تعصب سے لہو جاتا ہے بھر
علم سے نفرت ہے تجھ کو عقل کا دشمن ہے تو ۔۔۔ اتفاقوں کا مخالف مال کا رہزن ہے تو
گو بھلے مانس کمانوں کا ترے یہ حال ہے ۔۔۔ پر تری ابلہ فریبی کا بھی ایسا جال ہے
کوئی آنکھ ایسی نہیں ہے تجھ پہ جو شیدا نہ ہو ۔۔۔ کوئی دل دنیا میں ایسا ہے جس پہ تو پیدا نہ ہو
تو نے دے رکھی کسی کو دید ہونے کی نوید ۔۔۔ اور کسی کو راحت جاوید کی دی ہے امید
کوثر و تسنیم جنت کی کسی کو دی ہوس ۔۔۔ اور کسی کے سر میں وصل حور کا سودا ہے بس
پر جدا یہ تو بتا دی کہ یہ سب سبز باغ ۔۔۔ جس پہ تجھ کو اور تیرے شیدائیوں کو ہے دماغ
کس طرف ہیں کس جگہ ہیں کیا ہیں اور کیسی ہیں یہ ۔۔۔ آسمانوں کی طرح ہیں یا زمیں جیسے ہیں وہ

میں تو ڈرتا ہوں کہ ہیں جیسی تری ماضی و حال
تیرا استقبال بھی ہو ویگا صرف انفعال

(باقی آیندہ)

سراج الدین احمد

---

۱ اسپین میں جسکو مسلمان اندلس کہتے ہیں۔ تقریباً سات سو برس تک مسلمانوں کی سلطنت رہی اور شاہ فرڈ ننڈ کے وقت یہ لوگ بہت بے رحمی کے ساتھ وہاں سے نکالے گئے "

بادل

میں بھی اے ابر ترے حسن کا شیدائی ہوا
تری نیرنگی کا دیرینہ تماشائی ہوں
میری[1] آنکھوں نے تجھے دیکھ کے رو رو کے دیکھا
کہ زبان مژہ پر شکر ہے بینائی کا
اس قدر رُوپ انوکھے جو دکھائے تو نے
سچ بتا کس سے یہ انداز اڑائے تو نے
کبھی ہیبت بھری صورت تو بنا لاتا ہے
بن کے اک موہنی مورت تو کبھی آتا ہے
دل سے مجھ کو یہ تری عشوہ گری بھائی ہے
یہ ادا تجھ کو اسی شوخ نے سکھلائی ہے

چاندنی رات میں وہ ناز سے آنا تیرا
بن کے اک نور کا پتلا وہ دکھانا تیرا
چاند کو پیار سے سینے سے لگانا تیرا
اور کبھی دور اسے چھوڑ کے جانا تیرا
چاند کے حسن پہ کیا دل ہے ترا آیا ہوا
ہالہ کہتے ہیں جسے یہ ترا آغوش ہے کیا؟
دل لگی چاند سے تیری یہ مجھے بھاتی ہے
گو مری یاد کو بے چین یہ کر جاتی ہے

لطف رکھتا ہے گرج کر یہ برسنا تیرا
ہے یہ انداز نمائے غضب و رحم خدا
چشم معنی کو بہت کچھ نظر آیا اس میں
کھنچ گیا یُسر مع العُسر کا نقشہ اس میں

جبکہ جل جائے تمازت سے زمیں کا سینہ
حکمت آمیز ہے تھم تھم کے برسنا تیرا
پیاس کی آگ کو جس طرح بجھائے کوئی
جرعہ جرعہ کسی پیاسے کو پلائے کوئی

---

[1] شیخ ناسخ علیہ الرحمۃ کا شعر ایک لفظ بدل کر جڑ دیا گیا ہے ۱۲

جلوۂ برق تری موجِ تبسم تو نہ ہو؟ نعرۂ رعد ترا شورِ ترنم تو نہ ہو؟
ہائے البیلی یہ رفتار یہ بے ساختہ پن منعکس تیری ادا میں ہے حسینوں کا چلن
بے سبب کب یہ ترا جھوم کے یوں آنا ہے تو کسی ناز کے متوالے کا مستانہ ہے

تیرا اندازِ دلآویز جو اس کو بھایا ہار گردن میں تری قوسِ قزح نے ڈالا
گُل کھلاتی ہے تری آڑ میں سورج کی کرن کیسے رنگوں کے دکھاتی ہے دلآویز چمن
تیرے صدقے سے ہے گلگونِ شفق کی شہرت تیرے چہرے پہ دکھاتا ہے وہ اپنی صنعت
تیری مشاطہ ہیں دو، نورِ سحر رنگِ شفق تو ہے آئینۂ نیرنگیِ **حسنِ مطلق**
شاہدِ حسنِ ازل کا ہے تو برقع بیشک تجھ میں آتی ہے نظر اس رخِ روشن کی جھلک

ڈال کر اپنے دلِ زار کی حالت پہ نظر رشک آتا ہے مجھے تیری سبکباری پر
مخمصوں سے نہ غرض تجھ کو نہ غم کی پروا کام تیرا ہے ہواؤں سے کلیلیں کرنا
دردِ پنہاں سے نہیں اشک بہانے تجھ کو وسوسے کاہے کو آتے ہیں ستانے تجھ کو
پڑے پالا کبھی کیوں خوف و رجا سے تیرا ہے اگر کام تو ہے صدق و صفا سے تیرا
کب تلک دیکھئے تجھ کو نگہِ حسرت سے کاش میں تجھ میں پہنچ جاؤں کسی صورت سے

کسی ترکیب سے دنیا سے اٹھا لے اے ابر
اپنے نیرنگ کو اپنے میں ملا لے اے ابر

نیرنگ

انتظارِ بہار

یہ نظم جاڑے کے موسم میں لکھی گئی ہے۔ اور اُس وقت کا نقشہ کھینچتی ہے۔ ایک عرصہ سے ہمارے پاس پہنچ چکی تھی۔ مگر چھپنے کی اب نوبت آئی ہے۔

(باپ بیٹے کی گفتگو کشمیر میں)

بیٹا۔ آج کل کچھ ہے طبیعت بے قرار سختیٔ سرما سے ہے دل پر غبار
کانپتا ہے خود بخود جسمِ نزار دانت بجتے رہتے ہیں لیل و نہار
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ کس لئے ہوتے ہو بے چین اس قدر بات یہ کیا ہے شکایت کی مگر
یہ بھی اک موسم ہے ای جانِ پدر جو گذر جائیگا اپنے وقت پر
صبر کر بیٹا۔ اب آتی ہے بہار

بیٹا۔ جمع ہر جانب گھٹا سر پر ہوئی اور اک دلدل زمیں یکسر ہوئی
برف عالم کے لئے چادر ہوئی کٹھ کشو سے زندگی دوبھر ہوئی
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ یہ نہیں برف اک جہاں میں نور ہے نور ہے یا بارشِ کافور ہے
بارشِ الماس اور بلور ہے جلوہ برقِ جمالِ طور ہے
اس کے پیچھے پیچھے آتی ہے بہار

بیٹا۔ باغ ہے مُردہ تو بے دل باغباں پھول کیا عنقا ہے سبزی کا نشاں
جم کے پانی ہو گئے فولاد ساں ہے زمیں چپٹی تو بھورا آسماں
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ برفِ تازہ سے لدے ہیں کوہسار یا ہے چاندی کے پہاڑوں کی قطار
گلفشاں ہونے کو ہیں سب مرغزار ہے زمستاں میں شگوفہ کی بہار

اب کوئی دن میں ہی آتی ہے بہار

بیٹا۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرائے ہے — خود نکلتے ہیں۔ نہ کوئی آئے ہے
نکلیں کیونکر تیغ تو کاٹے کھائی ہے — اور ہوا سے ناک کٹتی جائے ہے

کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ ہیں لباسِ برف میں جلوہ کناں — کیا شجر کیا کوہ اور کیا وادیاں
فرش سے تا عرش سیمابی سماں — اک عظیم الشان منظر ہے جہاں

دیکھ لو اس کو پھر آتی ہے بہار

بیٹا۔ شکل سورج کی نظر آتی نہیں — دھوپ میرے دل کو گرماتی نہیں
بلبلیں بھی راگنی گاتی نہیں — ہائے یہ سردی کہیں جاتی نہیں

کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ جانِ من وہ رب ہے رب العالمیں — تیری ہی اک ننھی بستی کا نہیں
استوا کے پار ہے جو سرزمیں — آجکل سورج چمکتا ہے وہیں

اسکو گرما کر اب آتی ہے بہار

بیٹا۔ کوئی چنڈول ابر تک جاتا نہیں — کوہ۔ کوئل کی صدا لاتا نہیں
کوئی کستورہ بھی تو گاتا نہیں — اور میرے دل کو بہلاتا نہیں

کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ جانتے بھی ہو کہ وہ پروردگار — نعمتیں دیتا ہے ہردم بے شمار
اس کے لطفِ عام سے ہر چند اک — ایک کھوتا ہے تو پاتا ہے ہزار

صبر کر بیٹا اب آتی ہے بہار

بیٹا۔ ہائے وہ فرشِ زمرد ہے کہاں ۔ گھاس پر قالینِ مخمل کا سماں
جو بہاروں پہ چناری سائباں ۔ وہ زمینِ سبز پر سبز آسماں

اب بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ ستوا کے پار ہیں جو بستیاں ہیں ہزاروں آدمی بستے وہاں
رکھتے ہیں جو ہمسا دل اور ہمسی جاں آج کل پھر اُنکا حق ہے بجیاں
اُنکو خوش کر کے اب آتی ہے بہار

بیٹا۔ ہائے اب وہ چاندنی راتیں کہاں چاندنی کی سیر پانی کا سماں
موج سیمیں پرشعاعیں زرفشاں ہیں ول دریا ہیں گویا بجلیاں
اب بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ خوب پائی ہے طبیعت اے پسر کیسی بھولی تیری باتیں ہیں مگر
موسم سرما بھی سچ پوچھو اگر ہے کرشمہ فیضِ حق کا سربسر
صبر کر بیٹا اب آتی ہے بہار

بیٹا۔ سبز کہساروں میں وہ سبزہ آب جل اُس کی سطح صاف پر لاکھوں کنول
آئینہ سے جیسے پھول آئیں نکل یاد جی کر کر کے جاتا ہے مچل
اب بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ گر ہوائے دہر طوفانی نہ ہو اور سر کوہ برف افشانی نہ ہو
چشمہ دریا میں بھی پانی نہ ہو روئے کشتِ دل بھی لاثانی نہ ہو
جاڑا آتا ہے تب آتی ہے بہار

بیٹا۔ گاہ پہ سردی گئے وہ گرمیاں یاد جی کر کر کے ہوتا ہے تپاں
تھی خزانہ میں کمی کیا کچھ وہاں گر خدا رکھتا سدا یکساں سماں
کیوں ہمیں ترسا کے آتی ہے بہار

باپ۔ ایک ہی موسم اگر رہتا سدا قدر ہی ہوتی پھر اُس کی ہم کو کیا
جبکہ انساں فطرتاً ہیں سب جدا ہے یہی نیرنگِ عالم میں مزا

نت نیا جوبن دکھاتی ہے بہار

بیٹا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ مُلکِ کاشمیر ہوگا سچ مچ خطۂ جنت نظیر
پر نکل آیا وُہ پُورا زمہریر ہائے! ہم سمجھے نہ لفظِ کاشمیر
کچھ بتا بابا کب آتی ہے بہار

باپ۔ طعن اپنا شیوۂ ملت نہیں گر نہ ہو تکلیف تو راحت نہیں
اک زمانہ کی سدا حالت نہیں حیف ہے گر دیدۂ عبرت نہیں
صبر کر بیٹا اب آتی ہے بہار

بیٹا۔ اپنی گستاخی سے ہُوں میں شرمسار دل کچھ ایسا ہو گیا بے اختیار
ہاتھ سے جاتا رہا صبر و قرار کچھ تو کہیئے گا۔ یہ کب تک انتظار
اب بتا دیجے کب آتی ہے بہار

باپ۔ بات یہ کیا ہے بتانے کی پسر دُھوپ کی رنگت ہوا و ُنکا اثر
خود بخود بنکر روانِ ہر شجر دیگا مرغون کی زبانی یہ خبر
خوش ہو اے لوگو۔ وُہ آتی ہے بہار

صادق علی خاں (از سرینگر)

ماتم پسر

ہمارے ایک عنایت فرما رئیس بارہ مولا علاقہ کشمیر خواجہ صمد جو صاحب گگڑ ہیں۔ انہیں چند ماہ ہُوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا۔ خواجہ صاحب ذی علم۔ علم دوست رئیس ہیں اور خود زبانِ فارسی میں طبع شاعری اور مقبل مخلص کرتے ہیں۔ مگر اس رنج نے انکی طبّاعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے

اور انہیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے اُن کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درجِ ذیل ہے:-

اندھیرا حسن کا مکاں ہو گیا — وُہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا
بیاباں ہماری سرا بن گئی — مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اُڑ کے وُہ بلبلِ خوش نوا — چمن پائمالِ خزاں ہو گیا
نہیں باغِ کشمیر میں وُہ بہار — نظر سے جو وُہ گل نہاں ہو گیا
گیا کارواں اور ہیں راہ میں — غبارِ رہِ کارواں ہو گیا
گرا اشک کے آنکھوں سے لختِ جگر — مرے صبر کا امتحاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جانستاں — دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اس غضب کا خزاں نے کیا — بیاباں مرا بوستاں ہو گیا
ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے — کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا
کسی نوجواں کی جدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جدائی میں نالاں ہو بلبل نہ کیوں — وُہ گل زیبِ باغِ جناں ہو گیا
وُہ سرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وہی نذرِ برقِ طپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہمنشیں کس طرح — کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلامِ حسن کا فراق — کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

دیا چھین کے وُہ غم فلک نے اُسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

محمد اقبال

کشکول

واحد نے ہے جمع کا طلبگار ہوا ۔۔۔ جو سِرِّ عظیم تھا وہ اسرار ہوا
اِک نور تھا اُس میں جب ہوئی جمع صفت ۔۔۔ بڑھتے بڑھتے وہ نور انوار ہوا

(انتہری)

اللہ ہے نور اہرمن ظلمت ہے ۔۔۔ اِک شمع ہے اک دھوئیں کی خاصیت ہے
ہم تم ہیں ضیائے شمعِ ذاتِ باری ۔۔۔ یہ شرحِ صفات و ذاتِ احدیت ہے

(〃)

مٹی کا کرہ بنانے والے ہم ہیں ۔۔۔ پانی اُس پر بہانے والے ہم ہیں
پانی پہ ہوا ہوا پہ آتش دیکھو ۔۔۔ اضداد کو یوں ملانے والے ہم ہیں

(〃)

ہے آگ کو پانی میں بنایا ہم نے ۔۔۔ پانی کو ہوا میں ہے بچھایا ہم نے
پانی میں ہوا ہوا میں پانی دیکھو ۔۔۔ یہ معجزہ دنیا کو دکھایا ہم نے

(〃)

روٹھی ہوئی نگاہ نے تلواریں مار کے ۔۔۔ ٹکڑے اڑا دیئے دلِ امیدوار کے
وحشت سنبھل کہ ہم تو کہیں کے نہیں رہے ۔۔۔ مسکن کے ہیں پتے نہ ٹھکانے مزار کے
شعلہ کسی کی برقِ نظر کا تڑپ گیا ۔۔۔ روشن ہوئے چراغ دلِ داغدار کے
یہ چاہے جس طرف ہمیں لے جائے جائینگے ۔۔۔ ہیں اختیار میں دلِ بے اختیار کے
اب جی میں ہے کہ پھینک دیں پہلو سے چیر کر ۔۔۔ برسوں اٹھائے ناز دلِ بے قرار کے
جوبن پہ داغِ دل ہیں فدا سیر تو کرو ۔۔۔ دیکھو تو ہم نے پھول چُنے کس بہار کے

صیاد نے چمن کی ہوا تک نہ دی ہمیں   آئے بھی اور چلے بھی گئے دن بہار کے

تن تن کے اس طرح سے تو انگڑائیاں نہ لے
شاعرِ نثارِ تیرے انوکھے خمار کے

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

مسکن کبھی کوئی قبر سے بہتر نہیں ملتا   آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا
پھر دیکھ لوں اُن روٹھی نگاہوں کی میں قرباں   اُٹھنا اُسی انداز سے کہ کر نہیں ملتا
کیا اشک بھرے بیٹھی ہیں وُہ بزم عدو میں   نرگس کے کٹوروں میں یہ جوہر نہیں ملتا
اِس واسطے کہتے تھے ستانا نہیں اچھا   شاعر کئی دن سے ترے در پہ نہیں ملتا

(")

کہاں گیا مرا گل، ہزار کر کے مجھے   خزاں رسیدہ عینِ بہار کر کے مجھے
نہ جانے اُن کی نگہ نے کیا تھا کیا جادُو   وُہ کھینچ لے گئے بے اختیار کر کے مجھے
کسی کا یاد ہے شوخی سے وُہ چلا جانا   جھلک دکھا کے مجھے بے قرار کر کے مجھے
الٰہی شکر! لگانے لگے جو مرہمِ لطف   نگاہِ خشم سے وُہ دلفگار کر کے مجھے
اُڑا چکا ہُوں بہت خاک ہونگا وِ کرم   بلند کبھی تو کرو بے وقار کر کے مجھے
غضب ہی بھولا پن انکا ہیں کائنات تھا کیا   وُہ بھولے پھرتے ہیں اپنا شکار کر کے مجھے
اگرچہ ملنے کو آتے ہیں پر ذرا کی ذرا   مزے وُہ لیتے ہیں پُر اضطرار کر کے مجھے
متاعِ صدقہ خُوبانِ ناز پرور ہُوں   بڑھا ہے مرا رُتبہ نثار کر کے مجھے

دماغ اہلِ جہاں میں مہک ہو میری نذیر
بکھرا دے نافۂ مشک تار تار کر کے مجھے

(نذیر حسین احمد انبالوی)

تین نقشے

ایک روپے میں

آجکل حجاز ریلوے کے متعلق اخبارات میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے اور اس لین کی تیاری کی خبریں روز بروز مشتہر ہوتی رہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ناظرین اخبار کو خاص دلچسپی اس ریلوے کے حالات اور اس ملک سے جس میں سے ہو کر وہ ریل گذریگی پیدا ہوگئی ہے۔ اور مسلمانوں کو مخصوصاً بسبب مذہبی تعلق کے اور بھی زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے حمیدیہ ایجنسی لاہور نے تین نقشے اپنے حمیدیہ پریس میں نہایت کوشش اور [illegible] سے چھپوائے ہیں۔ ایک میں ٹرکی کی تمام ریلوے لینیں دکھائی گئی ہیں اور ساتھ [illegible] مشہور مقامات جو ان پر واقع ہیں۔ دوسرے میں ایشیائی روم کی ریلیں۔ اور تیسرے میں حجاز ریلوے۔ اچھے کاغذ پر چھپے ہیں تینوں کی قیمت ایک روپیہ ہے [illegible] ایک منگا لیں اور دیکھیں اور [illegible] احباب کو بھی دکھائیں

مشتہر

[illegible]

بچوں کا اخبار

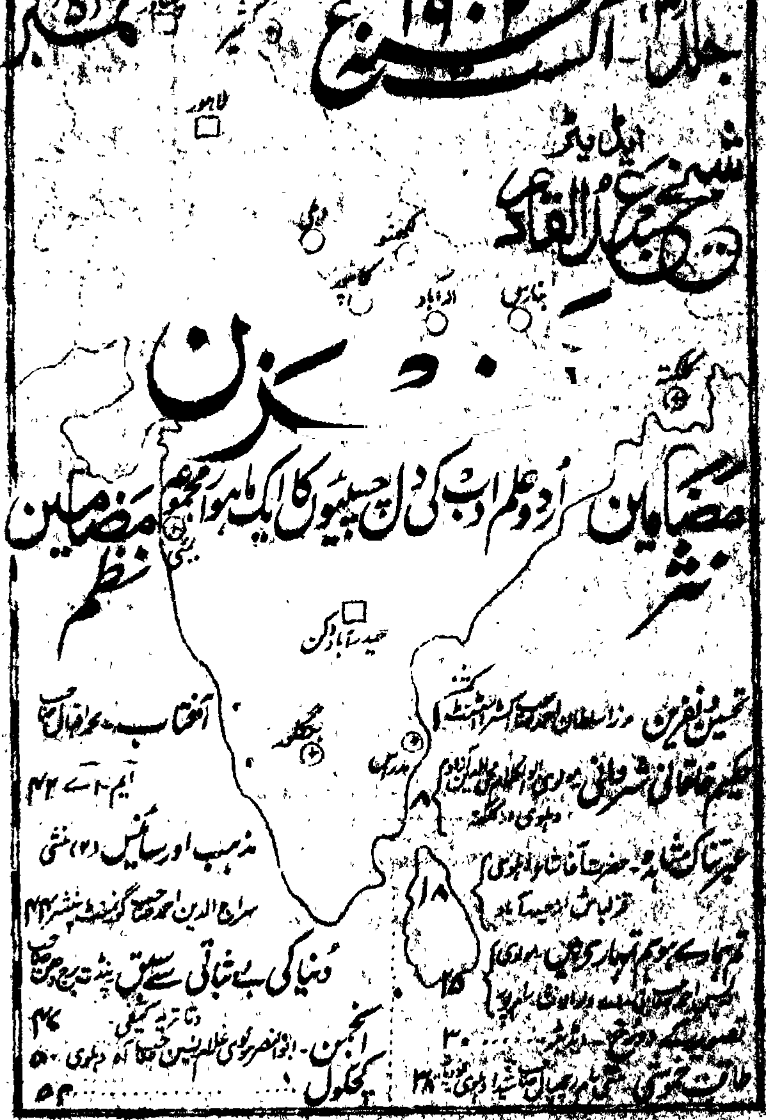
کارخانہ پیسہ اخبار سے یہ نیا ماہوار رسالہ بچوں کے خاص مطالعہ کے لئے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پہلا نمبر ماہ مئی میں شائع ہو چکا ہے۔ معزز ہمعصروں نے پہلے پرچہ کو نگاہ پسندیدگی سے دیکھا ہے۔ اور متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ کہ بچوں کے اخبار کی ملک میں بہت ضرورت تھی۔ کوشش کیجائیگی۔ کہ اسے ہر پہلو سے بچوں کے لئے دلچسپ بنایا جائے۔ اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ تعلیمی فائدہ بھی حاصل ہو۔ افسران محکمہ تعلیم نے بھی اس ارادہ سے بہت ہمدردی ظاہر فرمائی ہے۔ مگر اس کی پوری کامیابی ملک اور اہل ملک کی قدر دانی پر منحصر ہے۔ اسکی لکھائی چھپائی کی عمدگی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحہ کا (۲۲×۱۸) کی تقطیع پر ہے اور اس کی قیمت سالانہ پیشگی عہ معہ محصولڈاک ہے۔ درخواستیں بنام مشتہر آنی چاہئیں۔

المشتہر

منیجر پیسہ اخبار۔ لاہور

جلد ۳ - اگست ۱۹۰۲ء — نمبر ۵

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی اے



مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

وہ گروہ ہندوستانی جو اردو بولتے ہیں۔ اور اس کی تعداد اور ہندوستان ...
○ ان شہروں ... اردو ... زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو ...

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبد القادر بی اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

لاہور سے ہر ایک انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور نامہ نگاروں کے علاوہ ایک معقول تعداد نئے اور ہونہار اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں پائے ہوئے اصحاب جن کو آج تک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا۔ شوق سے اسکے بنانے میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کی طرف سے نہوں۔ مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود ہو۔ رسالہ کا حجم (۱۸×۲۲) کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ صفحہ کا ہے۔ قیمت عمدہ دبیز ولایتی کاغذ پر بلا محصول تین روپیہ [illegible] اور دوم درجے کے کاغذ پر دو روپیہ [illegible] اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا۔ محصول ڈاک دونوں صورتوں میں [illegible] آنہ سالانہ ہے۔

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنی چاہئے۔ ادھار کا کوئی حساب نہیں۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ **شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر**

شرح اجرت اشتہارات

مخزن اشتہارات کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ اس کے خریداروں کی لمبی فہرست میں پنجاب کے لوگ بھی ہیں۔ اور صوبجات متحدہ وغیرہ کے بھی۔ اضلاع دکن اور حیدرآباد میں بھی بکثرت بکتا ہے۔ اور وہاں کے امرا اور رؤسا کی ایک کثیر تعداد اس کے قدردانوں میں ہے۔ شمالی ہندوستان کے بھی معزز مسلمانوں کے اسمائے گرامی اسکی فہرست میں شامل ہیں۔ اس کے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیت اشتہار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک سہ ماہی کے لئے آزما کر اگر فائدہ نظر آئے تو سال بھر کا معاہدہ کریں۔ اجرت اشتہارات فی صفحہ سال بھر کے معاہدے کے لئے [illegible] ششماہی کے لئے [illegible] اور سہ ماہی کے لئے [illegible] روپیہ۔ نصف صفحہ سال بھر کے لئے [illegible] روپیہ ششماہی کے لئے [illegible] اور سہ ماہی کے لئے [illegible] اتفاقی اشتہارات کے لئے [illegible] فی سطر۔ اس شرح میں کمی کی گنجائش نہیں۔

شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر

تحسین و نفرین

ہمارے مکرم جناب مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جن کا فلسفیانہ سلسلۂ مضامین بعنوان تبادلۂ خیالات اوراقِ مخزن میں شائع ہو رہا ہے ۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے ۔ مندرجہ ذیل مضمون میں جو غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ۔ ہمارے اہل وطن کی طبیعتوں کے ایک خاص نقصان وہ ضعف کی طرف توجہ دلاتے ہیں ۔ امید ہے کہ ابنائے وطن اس پر غور فرماوینگے ۔ اور یہ عادت پیدا کرنے کی کوشش کرینگے ۔ کہ جو تحسین کا مستحق ہو اُس کو بیا فنی سے داد دیں ۔ اور جو قابل نفرین ہو ۔ اُسے بیدھڑک نفرین کہیں ۔ کیونکہ اس عادت کے راسخ ہونے کے ساتھ فی الواقع قومی ترقی ایک معقول حد تک وابستہ ہے :۔

خواہ ہم کسی قانون اور کسی مشرب کے پابند ہوں ۔ خواہ معاد اور معاشرت دونوں کے قائل ہوں ۔ اور خواہ صرف معاشرتی قوانین کو ہی مانتے ہوں ۔ ہر حالت میں ہم اپنی چند روزہ زندگی میں اعمال اور افعال یا خیالات کا ایک مسلسل سلسلہ رکھتے ہیں ÷

جُوں ہی اس دنیا میں ہم وارد ہوتے ہیں ۔ اس وُرود کے ساتھ ہی کسی نہ کسی طرح سے سلسلہ اعمال کا شروع ہو جاتا ہے ۔ بہت سے ہمارے ایسے اعمال یا خیالات ہیں کہ جو دیگر نوعِ انسان کی نقاد نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں ۔ یا نوعِ انسان کو اُن کی نسبت رائے قائم کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا ۔ بہت سے ایسے اعمال یا خیالات ہیں کہ جو نوعِ انسان کی نگاہوں سے

گذرتے ہیں اور اُن پر ریویو کیا جاتا ہے ؛

خواہ ہم معاد کے قائل ہوں اور خواہ نرے معاشرتی قوانین کے متبع ۔ دونوں حالتوں میں یا ہم نے اعمال اور افعال یا خیالات کے متعلق چند قوانین وضع کر رکھے ہیں ۔ یہ بحث جُدا ہے کہ وہ قوانین بذاتہ کس حیثیت اور کس پایہ کے ہیں ۔ اُن قوانین کے ذریعہ سے ہم اعمال اور افعال یا خیالات کا موازنہ کرتے رہتے ہیں ؛

اس عمل ایزان سے ہم بعض اعمال یا افعال اور خیالات کو اچھے قرار دیتے ہیں ۔ اور بعض کو ناقص یا مکروہ ۔ گو نقص و عمدگی اور حُسن و خوبی و زشتی کے تعین میں اکثر اوقات اختلاف پڑجاتا ہے ۔ اور تاویلی قانون حسن و خوبی اور بدی و زشتی کے پیمانہ یا معیار کو مختلف ثابت کرتا ہے لیکن اس بحث کو علیحدہ کر کے تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہمارا قانون یا اصول خواہ کچھ ہی ہو بہرحال اعمال ۔ افعال اور خیالات کو وزن کیا جاتا ہے ؛

نوعِ انسان نے ضرورت ۔ نتیجہ ۔ تاثیر ۔ نتیجہ ۔ اور حصل کے لحاظ سے اعمال ۔ افعال اور خیالات کے نام اور خصوصیات اور درجے مقرر کر رکھے ہیں ۔ خواہ یہ تعینات معادی اصولوں کی رُو سے ہوں اور خواہ معاشرتی ضروریات کے اعتبار سے ؛

ہم بعض اعمال کو نیک کہتے ہیں ۔ اور بعض کو بُرا ۔ بعض کو خوب قرار دیتے ہیں اور بعض کو زشت ؛

یہ تقسیم خواہ کسی حقیقت پر محمول ہو اور خواہ فرضی ۔ اُس دائرے میں جہاں اس کی بنیاد رکھی گئی ہے صحیح تسلیم کی جاتی ہے ۔ اور طبیعتوں یا دلوں اور دماغوں پر اُس کا ایک اثر ہوتا ہے اور قوم یا سوسائٹی کے اکثر امور معاشرتی یا معادی کا اس تاثر پر ہی انحصار ہے ۔ نوعِ انسان اس وقت عموماً تین قسم کے قوانین کے تابع ہے ۔ ۱ ۔ قانون معادی ۔ ۲ ۔ قانون معاشرتی ۔ ۳ ۔ قانون حکومتی ۔ جس تقسیم کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اُس کی بنیاد عموماً قانون معاد اور قانون معاشرت پر ہے ۔ گو قانون حکومتی کے اکثر اجزا بھی انہی دونوں ضابطوں سے لئے گئے ہیں ۔

مگر وہ قانون بہرحال بمقابلہ ان دونوں قوانین کے ایک جبری قانون ہے +

اعمال ـ افعال اور خیالات کا تنقیدی عمل اور اس تقسیم یا اثر کا بنیادی ضابطہ خود نوعِ انسان کی نیچرل آرزو یا خاصہ ہے ـ نوعِ انسان بہ حیثیت مجموعی اور بہ حیثیت افراد چاہتی ہے کہ اُس فعل اور ترک فعل پر ریویو کیا جائے اور ایک رائے قایم کی جاوے +

تعینِ رائے سے انسان یا عامل کے دل میں ایک قسم کا قابلانہ یا نفرتی جوش پیدا ہوتا ہے ـ یا یوں کہو کہ یا تو اُس کے دل پر مایوسی اور بیزاری کا اثر ہوتا ہے اور یا اُمید اور خوشی کا سماں بندھ جاتا ہے +

جب دوسرے انسان یا دوسری طاقتیں اِن دونوں حالتوں کی بابت کھلے الفاظ میں یا عملی طور پر اظہار کرتے ہیں ـ تو انسان اُس پر توجہ کرتا اور اُس سے متاثر ہوتا ہے +

یہ اظہار دو ہی قسم کا ہوگا ـ تحسینی الفاظ میں یا نفرتی جملوں میں +

نوع انسان جن اعمال ـ افعال ـ اور خیالات کو اپنے ضوابط کی رُو سے قبول کرتی ہے وہ تحسین کے مستحق ہوتے ہیں اور جن کو قبول نہیں کرتی وہ مستوجبِ لفرین ـ ان حالات کے لحاظ سے ہمیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے ـ کہ انسان طبعًا تحسین سے خوش ہوتا اور نفرین سے ندامت حاصل کرتا ہے ـ یا یوں کہو کہ نوعِ انسان طبعی طور پر تحسین کی آرزومند اور نفرین سے نافر ہے ـ بعض حکیموں نے یہ بحث کی ہے کہ اعمال کا باعتبار تحسین اور نفرین کے فعل یا ترک بجائے خود ایک کمزور پولیسی ہے ـ لیکن جس درجہ پر پہنچ کر ان حکیموں نے یہ رائیں قایم کی ہیں یا جس آفتاب تحقق سے یہ کرنیں نکلتی ہیں وہ آسمانِ تحقق کا ایک اعلیٰ درجہ ہے ـ معاشرتی ضروریات اور عروج و تنزل کے لحاظ سے ہر ایک فردِ نوعِ انسان تحسین کا خواہاں اور نفرین سے نفور ہے +

جو لوگ تحسین سے بھی نفرت گزیں ہو جاتے ہیں وہ اس آرزو کے تارک ہوتے ہیں نہ یہ کہ اُن میں طبعی طور پر یہ خواہش ہی نہیں ہوتی ـ وجود آرزو اور شے ہے ـ اور ترک آرزو

اُور نشے ◆

ہر ایک قسم کے قانون میں جو انسان کے واسطے موضوع ہے تحسین اور نفرین کا ضابطہ موجود ہے۔ معادی قوانین میں اُس کو اور الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معاشرتی اور حکومتی ضابطوں میں اور طریق پر۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ نوع انسان کے اعمال اور افعال کا ریویو ہوتے رہنا انسانی ترقیات کی کل کا ایک اعلےٰ جزو یا ضروری پُرزہ ہے ◆

معادی قوانین میں سزا اور جزا کا ضابطہ دراصل ایک تحسین اور نفرین ہے۔ یہ کہنا کہ اس فعل سے جنت ملیگی اور اس ترکِ فعل سے دوزخ۔ تحسین اور نفرین کی تفصیل کی ایک صورت ہے ◆

حکومتی قوانین میں یہ ذکر کہ جو شخص ان افعال کا مرتکب ہوگا۔ اُس کی پاداش یہ ہوگی۔ اور جو یہ کریگا اُس کا انعام یہ۔ درحقیقت بالفاظ دیگر تحسین اور نفرین کی ہی تبلیغ ہے۔ انسان کا کوئی کام ایسا نہیں ہے۔ کہ جس میں اصولِ معاد یا معاشرت کے اعتبار سے تحسین اور نفرین کی ضرورت نہ ہو ◆

ایک فلسفی کہتا ہے کہ ہر ایک مہم اور ہر ایک امر کے لئے تحسین اور نفرین دو عملی علاج ہیں اِن عملوں سے معاشرتی مشین ہمیشہ اپنے اصلی مرکز پر قایم رہتی ہے۔ تحسین سے غرض یہ ہے کہ جو شخص ایک کام میں مصروف ہے یا جو جماعت ایک کام کر رہی ہے وہ حوصلہ اور امید کے ساتھ بدستور اپنا کام کرتے رہیں۔ اور اُن کے حوصلہ اور ہمت میں روز افزوں ترقی اور افزائش ہوتی جاے۔ اور دوسرے افراد کو بھی اُس روش پر چلنے اور عمل کرنے کی تحریص اور ترغیب ہو ◆

تحسین ترقی کی ماں اور اقبال مامحۃ ام کی کُنجی ہے۔ اور انسان کی کوششوں اور مساعی کا ایک باضابطہ معاوضہ۔ تحسین کا نعرہ درخواست اور التجا سے نہیں نکلتا۔ بلکہ نوع انسانی سے خود ہی بے اختیار وقعت پر نکلجاتا ہے۔ ایک آدمی اچھا کام کرتا ہے اور لوگ خود بخود

ہی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایک اکھاڑے میں ایک پہلوان اچھے داؤ چلتا ہے۔ ناظرین بلا درنگ آہا! کہہ اٹھتے ہیں ✤

ایک اچھا نمونہ ایک اچھی چیز ایک دلکش سماں ایک خوبصورت آدمی ایک اچھی نظم ایک دلاویز گیت دیکھتے اور سنتے ہی ہر انسان اپنے اپنے مذاق کے موافق طبعی جوش سے رطب زنی اور واہ واہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایک شاعرِ شیریں مقال یا واعظِ صوفی خصال کے ترکیب دادہ الفاظ کے سنتے ہی کیوں دلوں میں اثر ہو جاتا ہے اور کیوں ہمدردی ہوائیں رگ و ریشہ میں دورہ کرنے لگتی ہیں۔ وہ کون سی طاقت ہے جو انسان کو راہ جاتے ٹھیرا لیتی ہے اور اس کے منہ سے بے ساختہ یہ تحسینی الفاظ کہلواتی ہے؟ یہ وہی طاقت ہے یہ وہی جوش ہے جو انسان کے دل میں طبعی طور پر تحسین اور نفرین کے نام سے پایا جاتا ہے۔ تحسین کے مقابلہ میں نفرین ایک دوسری قسم کا معاوضہ ہے۔ اگر ایک آدمی اچھی حالت میں اچھے معاوضہ کا حق دار ہے۔ تو بری حالت میں برا معاوضہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تحسین قدر دانی یا قدر افزائی ہے۔ اور نفرین بے قدری یا تذلیل۔ نفرین سے برائیوں اور ناقص خیالات کا انسداد ہوتا ہے اور نوعِ انسان پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ ایسے افعال سے ایسے نتیجے پیدا ہوا کرتے ہیں ✤

جو قومیں تہذیب یافتہ ہیں اور اخلاقی جرأت (مورل کریج) رکھتی ہیں۔ اُن میں تحسین اور نفرین کو عملی طور پر معرضِ اظہار میں لانے کا رواج ہے۔ اور ان دونوں عملوں سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ لیکن جن قوموں میں ابھی اخلاقی جرات کی کمی ہے۔ اُن میں باوجود اِس مادہ کے موجود ہونے کے اس سے عملی فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا ✤

وہ امور جو سود مندی یا ناسود مندی کے لحاظ سے مشترکہ اغراض کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ امور جو قریباً منفردانہ ہیں ان دونوں کی نسبت تحسین اور نفرین کے نام سے ریویو ہونا چاہیئے جو لوگ قوم یا ملک کے واسطے کسی قسم کا کام کر رہے ہیں یا اُن کا وجود باعتبار بعض ضروریات مفید ہے

ضروری اور لابدی ہے۔ کہ ان کے کاموں کو ہمیشہ تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جاوے۔ اور جس معاوضہ کے وہ مستحق ہیں وہ اُن کو دیا جاوے۔ اور جو نفرین کے قابل ہیں۔ اُن سے عملی نفرت کا اظہار کیا جاوے ۔

اچھائی کی ترویج یا بُرائی یا نقص کے انسداد کے لئے جیسے عام تحسین اور نفرین کی ضرورت ہے۔ اور جیسے اس کا اثر ہوتا ہے اور کسی عمل کا نہیں۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ جب ذاتیات کی بحث کو الگ رکھا جاوے اور قومی کاموں اور سوسائٹی کی ضروریات کو ایک جداگانہ شے سمجھ کر ان سے ترقی کی جاوے ۔

جن ملکوں اور جن قوموں میں تحسین اور نفرین کا صادق عمل جاری نہیں ہے وہاں گویا گیہوں و جو کا ایک ہی بھاؤ ہے۔ ایسے ملکوں کی انجمنیں۔ کارخانے۔ اخبارات۔ رسالے۔ مصلح۔ ہمدرد۔ کیوں کامیاب نہیں ہوتے؟ اور کیوں اُن کی محنتوں۔ مساعی۔ اور خیالات میں مایوسی غالب رہتی ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ اُن کی خدمات کا اُن کی قوم منصفانہ اندازہ نہیں کرتی ۔

جو لوگ بدکن اور اخلاق سوز عادات رکھتے ہیں پبلک اُنہیں اُنہی نظروں سے دیکھتی ہے جن سے اچھوں کو دیکھتی ہے۔ اِس حالت میں اُن کو کوئی تنبیہ یا تادیب نہیں ہوتی ۔

جب تک عملی طریقوں سے نیکی کو ترقی اور بدی کو شکست نہیں دیجاویگی۔ تب تک قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ جو لوگ اچھا کام کرتے ہیں وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اُن کی تحسین کی جاوے۔ اور اُن کے حوصلوں کو بڑھایا جاوے۔ اور جو لوگ خودغرضی سے اِس میدان میں آتے ہیں۔ ضرور ہے کہ اُن کو نفرین کی نگاہوں سے دیکھا جاوے۔ ہمارے اعمال نوعِ انسان سے کیا چاہتے ہیں منصفانہ ریویو۔ نوعِ انسان کی طرف سے ہمیں کیا مِلنا چاہیے؟ تحسین یا نفرین۔ تحسین اور نفرین کا کیا اثر ہے؟ تحسین ہمارے ارادوں کو

بڑھاتی اور ہماری ہمت میں قوت بخشتی ہے۔ اور اس سے دوسروں کو بھی اچھے کاموں کی ترغیب ہوتی ہے۔ نفرین ہمیں برائیوں اور کم ہمتیوں سے باز رکھتی ہے اور اوروں کو عبرت دلاتی ہے +

اگر ایک انجمن۔ یا ایک اخبار یا ایک رسالہ قوم کی خدمت کر رہا ہے۔ تو وہ اس صورت میں ترقی پا سکتا ہے کہ جب پبلک اس کی خدمات کا ریویو کرتے ہوئے اس کی تحسین اور ہمت افزائی کا باعث ہو۔ جو شخص اچھا کام کرتا ہے۔ جو جماعت اچھی خدمات پیش کر رہی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کی داد دیجاوے۔ جو شخص اپنی خدمات کی داد چاہتا اور اپنی قدرافزائی کا آرزومند ہے۔ وہ ایک طبعی خواہش کا خواہشمند ہے +

ہماری ترقی اور ہماری رونق صرف تحسین اور نفرین کے دو الفاظ کے قیمتی فلسفہ پر مبنی ہے +

سلطان احمد

تارے سے گفتگو۔

ٹمٹم کرتے چھوٹے ستارے — حیراں ہوں تو کیا ہے پیارے
دنیا سے اونچا بادل میں۔ — ہیرا سا کالی مخمل میں۔
ناز سے آنکھیں جھپکنے والے — حسن میں اپنے دمکنے والے
اندھیرے میں حق کی شان ہے تو — راہی کی یا ان کی جان ہے تو
سر پہ سبھوں کے چمکنے والے — آنکھوں پہ سب کے رہنے والے
کس صناع نے تجھ کو بنایا — کس نے تجھ میں جلوہ دکھایا
صانع کو تیرے کس سے پوچھوں — جانی کو اپنے کس سے پوچھوں
کیسے کوئی پتا بتلا دے — کو پہنچے کی اس کے راہ لگا دے!
پیارے کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں — پاؤں پڑوں ان ہاتھوں کو چوموں

(نذیر حسین احمد)

حکیم خاقانی شروانی

شعرائے پارس کے تذکرے اگرچہ فارسی زبان میں بہت سے لکھے گئے اور اکثر مشہور شعرا کے حالات ہر ایک تذکرہ نویس نے قلمبند کئے مگر سچ پوچھو تو جامعیت کا اطلاق ایک تذکرے پر بھی نہیں ہو سکتا۔ ہندستان میں آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ بڑی محنت سے لکھا تھا اور دعوے کیا تھا کہ کم و بیش تمام خوشگو شعرائے فارس کے حالات اس میں جمع کئے گئے ہیں مگر جب دیکھنے والوں نے دیکھا تو سوائے چند مشہور شاعروں کے حالات کے اور کچھ نہ پایا۔ اور یہ کچھ الزام آزاد ہی پر نہیں ہے بلکہ تمام تذکروں کی یہی کیفیت ہے۔ حال میں علامہ ہدایت نے ایک ضخیم تذکرہ مجمع الفصحا کے نام سے ایران میں لکھا ہے اور وہیں چھپا بھی ہے۔ ہم نے اُسے بھی اول سے آخر تک چھان ڈالا۔ بہت سے شاعروں کے حالات نظر نہ آئے۔ خیر یہ تو حال فارسی تذکروں کا ہے۔ اردو کے معلے تو اپنے شاعروں کے مذاکرے سے بھی محروم تھی یہ تو پروفیسر محمد حسین آزاد کی عنایت ہے کہ انہوں نے آب حیات لکھ کر کلنک کا ٹیکہ مٹایا۔ ہم نے یہ حال دیکھ کر ایک تذکرۃ الشعرا کی بنا ڈالی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جامعیت کا لطف پیدا کیا جاوے۔ ساتھ ہی پرانی طرز کو ترک کر کے سوانح کے عمری کے طور پر حالات لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور مختلف مقامات سے تذکرے جمع کر کے پہلی جلد تالیف کی گئی ہے۔ جس میں سے نمونہ کے طور پر حکیم افضل الدین خاقانی کی لائف ناظرین مخزن کی دلچسپی کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

(ابوالکلام آزاد دہلوی از کلکتہ)

زدیوان ازل منشور کا دا در میاں آمد | امیری جملہ را داوند و سلطانی بخاقانی
برائے حجت معنی براہینے پدید آمد | ز پشت آزر و صنعت علی نجار شروانی

آج ہم اُس افصح الفصحا و اشعر الشعرا کے حالات رقم کرتے ہیں جو چرخ فصاحت کا بلند پرواز شہباز تھا۔ اور نیستان بلاغت کا ایک دلیر شیر تھا جس نے نہ صرف نظم پارس میں فصاحت و بلاغت کی روح پھونکی بلکہ اُس کو نازک خیالی کے بوتہ میں ڈال کر کدورتوں سے

صاف کیا اور ایسا صاف کیا کہ اُس کی چمک دمک پر سیکڑوں کی نظریں پڑنے لگیں۔ اور جس جوانمرد سخن نے نظم پارس کو ۔ باعی اور غزل کی قید سے آزاد کر کے ترقی کے اعلیٰ مینار پر پہنچا دیا +

اس شیریں بیان شاعر کا نام نامی حکیم افضل الدین ابراہیم بن علی نجار شیروانی ہے اصل آبائی وطن اس کا بیلقان ہے لیکن (غالباً) زیادہ سکونت کے سبب سے شیروانی مشہور ہوگیا۔ رشید الدین وطواط و اثیر و ظہیر اور فخر الدین و شاپور و کمال الدین کا ہمعصر ہے لیکن اپنے کمال کے سبب سے سب سے بڑھ چڑھا فوقیت لے گیا اس کی صحیح تاریخ ولادت باوجود تحقیق و تجسس بسیار نہ معلوم ہوئی۔ تذکرہ مرآة الخیال۔ خزانۂ خیال۔ خزانہ عامرہ۔ تذکرہ دولت شاہ۔ ریاض الشعرا علامۂ قہستانی۔ آتشکدہ۔ تذکرہ شمع انجمن۔ مآثر الامرا۔ صبح صادق۔ گلزار عجم۔ ارمغان شعرا۔ یادگار شعرا۔ تحفۃ العجم۔ کلام مقبول۔ یادگار ناظم وغیرہ وغیرہ تمام تذکرے چھان ڈالے مگر کچھ پتا نہ چلا مجمع الفصحا مطبوعۂ ایران تالیف علامہ فخر المتاخرین رضا قلی خاں ہدایت سے اتنا پتا بیشک چلتا ہے کہ پانچویں صدی کے اوائل میں یہ صبح صادق کا چمکتا ہوا تارہ عالم اجسام کے آسمان پر نمودار ہوا اور اہل عجم کے لئے نیر اعظم ہو کر چمکا جس کی روشنی نے نہ صرف مشرق ہی کو روشن کیا بلکہ اپنی تیز شعاعوں سے اہل مغرب کی بھی آنکھیں روشن کر دیں +

ہمارے نامور ہیرو کے والد کا پیشہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے غالباً نجاری تھا۔ کیا عجب ہے کہ آبا و اجداد بھی یہی پیشہ ہو مگر اس بارے میں تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں +

جب ہمارا ہیرو سن تمیز کو پہنچا تو تحصیل علوم ضروری کے بعد اپنے خسر اور واجب التعظیم بزرگ ابو العلائی گنجوی کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم ادبیہ اور حکمیہ حاصل کرنے لگا طبیعت کی موافقت اور ذہن کی رسائی تو فطری تھی پھر اُستاد کامل اور شفیق ملا دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں فضل و کمال کا دریا بہا دیا +

انسان کا قاعدہ ہے کہ جس قسم کی سوسائٹی میں وہ ہوش سنبھالتا ہے اور جس قسم کی باتوں میں

آنکھیں کھول کر اپنے کو مبتلا دیکھتا ہے اُسی طرف اُس کا قلبی رجحان ہوتا ہے اُس زمانہ میں شاعری کی مارا ماری تھی اور تمام علوم میں شاعری کو افضل سمجھا جاتا تھا۔ فردوسی اور اُس کا شاہنامہ محمود غزنوی نے دیکھا نہیں اور اُس کا دربار اُس زمانہ میں ایسا تھا جیسے آج کل غالب و ذوق اور مرحوم بہادر شاہ جیسے آج کل اُن کی حکایتیں مشہور اور معروف ہیں اور اُن کے دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں اسی طرح اُس زمانے میں فردوسی اور محمود غزنوی کی حکایتیں زبان زد خاص و عام تھیں۔ ہر ایک شخص کو شاعری کا شوق و ذوق تھا اور اسی خیال میں سرمست تھا جس علمی مجلس میں جاؤ تو وہاں منطق اور فلسفہ کی پریشان کن دماغ بحثوں کی بجائے شاعری کی خوش کن بحثیں ہوتی نظر آئینگی۔ جس دربار میں پہنچو اسی شاعری کے دلکش راگ گاتے ہوئے دکھائی دینگے۔ خون لگا کے شہیدوں میں داخل ہونا آج ہم کہتے ہیں لیکن اس مثل کا سچا مصداق وہی زمانہ تھا اور یہی نہ تھا کہ لوگ شہیدوں میں داخل ہو جاتے تھے بلکہ شہید ہو بھی جاتے تھے ہر ایک شخص یہی چاہتا تھا اور اعلےٰ سے اعلےٰ خدا تعالےٰ سے اُس کی یہی دعا ہوتی تھی کہ میں فردوسی ہو جاؤں ۔

العرض ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کا نیر اقبال نصف النہار ہو رہا تھا اور خاندان سلجوقی کا دور دورہ تھا اور اس خاندان عالیشان پر فن شاعری کا راج تھا۔ ہمارے نامور ہیرو نے علم و فضل حاصل کیا اور علامہ ابوالعلائی گنجوی سے اکتساب فیضان کیا۔ جیسا کہ ضرور تھا۔ بعد فراغ کتب درسیہ اس کو شاعری کی طرف میلان ہوا جس پر زمانہ مٹا ہوا تھا اور جس کے دام میں خویش و بیگانہ مست نظر آتا تھا ۔

استاد کی رائے باکمال اُستاد نے بھی دیکھا کہ نوجوان طالب العلم ہے تو ذہین طبیعت کی شوخی بتا رہی ہے کہ شاعری کے پردے میں اپنا رنگ دکھلانا چاہتی ہے اور کسی کے روکے سے کب رنگینی بن دکھائے نہ رہیگی۔ اور یقیناً دکھائیگی کبھی کسی باکمال کی ہجو ہوگی۔ کبھی خشک زاہدوں کی مٹی خراب ہوگی اور ایسے بُرے طور سے کہ توبہ بھلی۔ کبھی واعظوں۔ ناصحوں اور عشاق پر پھبتی اُڑیگی اور حسن نہیں بال کی کھال کھینچی جائیگی۔ پس خدا داد موج کا روکنا ایک تو غیر ممکن ہے اور

چلتی ندی میں کچھ ٹکا بھی دیا جائے تو نتیجہ اُس کا خراب ہے بہتر ہے کہ اسی فن کی جانب میلان اُس کا اور بڑھایا جاوے +

شاعری ہمارے ہیرو نے جب اپنے شفیق اُستاد کا اشارہ پایا تو اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ پھر گیا تھا ادھر تو پہلے ہی سے اشتیاق سے بھری آنکھیں حکم کی منتظر تھیں فوراً حقایقی تخلص تجویز کر کے کچھ اشعار لکھے اور اُس زمانہ کے مشہور شاعر فلکی سے شاگردی کر کے اصلاح لینی شروع کردی +

شاعری سے طبع کی مناسبت شاعری کی آگ تو پہلے ہی سے طبیعت میں موجود تھی۔ لیکن علوم درسیہ کے مشاغل کے سبب سے کچھ دنوں خاک تلے دبی رہی جب تحصیل سے فارغ ہوا اور اُستاد کو بھی موافق دیکھا وہ آگ ایک شعلہ زرافشاں کی صورت میں بھڑکی اور بھڑکتے ہی گلزار ابراہیمی کی بہار دکھلانے لگی۔ پھر تو اُس کے تر و تازہ گلابی خوشبودار خوش رنگ خوش نما پھولوں کی مہک نے تمام ملک سخن کو معطر کردیا اور زبان حال سے وہ تر و تازہ گلشن سخن شایقانِ سخن کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ "اے گلشنِ سخن کے ہوا خواہ شایقو!! آؤ اور بہار بے خزاں کے مزے لوٹو!" +

قسمت کی رسائی تو دیکھو جب یہ شہرتِ سخن عالمگیر ہوئی اور لوگ اُس کے کمالات سے واقف ہونے لگے تو اُس کا غلغلۂ کمال سلجوقی خاندان کے نامور قدردانِ سخن پادشاہ خاقان کبیر منوچہر الپ ارسلان سلجوقی شاہ شیرواں تک پہنچا اور اُس باکمال حقایقی کی جانب متوجہ ہوا اُس نے بھی اس توجہ کو غنیمت خیال کیا اور قصائد مدحیہ لکھ کر خاقان کبیر کے دربار میں حاضر ہوا اور قصائد نذر گذرانے۔ اقبال نے ہاتھ پکڑا۔ اور قسمت نے یاوری کی نتیجہ ظاہر ہے کہ اُس سلجوقی دربار میں اُس کا وہ رسوخ ہوگیا جو فردوسی کو محمود کے دربار میں یا ابوالفضل و فیضی کو اکبری دربار میں یا بلکہ اُس سے بھی بدرجہا زیادہ +

زمانہ چاہتا تھا۔ اور فردوسی و محمود کی کیفیت سن سن کر خواہش کرتا تھا۔ کہ ہم فردوسی ہوں اور کوئی محمود سا قدرداں ملے۔ ظاہر ہے کہ حسب خیال زمانہ حقایقی کو بھی کبھی اس کا خیال ہوا ہوگا لیکن

اپنی حیثیت یا کسی اور نا کامیابی کے خیال سے یہ نتیجہ نکالا ہوگا۔ ایسا ناممکن خیال سوا اسکے کہ دل کو خوش کرلے اور کامیابی کا خوش نما پہلو نہیں رکھتا۔ لیکن قسمت کی یاوری نے دکھا دیا۔ کہ کچھ محمود اور فردوسی ہی پر موقوف نہیں۔ ہماری مدد چاہیئے پھر تو کیسا ہی قدردانی کا زمانہ کیوں نہ ہو۔ ایک چھوڑ پچاس فردوسی اور محمود ہوسکتے ہیں +

قسمت کی نصیحت اور پیشین گوئی

دیکھو!! ہمارے مشکور ہو ہم نے تم کو فردوسی وقت بنا دیا۔ اور پھر اس سے تمہارا وقار اور تمہاری عزت دربار میں زیادہ ہے۔ خاقان کبیر کو محمود وقت بنا دیا۔ مگر اس کی محبت اور شفقت تم پر بہ نسبت شفقت محمود بہ فردوسی کے زیادہ ہے دیکھو!! خبردار!!! فردوسی سا غرور نہ کرنا۔ ورنہ وہی حال ہوگا جو فردوسی کا اسی قدردان اور مشفق محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اور آخرکار وہ بڈھا فاضل طوسی یہی کہتا ہوا دل کی بھڑاس نکالتا تھا +

چو سی سال بردم بہ شاہنامہ رنج ‎ ‎ ‎ کہ تا شاہ بخشد مرا تاج و گنج
اگر شاہ را شاہ بودے پدر ‎ ‎ ‎ بسر برنہادے مرا تاج زر
چو اندر تبارش بزرگی نبود ‎ ‎ ‎ بنارست نام بزرگاں شنود

دیکھو!! کہیں تمہیں اسے لکھنے کی ضرورت نہ ہو!" قدرت کے ہاتھوں کیسے چارہ آخر وہی ہوا جو قسمت مقدس نے پیشین گوئی کی تھی +

خاقانی تخلص دربار شاہی سے عطا ہوتا ہے

اب تو کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا۔ روز و شب مدحیہ قصائد لکھے جاتے ہیں اور صلے میں ہزاروں روپیہ عطا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ خاقان کبیر کے ہاں مقرر تھا کہ فی قصیدہ ایک ہزار درم صلہ میں دیا جائے۔ اور زر و جواہر اس کے علاوہ میں !!!

لسان الغیب نے کیا سچ کہا ہے ع قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است + ہمارے اس نامور پیرو کا تخلص پہلے تو "حقایقی" تھا۔ لیکن شاہ خاقان کبیر نے خاص اپنی عنایت

بغایت کے ثبوت میں خاقانی تخلص عطا فرمایا۔ تقدیر پکاری "ان یا ایہا الشاعر! خاقان کبیر اپنی مملکت کا بادشاہ اور خاقان ہے۔ تو تم ملک سخن کے بادشاہ اور خاقانی ہو اللہ مبارک کرے"۔ ہمارے اس حقایقی کے زمانۂ عروج میں خیال کیا جاتا تھا۔ کہ وہ:۔

"حکیم افضل الدین ابراہیم بن علی شاہِ مملکتِ سخن محبوبِ خاقانِ کبیر خاقانی اعظم ہے"۔

غرور اور بے ادبی قاعدہ ہے کہ کمال کے ساتھ غرور بھی آجاتا ہے۔ خصوصاً فنِ شعر کا تو خاصہ ہے کہ جہاں اس میں کمال ہوا۔ وہیں کمبخت غرور نے آلیا۔ میر و سودا کا بھی یہی حال تھا۔ ایسے کریم النفس بہت کم نکلینگے جنہیں نام کو بھی غرور نہ ہو۔ بدقسمتی سے خاقانی کے دل میں بھی غرور آگیا۔ کہ ہم وہ ہیں کہ قبولیتِ سخن میں سب ہم سے کمتر ہیں۔ دربار میں وہ وقعت ہے کہ کسی اعلےٰ سے اعلےٰ عامل یا حاکم کو نہیں ہے۔ اس لغو خیال کا آنا تھا کہ خاقانی کا رنگ ہی بدلگیا۔ ہر کسی کو اپنی نظر میں لانا ہی چھوڑ دیا۔ پہلے پہل اپنے استاد معلم علامہ ابوالعلائی گنجوی سے دو دو کی ٹھیرا دی۔ بھلا ہمارے ہاں کے نصیر و ذوق کی لڑائی کیا حقیقت رکھتی ہے ایسی تو تو مَیں مَیں ہوئی کہ توبہ بھلی۔ اس تو تو اور مَیں مَیں کے سبب حکیم افضل الدین خاقانی نے۔ اور ہائے اُسی خاقانی نے علامہ ابوالعلائی گنجوی کی۔ اور ہائے ہائے اپنے اُستاد کی "ہجو" لکھی۔ اور بُری لکھی۔ اگرچہ اُدھر سے بھی جواب کی ٹھیرائی گئی۔ لیکن اِدھر کی زیادتی خلق اللہ میں مشہور ہوگئی۔ خاقانی کے ہواخواہ کہتے ہیں کہ پہلے ابوالعلائی کی جانب سے چھیڑ ہوئی۔ اوّل تو یہ بالکل خلاف ہے۔ مگر ہم مان لیتے ہیں کہ اچھا اُسی کی جانب سے پہلے پہل چھیڑ سہی؛ لیکن ابوالعلائی خاقانی کا کون تھا؟ اُستاد تھا۔ خاقانی ابوالعلائی کا کون تھا؟ شاگرد تھا۔ پس اگرچہ ابوالعلائی نے پہلے زیادتی کی ہوتی مگر خاقانی کو ہرگز ہرگز ہجو نہ لکھنی چاہیئے تھی۔ جو کچھ ہو آخر اُستاد تھا حضرت امیر المومنین علی عنہ فرماتے ہیں کہ جس نے مجھ کو ایک حرف بھی سکھایا ہے تو وہ میرا آقا ہے میرا مولا ہے۔ مَیں اُس کا غلام ہوں!!! مقام غور ہے کہ ابوالعلائی تو وہ شخص تھا

جس نے اسے خاقانی بنایا۔ اُس کو بچپن سے پڑھاتے پڑھاتے فراغت کرائی۔ تمام علوم دینیہ کی جس کی خدمت میں اور جس زبان سے خاقانی نے تحصیل کی وہ ابوالعلا کی خدمت اور اُسی ابوالعلائی گنجوی کی زبان تھی۔ کہاں تو ایک حرف کی تعلیم سے معلم آقا کی بجائے ہو جاتا ہے اور ابوالعلائی نے تو دفتر کے دفتر خاقانی کو سکھائے تھے۔ بھلا کیا وہ اس لائق بھی نہ تھا۔ کہ اپنے بزرگوں کا جیسے زبانی ادب ہوتا ہے ویسا ہی اُس کا بھی کرتا۔ اور اُس کے حق میں بدزبانی نہ کرتا۔ ادب ایک ایسی چیز ہے کہ انسان کو فضائل کا منبع بنا دیتی ہے۔ ہمارے روحانی بزرگوں سے کیسے کیسے ادب کے کام سرزد ہوئے ہیں۔ کہ آدمی اُنہیں بلا مبالغہ مبالغہ کہے۔ حالانکہ وہ واقعی سچی باتیں ہیں۔ صرف دل سمجھنے والا اور دماغ غور کرنے والا ہونا چاہئے۔ حدیث میں ماں باپ کے ادب کو ضروری ہونا۔ اور اُن کی رضامندی کو باعث نجات ہونا اس پیرایۂ لطیف میں بیان کیا ہے۔ کہ ماں باپ کے پاؤں تلے جنت و دوزخ ہیں۔ سمجھ لو اُن کی رضامندی باعث عطائے جنت اور ناراضگی باعث ادخال دوزخ ہے۔ ماں باپ تو جسمانی محسن ہیں۔ اور اُستاد روحانی محسن۔ کیا اُس کی ناراضگی باعث جہنم نہ ہوگی؟ مولنا روم کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں ؎

از خدا خواہیم توفیق ادب — بے ادب محروم ماند از لطف رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

قسمت کی پیشین گوئی ٹھیک اتری

الغرض مقدس قسمت کا کہا ٹھیک اُترا۔ اور اس اپنے اُستاد شفیق کی ہجو نویسی کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اقبال کا چمکتا ہوا ستارہ ڈوبنے لگا۔ اور تقدیر کی بلندی کا آفتاب غروب ہونے کو آیا ✦

استاد کی بے ادبی کی تو نتیجہ بھی برا پایا

خاقانی کی عمر اب زیادہ ہو چلی تھی۔ اور اب باعتبار سن و بتقاضائے فطرت۔ حسب قاعدہ کچھ اور ہی رنگ چڑھ گیا تھا طبیعت میں حقائق و معارف کا دریا جوش زن تھا۔ بات یہ ہے۔ کہ شاعری کے کمال کی آخری سیڑھی حقیقی عشق ہے۔

اور مزے دار صوفیانہ خیال ہیں۔ مجازی عشق کی باتیں شاعری میں زیادہ تر ہوا کرتی ہیں۔ اسی کی ترقی کا نام عشق حقیقی ہے جیسا کہ کہا گیا کہ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ۔ اس کا لطیف ترجمہ دیکھنا ہو۔ اور وہ بھی نظم میں۔ تو راقم الحروف آزاد کا یہ اردو شعر دیکھ لو!

ہوتا ہے مجازی سے حقیقی کا توسل ہے زینہ بھی اس عشق کے ہمراہ نظر میں

مجازی اور جھوٹی محبت میں عمر کا گرانمایہ حصہ تمام ہوا تھا۔ دل نے کہا کہ تمام عمر تو اس جھوٹے اور مجازی عشق کے بیان اور پرستش میں گذری۔ تو اب اسی آخری عمر کو عشق حقیقی کے شغل میں صرف کریں۔ بس یہی خیال شعرا کو حقائق و معارف تک پہنچاتا ہے۔ پھر اس وقت کے کلام میں ایک خاص لطف ہوتا ہے۔ جو کبھی لسان الغیب اور کبھی اسرار الغیب کبھی مبشر شیراز کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سعدی حافظ جامی خسرو نظامی گنجوی وغیرہ کے عشق حقیقی کے بیانات اور محبت الٰہی کے ارشادات اسی قبیل سے ہیں +

خاقانی پر بھی آخر الامر یہی حالت طاری ہوئی۔ اور یہی خیال غالب ہوا۔ پھر تو تصوف کے رنگین اور حقائق سے بھرے ہوئے خیالات ہیں اور خاقانی کا دل۔ اس کا دل ہے اور عشق حقیقی کا لگاؤ۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ جب تک اہل دول کی صحبت اور جھوٹی مدح کا راگ گایا جاتا ہے تب تک یہ خوش نما رنگ رنگ نہیں پکڑتا۔ اس رنگ کے لئے اس سے علٰحدگی چاہیے +

گرفتاری الغرض اسی خیال سے خاقانی نے خاقان کبیر اپنے ممدوح سے رخصت چاہی۔ ادھر صحبت خاقانی کا لطف کہاں فراموش ہو سکتا تھا۔ کہا "یہ تو غیر ممکن ہے" خاقانی جب اس میں ناکامیاب رہا۔ تو دوسری کوشش شروع کی۔ اور پوشیدہ فرار کرنے کی ٹھہرائی۔ ایک دن وقت دیکھ کر وہاں سے اس نے فرار کیا۔ اور شہر بیلقان جو اس کا اصل وطن تھا پہنچا۔ اور شکرانہ بجا لایا کہ صحبت اہل دول سے نجات پائی اور بخیر و عافیت اپنے وطن پہنچا۔ لیکن قسمت کا لکھا پورا ہونا تھا۔ اور ہجو استاد کی ایک بار سزا پائی تھی۔ شاہی کارندوں نے مطلع ہوتے ہی خاقانی کو گرفتار کر لیا۔ اور اسے خاقان کبیر تک پہنچا دیا +

افسوس

غضب سلطانی نے قید کی ٹھہرائی - ہرچند شفقت و مرحمت کا تمغہ بومر کر سفارشیں ہوئیں - مگر کسی کی ایک نہ چلی - اور یہ فاضل حکیم افضل الدین خاقانی شاپران کے قلعہ میں قید کر دیا گیا - دیکھو! قسمت کا کیا کھٹکا نکلا - وہی فردوسی اور محمود کا معاملہ پیش آیا +

کئی ماہ قید میں گزر چکے تھے کہ طبیعت سخت گھبرائی - اس تنہائی میں اپنی پرانی رفیق شاعری کے سوا کون غمخوار تھا؟ اسی شغل سے طبیعت بہلانی شروع کی - چنانچہ تحفۃ العراقین ایک عجیب پر لطف نظم وہیں تصنیف کی - اور ایک قصیدہ بھی وہیں لکھا جس سے اس کی لیاقت علمی اور وسعت معلومات اور قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے یعنی اس میں آتش پرستوں کی اصطلاحات لغات ان کے حالات وغیرہ نظم کئے ہیں - سات مہینے قید میں گذرے تھے - اور مثل فردوسی کے اس کا بھی زمانہ کلفت قریب الاختتام تھا قصیدہ جوں ہی خاقان کبیر کی نظر سے گذرا خیال آیا کہ

رہائی

ایسا باکمال اور قید کیا جائے حکم دیا کہ فوراً باکمال شاعر رہا کر دیا جائے - خاقانی اس خبر مسرت اثر کو سنتے ہی پھولا نہ سمایا - اور رہا ہوتے ہی اللہ تعالےٰ کی عبادت اور ریاضت میں مشغول ہو گیا - سوچا کہ خدمت ملوک کا تو نتیجہ دیکھ لیا - آؤ اب خدا تعالےٰ کی جو حقیقی شہنشاہ ہے خدمت کریں جس کا نتیجہ عقبےٰ میں کام آئے +

زہد و ریاضت

زہد و ریاضت میں ایسے کمالات بہم پہنچائے کہ اب شاعری کی صنعت بالکل معدوم ہو گئی اور ولایت اور تقدس کا ضمیمہ مثل نظامی اور رومی کے خیال کیا جانے لگی - جیسا شاعری میں اپنے کمال کا سکہ قلوب الخلائق پر چلایا تھا ویسا ہی اب اپنی بزرگی کا سکہ جما دیا - اور اولیائے کاملین اسے اولیائے کاملین میں شمار کرنے لگے - چنانچہ عارف کامل حضرت عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ اپنے تذکرۃ الاولیا میں اولیا کے زمرے میں خاقانی کو شمار کرتے ہیں اور بڑی تعریف و ثنا کے بعد ایک دو شعر ایسے نقل کرتے ہیں کہ جن سے عشق حقیقی کی بو آتی ہے +

حج کے شوق نے مکہ اور مدینہ کی زیارت کرائی موفق التوفیق جمال الدین کے ہمراہی تھے راہ حجاز میں جو اس نے پرلطف قصیدہ لکھا ہے اُس کا مطلع یہ ہے ؎

سرمد بادیہ اَست رواں باش بر سرش
تریاق روح کن ز نسیم معطرش

ان متبرک مقامات سے فیوضات باطنی حاصل کر کے وطن واپس آیا۔ اور اپنے کمالات ظاہری اور باطنی اور سرمایۂ قصائد و کلام چھوڑ کر۔ اور بقائے دوام کی نعمت لیکر اس فاضل حکیم نے سنہ ۹۴ہجری کو شہر تبریز میں انتقال کیا اور مقام سرخاب میں مدفون ہوا۔ اِس کے اردگرد اور بھی شعرا کی قبریں ہیں۔ منجملہ اُن کے ظہیر فاریابی اور شاموز وغیرہ کے مزارات باعث رونق ہیں۔ اس لئے اس جوار کو مقبرۃ الشعرا کہتے ہیں ✦

آزاد - دہلوی - از کلکتہ

زنبیل تاریخی

کارخانہ اخبار نیر اعظم۔ مراد آباد کی طرف سے ہمارے مکرم منشی ایس۔ ابن علی صاحب کے اہتمام سے (جنہوں نے منشی امجد علی صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد کارخانہ اور اخبار کو نہایت خوبی سے سنبھالا ہوا ہے) یہ قیمتی کتاب حال میں شائع ہوئی ہے۔ اسکی ضخامت ساڑھے تین سو صفحہ کے قریب ہے اور اس میں فن تاریخ گوئی کے متعلق نہایت مفید مواد جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ پہلے شائع ہو چکا ہے جس میں تاریخ گوئی کے اصول و قواعد درج ہو چکے ہیں۔ دوسرے حصہ میں جو اب تیار ہوا ہے کئی لاکھ تاریخی مادے ہیں۔ جو صاحب اس فن کا شوق رکھتے ہیں وہ اسے ضرور دلچسپ پائینگے۔ قیمت حصہ دوم عہ ہے اور قیمت حصہ اول عہ ہے۔ دونوں حصص کو اکٹھا خریدنے والا دونوں عا روپیہ میں لے سکتا ہے ✦

عبرتناک مشاہدہ

بنانے والے نے خون چربی بلغم بال ناخن گوشت پوست اور ہڈیوں سے کیسی کیسی پری وش صورتیں بنائیں اور پھر آپ انہیں مٹا بھی دیا۔ جس حکمت کاملہ سے اُن کے بنانے میں سہولیت کا پہلو اختیار کیا اُسی نے ایسی حیرتناک جلدی سے اُنہیں مٹا دیا کہ سب کے سب مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ اپنے بھید اُس لازوال قوت نے اپنے ہی تک رکھے۔ اور اپنے کام اپنے ہاتھ کے سوا دوسرے کی طاقت سے باہر +

جیتی جاگتی مُورتیں۔ چلتے پھرتے پُتلے۔ ڈھلتی پھرتی چھاؤں۔ گھٹتے بڑھتے دن رات تو بجائے خود اُس کی معرفت اور قادر یکتا ہونے کے نمونے ہیں ہی۔ مگر مر مٹنے کے بعد۔ خاک ہو جانے پر بھی جو کسی مرنے والے کا کہیں کوئی نشان مل جاتا ہے۔ وہ بھی اُس کی قدرت اُس کی شان اُس کی بے نیازی اور استغنا کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور عبرت کی مجسم تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اُف! رستہ چلتے میری نظر ایک اونچی جگہ جا پڑی۔ جہاں اک چھوٹے سے مکان کے پچھواڑے تین کاسۂ سر کوڑی پر پڑے ہوئے تھے۔ پہلے تو مجھے ذرا یقین نہ آیا کہ اس طرح عین آبادی میں اور ایسے موقع پر جو یُوں سرِ راہ ہو آدمیوں کی کھوپریاں ہونگی۔ مگر نہیں تامل اور غور نے تھوڑی سی دیر میں فیصلہ کر دیا کہ بیشک جو کچھ میرا خیال تھا سچ مچ وہی ہے۔ یقین کے بعد میرے قدم وہاں سے نہ بڑھے۔ مَیں نے رومال مُنہ پر رکھ لیا اور ذرا اُونچائی چڑھ کر بالکل اُن کے قریب کھڑا ہوگیا۔ اب مَیں کیا بتاؤں۔ مَیں نے کیا دیکھا۔ وہ کھوپریاں زرد ہو گئیں تھیں۔ اُن پر چمڑے کا کہیں نام بھی نہیں تھا وہ گویا ہڈیوں کے خول تھے جن میں آنکھوں کے گڑھے کانوں کے سوراخ جبڑوں کے نشان۔ ناک کا بانسا اور دانتوں کی جڑیں

کم و بیش باقی تھیں۔ مجھے سمّ بکم کھڑا دیکھ کر اور بھی رگیر دہاں ذرا کی ذرا ٹھٹکے۔ ایک نظر اُس منظر کو بھی دیکھا۔ مگر کچھ تو دیکھتے دیکھتے آگے بڑھ گئے۔ کچھ مُنہ پھیر کر آنا کانی دے نکلے۔ دو ایک ناسمجھ مُسکرا نے چلدئے لیکن ایک شخص نے بآواز بلند کہا " یہ آدمی کی کھوپریاں یہاں لاکر کس نے ڈالدیں انہیں تو کہیں اور پھینکا ہوتا " آہ! آہ! موجُودہ حالت اور ان آخری الفاظ کا اثر جو مجھ پر اُس وقت میرے دل پر ہؤا وہ لفظوں میں ادا نہیں ہوسکتا۔ قبرستان میں نہیں۔ کسی کھیت میں نہیں۔ جنگل میں نہیں۔ کسی کنوئیں میں نہیں۔ کھائی میں نہیں۔ بس تو کہاں کوڑی پر۔ اُس پر بھی کہ نہیں کہیں اور پھینکا ہوتا۔ افسوس! صد افسوس! گو کہنے والے کا مقصد ان الفاظ سے قبرستان ہی کیوں نہ ہو اور مجھے بھی ظن المومنین خیرا کے لحاظ سے یہی سمجھنا چاہئے۔ مگر نہیں اُس وقت خود ان الفاظ نے اور قائل کے نفرت بھرے لہجہ نے یہ معنی ہرگز نہیں ظاہر کئے اور میں آسمان۔ زمین۔ اُس مقام اور اُن کاسہ ہائے سر کو ضرور رہ رہ کر دیکھنے لگا۔

ان میں کسی قسم کی حس نہیں تھی۔ کسی جوش کا نام نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ ایک بیکسی نفرت زدہ صُورت میں زبان حال سے کہ رہی تھی کہ " ادھر نہ دیکھو ادھر نہیں دیکھا جاویگا " کاش! میں علم اعضائے انسان جانتا ہوتا اور یہ تمیز کرسکتا کہ ان تینوں سروں میں کونسا کس مرتبے کا ہے کون عورت ہے اور کون مرد ہے۔ آخر دیکھتے دیکھتے اُن میں سے دو کو تو میں نے اُس نجس اور کثیف جگہ سے اُٹھا کر ایک طرف برابر برابر گردن کے بل رکھ دیا۔ مگر تیسرے سر کے اُٹھانے کی مجھ میں جُرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک تو اُن سے زیادہ شکستہ تھا اور دوسرے تھا بھی ایسی حالت میں کہ مجھ کمبخت سے نہ اُٹھ سکا۔

ان دونوں میں ایک کا ماتھا کسی قدر چھوٹا اور تنگ تھا دوسرے کا بہت اونچا اور کشادہ تھا۔ جس کا ماتھا اونچا تھا اُسی کی ناک کا بانسا بھی ستواں اور نازک تھا۔ یہ بھی دوسرے

سے جس کی گُدّی کی ہڈی ایک جگہ سے غیر معمولی اونچی تھی مُدوّر معلوم ہوتا تھا۔ کیا عجب ہے
جو یہ مرنے والا پہلے سے زیادہ حسین ہو۔ دُنیوی ثروت میں بھی اُس سے زیادہ ہو۔ کچھ ہو
نہ ہو۔ غرض تقدیر میں تو ضرور ایک دوسرے میں تفریق ہوگی۔ اس وقت دونوں کی حالت
یکساں سہی۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ دنیا میں بھی دونوں نے ایک ہی حالت میں بسر کی ہو۔ لیکن
یہ ہیں کون ؟ مسلمان ہیں کہ ہندو ؟ عیسائی ہیں کہ یہودی ؟ کوئی نہ کوئی مذہب تو ضرور ہوگا۔
آہ ! مگر اس وقت تو کچھ بھی نہیں معلُوم ہو سکتا۔ ان میں حاکم و محکوم کا مرتبہ تو نہیں ہے ؟
ہو بھی تو کیا عجب ہے ؟ لیکن اس وقت تو دونوں برابر ہیں۔ برابر کیا معنی ؟ بالکل ایک جگہ
ایک مقام پر ایک حال میں۔ پھر کیونکر معلوم ہو کہ یہ کون ہیں ؟ میں ان سے پوچھوں ؟
یہ بولینگے ؟ نہیں نہیں یہ بچارے کیا بولینگے۔ اور اگر کچھ کہیں بھی تو میں ان کی زبان کیا
سمجھ سکتا ہوں۔ نہ سمجھنے کی وجہ ؟ وجہ یہ کہ میں دوسرے عالم میں ہوں۔ یہ دوسرے عالم
میں۔ میں بقیدِ حیات ہوں۔ میرا خاکی پتلا قدرت کے [illegible] ہے اور
[illegible] نہیں کوئی نشان ہے ! ابھی تک روشن [illegible]
یہ بچارے دونوں اپنا اپنا وقت
[illegible] ختم کر چکے ان کا نورِ لطیف واپس لے لیا گیا۔ ان کی خاک
خاک میں مل گئی [illegible]
[illegible] ہو جاتے ہیں بس نہ ہونے کی طرح۔ آپ ہی آپ یہ سوال و جواب کرتے
رستہ چلتے [illegible] یہ جو کچھ ہیں [illegible]
کرتے اور اُن بیجان کھوپریوں کی طرف ٹکٹکی باندھے ایکا ایکی مجھے ایسا معلوم ہونے
لگا۔ جیسے وہ مرنے والے زندہ ہو گئے۔ اور اپنے بغیر ڈھیلے والی آنکھوں سے برابر مجھے
گھور رہے ہیں۔ وہ نگاہیں جو ظاہرا کسی کو نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ بے تحاشا میرے دل میں
میرے کلیجے میں اُترتی چلی جاتی تھیں اور میں حق حیران کھڑا تھا کہ الٰہی اب کیا ہوگا ؟ اُن
ہونٹوں میں زبان نہیں تھی۔ اُن پر گوشت پوست نہیں تھا۔ لیکن بے تکلف میرے کانوں
میں یہ آواز چلی آتی تھی۔ او دیکھنے والے ! کبھی ان آنکھوں میں بھی جادو تھا۔ یہ آنکھیں بھی صورت
ڈھونڈتے پھرتے تھیں۔ مگر اب کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ہم خود اُن آنکھوں کو جہاں تہاں
رہے ہیں کہ وہ کہاں گئیں۔ یہ کان بھی سخن آشنا تھے کبھی انہوں نے بھی پیار کی باتیں

انتی سُنی ہیں کہ آخر بہرے ہو گئے ۔ اسی صوت کو لوگ دیکھا کرتے تھے مگر اب دیکھا نہیں جاتا ۔ نہیں دانتوں نے جن کا نشان ہی نشان باقی ہے وہ وہ لذیذ غذائیں چبائیں اور کھائی ہیں کہ زبان خیال آج تک نہیں بھولتی ۔ اے شخص ! ہمارے بھی ہاتھ پاؤں تھے ۔ کبھی ہم بھی چلتے پھرتے تھے ۔ مگر اب اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے ۔ دوسرے کے محتاج ہیں ۔ خواہ ٹھوکر مار کر پھینکدے خواہ ہاتھ سے اُٹھا کر کہیں رکھ دے ۔ او عارضی نازک دماغ ! یہ دماغ اچھا نہیں ۔ ناک پر سے رومال ہٹا لے ۔ کبھی ہم بھی ایسے تھے کہ عطر کی آمیزش ہمیں الگ معلوم ہو جاتی تھی ۔ حنا کی تیزی ناگوار ۔ چنبا کی شوخی سے دماغ پریشان ۔ گلاب سے نزلے کی تحریک کا خوف رہتا تھا ۔ اور پھولوں کی پنکھڑیاں کروٹوں میں دب دب کر پنڈے میں نشان ڈال دیا کرتی تھیں ۔ لیکن آج وہی ہم ہیں کہ کوڑی اور مزبلہ ہمارا مسکن ہے ۔ خس و خاشاک ہماری زینت اور خاک نے ہمارا پردہ ڈھانکنا بھی گوارا نہ کیا ۔ او جوان ! اپنی صُورت پر نہ اِترا ۔ اِن اُجلے کپڑوں کو یہاں کی آلائش سے نہ بچا ۔ تو ہی دُنیا سے عنقا نہیں ۔ ہمارا لباس بھی وہ لباس تھا جس کی ذراسی شکن درزی کی جان کا وبال ۔ اور ہماری بے چینیوں کا پورا ذریعہ ہو جاتی تھی آج وہی ہم ہیں کہ ہمارے مغرور سر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں اور ہماری چٹکی بھر خاک کہیں ٹھکانے سے نہیں ؎

لحد میں اُن کے جسمِ نازنیں پر کیا گذرتی ہے
سحر تک جن کو بے چینی رہی ہے چین بستر کی

اے بھائی ! ہم پر ہنسنا اپنی حالت پر رونا ہے ۔ دُنیا میں کسی کو گھڑی بھر چین نہیں ۔ یہاں خوشی کا نام بڑی مشکل سے آتا ہے ۔ زریں لباس صرف دیکھنے ہی کے ہیں ۔ یہاں جواہر پوش مرصع کمر اور قاقم و سنجاب پہننے والوں کے پہلوؤں میں وہ دُکھے ہوئے دل موجود ہیں ۔ جو ایک غریب آدمی بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا ۔ اے بھائی ! یہاں

جو روتا ہے وہ تو روتا ہی ہے مگر جو ہنستا ہے وہ بھی روتا ہے ؎

غرور ذلت کی دلیل ہے۔ بڑے بول کا سر نیچا ہے اِن لفظوں کو ہرگز بے معنی نہ سمجھنا کہیں ایسا نہ ہو یہ سودا سر میں سمائے اور پھر کوئی ٹھوکر بھی نہ مارے ؎

کیا کسی کی ہستیاں ہیں تاج ہو یا دلق ہو
کاسۂ فغفور دیکھا ٹھوکریں کھاتے ہوئے

اے بھائی! جسمانی قوت۔ روحانی طاقت۔ چندروزہ تحکم یا اس آنے جانے والی جوانی پر بھول کر بھی نہ جانا۔ بڑے بڑے سورما۔ بڑے بڑے صاحب اثر۔ بڑے بڑے کڑیل جوان مائی کے پوت منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں آسمان نے انہیں ایسا پیسا کہ سانس لینے کی بھی مُہلت نہ ملی ؎

ہزاروں لالہ رُو ہیں دفن اس میں بھری ہے گود پھولوں سے زمیں کی

یہاں دانائی کا دعوے محض نادانی ہے اور زباں دانی قطعی بے زبانی۔ اے شخص! دُور کیوں جائے ہمیں کو دیکھ لے۔ ہم اک زمانہ دیکھ چکے ہیں۔ عمر بھر خاک اُڑائی ہے۔ اس دنیائے فانی میں کس کس طرح نہیں بسر کر چکے۔ اپنے وقت میں کیا کچھ نہ جانتے ہونگے لیکن اس وقت ہم تجھے یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ہم کون ہیں۔ کہاں مرے۔ کہاں دفن ہوئے۔ ہڈیاں کہاں پھینکیں اور خاک نامراد کہاں کہاں برباد ہے ؎

بھائی! دُنیا بالکل سایۂ پرِ کبوتر ہے یہاں کی زندگی بس اُنتے ہی سانسوں کا شمار ہے جو ہنسی خوشی گذر جائیں۔ نتیجہ سے پہلے کبھی کسی کو خوش نصیب نہ سمجھنا۔ ٹھیر! ٹھیر! تیری آنکھوں میں ابھی سے کیوں آنسو بھر آئے۔ لے ایک آخری گیت اور سُن لے۔ یہ ہمارا گانا نہیں ہے۔ بلکہ اُن کیڑوں کا گیت ہے۔ جنہوں نے خاک ہونے سے پہلے ہمیں کھا لیا ؎

کیڑوں کا گیت

او خاک[1] اڑائے ہوئے! او خاک کے پتلے! ہم کو نہ سمجھنا کہ ذرا سے ہیں ذرا سے
ہم وہ ہیں تری قبر سے واقف ہیں گنہگار! ہم وہ ہیں کہ ہم خاک کی خشکی سے خبردار
وہ دن بھی تجھے یاد ہیں جب پھیلنا[2] تھا تو؟ وہ پٹھی ہوئی مچھلیاں بڑے وہ بازو
تن تن کے وہ خالق کی زمیں پر ترا چلنا اللہ کی مخلوق کو بے خوف کچلنا
وہ فتنہ و فساد اور وہ ہنگامۂ مستی وہ جھوٹ دغا مشیوۂ صد مکر پرستی
وہ غیر کے ناموس کو دیکھے سے اوچھلنا وہ دو دمروں کا مال زبردستی نگلنا
وہ اپنے پرائے کا ذرا دھیان نہ کرنا بے شرمیوں پر ہائے وہ سو جان سے مرنا
وہ کاہلی[3] طاعتِ یزداں میں کہ توبہ برسوں نہ کیا قبلے کی جانب کبھی سجدا
بیکار پڑے اینڈنا بستر پہ ہمیشہ کچھ کام کی ہو بات تو بیدم رگ و ریشہ
گردن نہ جھکانا کبھی درماں طلبی میں سر پھوڑنا دن رات مدہ بوالہوسی میں
وہ یاد بھی ہے موت کا اندیشۂ باطل جب آتی ہے آجائیگی کہتا رہ غافل
ناگاہ دھواں دھار گھٹا چھائی فلک پر تو جوشِ مسرت میں بڑھا جانبِ ساغر
لیکن وہ گھڑی خونِ تمنا کی گھڑی تھی اٹھنے بھی نہ پایا کہ اجل سر پہ کھڑی تھی
سب ٹوٹ گئی دستِ زبردست کی طاقت کچھ اور بنا دی ملک الموت نے حالت
سکرات کے عالم نے دیا ذائقہ ایسا رگ رگ یہ پکاری کہ ہنسیا و مریا
دنیا کے مزوں میں یہی لذت رہی باقی تا حشر نہ جائیگی کبھی موت کی تلخی
لازم تو نہ تھا کوئی تجھے غسل بھی دیتا یا دفن کا ہوتا ترے سامان مہیا
لیکن نہیں۔ کچھ خوف خدا آگیا سب کو میت کو سرِ شام اٹھایا کہ نہ شب ہو

[1] بدچلن + [2] غرور کرنا + [3] سستی +

تجھ پر بھی نہیں حصر، ہر سب کا یہی انجام
زندوں میں بھلا گور کے مُردے کا ہی کیا کام

کیسا ہی جگر بند ہو کیسا ہی ہو دلدار
ممکن نہیں وہ دن بھی جو رکھ لے کوئی غمخوار

القصہ تجھے لیکے چلے سمت مقابر
پہنچا دیں تجھے تاکہ کہیں منزل آخر

وہ دو گھڑی رات آئی ہوئی اور وہ بیاباں
بادل وہ گرجتا ہوا مینہ بوندی کا سامان

وہ زور ہوا کا کہ جھنجھنتے ہوئے ٹہنے
مینہ یہ برستے تو جل تھل بھریں دریا لگیں بہنے

وہ سلسلہ قبروں کا وہ بجھتی ہوئی مشعل
وہ ہڈیوں کے ڈھیر تو وہ مُردوں کا جنگل

وہ ہول برستا ہوا ظلمات کا پردا
قبروں کے گڑھے تیرہ و تاریک سراپا

پتّوں کے کھڑکنے سے وہ ذرّوں کا توہّم
وہ ساتھیوں کا چار طرف دیکھنا گم سم

بجّو کی کہیں تاک تو گیدڑ کا کہیں گشت
سنسان وہ بستی کہ جہاں چار طرف دشت

سایہ وہ درختوں کا سا اندھیرے کی وہ چادر
گویا ملک الموت ہی کھولے ہوئے شہپر

تعویذوں کے پتھر نہیں ہر سمت عیاں تھے
قبروں سے یہ نکلے ہوئے مُردے نگراں تھے

کہتا تھا یہ اک قبر سے سرکا ہوا پتھر
پہنچا ہے بہت دیر میں او بندۂ خودسر

آجلد کہ آغوش تمنا ہے کشادہ
اب تک نہیں معلوم تجھے میرا ارادہ

برسوں تو پھرا مجھ سے الگ آنکھ بچائے
کاندھے سے اتر چھوڑ دے سب اپنے پرائے

آخر تری میّت کو عزیزوں نے اُتارا
اور قبر نے منہ کھول کے نگلا تجھے سارا

مٹی دی روانہ ہوئے احباب بچارے
رل مل گئے پھر قبر کے آپس میں کنارے

پڑھوا دئیے سب حرف تری لوح جبیں نے
بدلے لئے اک عمر کے آخر کو زمیں نے

پانی کی طرح بہنے لگا گوشت بدن کا
شیرازے کی مانند بکھرنے لگا ڈھانچا

اُس وقت یہیں خلق کیا جل و علا نے
ہم اپنی غذا جان کے تجھ کو لگے کھانے

کچھ دن میں نہ چمڑا تھا نہ بوٹی تھی ذرا بھی
کچھ ہڈیاں کچھ پسلیاں کچھ خاک بھری تھی

از شاہ علی بندہ حیدرآباد دکن

{آغا شاعر قزلباش دہلوی}

تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں

ہمارے مکرم مولوی ادریس احمد صاحب بی۔ اے جو محکمۂ وزارت ریاست رام پور میں ہیڈ کلرک رہے ہیں۔ اور اب محکمۂ دارالانشا میں ہیں مندرجہ ذیل نتیجہ خیز مضمون عنایت فرماتے ہیں:۔

باخدا لوگوں میں محبت خلق موجودات کا باعث مانی جاتی ہے اور خلاصۂ موجودات انسان کی فطرت میں محبت کا غالب مادہ داخل ہونا صریحًا پایا جاتا ہے۔ چونکہ قوانین قدرت بھی بعض اوقات مصلحتاً مستثنیات سے مبرا نہیں پائے جاتے۔ لہذا دلِ مردہ سے تو بحث نہیں۔ لیکن بالعموم کوئی "زندہ" دل ایسا نہیں ہو سکتا جس میں محبت کے ولولے جوش نہ مارتے ہوں۔ یہ بے چین رکھنے والے ولولے دل کو ہمیشہ ایک ایسے محبوب کا طالب رکھتے ہیں جس میں اُن ولولوں کے مستقر بننے کی استعداد ہو۔ اور جس کے حصول سے یہ فطری تشنگی بجھ سکے اسی طلب نے طالبین کے گروہ کو دو راستوں پر ڈال کر ایک طرف تارکانِ دنیا یعنی فقرا، زہاد، عباد اور حکما کا مبارک گروہ قائم کیا اور دوسری طرف انتظام جہانبانی کے لئے طبقۂ اہل حکومت و امارت اور سلطنت کی بنیاد ڈالی جس وجہ سے کہ معمولی بھوکے پیاسے کی بھوک پیاس صرف انواع و اقسام کے لذیذ کھانے پینے کی چیزوں کے ذکر اور فکر سے نہیں بجھ سکتی۔ اُنہیں وجود سے پہلے طبقہ کو "تصورِ شیخ" اور "شیخ پرستی" لازم ہوئی۔ اور دوسرے گروہ کو سالارِ قوم امیر اور بادشاہ بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ یوں اسباب کے فروعات اور بہت شمار کئے جا سکتے ہیں۔ جو مورخین نے وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ مگر انتخاب کا سببِ اولے یہی سمجھ میں آتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کا تذکرہ ہمارا مقصود نہیں۔ بلکہ کچھ "شخصی سلطنت" کا ذکر کرنا مراد ہے۔

دُنیا کی بیشمار حکومتوں سے قطع نظر کرکے یورپ کی زبردست سلطنتوں میں برطانیہ کیا بلحاظ قوت و وسعتِ ملک و دولت - اور کیا بلحاظ حسنِ انتظام و وفاداریٔ رعایا بہترین سلطنت تسلیم کی جاتی ہے - اس سلطنت نے اپنی طرزِ عمل سے یہ بات ثابت کی ہے - کہ جمہوری سلطنت جہانبانی کا ناکافی انتظام ہے اور بغیر ایک ایسے لاشریک وجود کے جسکو باوجود کوئی سماوی برتری (ڈیوائن رائٹ) حاصل نہ ہونے کے رعایا کی حفاظتِ جان و مال کے متعلق خاص خاص حقوق سپُردہ ہوں سلطنت کی چُول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتی - وجہ یہ کہ مسٹر گلیڈسٹون اور لارڈ سالسبری ایسے ارکین سلطنت کی بیدار مغزی اور دانشمندی رعایا کے دل سے "تحسین و آفرین" کے نعرے بلند کرا سکتی ہے - مگر رعایا کے دل و دیدہ کی جس تشنگی کو کوئین وکٹوریا اور کنگ ایڈورڈ کا دیدار فرو کر سکتا ہے اُس کرامت سے بڑے سے بڑا اور عقلمند سے عقلمند وزیرِ سلطنت بھی عاری ہے - یہ مانا کہ سلطنتِ جمہوری کے فدائی فرقے بھی کونسل اور پارلیمنٹ کے پریسیڈنٹ منتخب کرتے ہیں - مگر کیا کوئی آج دعوے کے ساتھ کہ سکتا ہے کہ شاہ ایڈورڈ کی علالتِ طبع اور بتدریج صحتیابی کی روزانہ خبروں نے ہم رعایا کا جو دلاویز اثر اہلِ انگلستان اور اہلِ ہندوستان کے دلوں میں پیدا کیا - وہ امریکہ یا فرانس کے کسی طبقہ رعایا پر پیدا ہو سکتا - ہے کیونکر ہو سکتا ہے - پریسیڈنٹ قانوناً خاص مدت کے لئے ملکی معاملات میں ہمارا رہنما ہوتا ہے اور بادشاہ سے ہم نہ صرف معاملاتِ مدنی میں انصاف کے متوقع ہوتے ہیں - بلکہ ہر وقت ہر لحظہ اُس کو سرچشمۂ رحم و الطاف محسوس کئے رہتے ہیں اس حیثیت سے ہر شخص اُسے "اپنا (بادشاہ) سمجھتا ہے - یہی وجہ ہے کہ جب پبلک جلسوں کے موقعہ پر بادشاہوں کے سواری عام گذرگاہوں میں رعایا کے جمگھٹ میں ہوتی ہوئی نکلتی تھی - اُس وقت اُن کی اُٹھی ہوئی آنکھیں اور اُن کی تحیر محسوس طرز پر چاروں طرف دوڑتی ہوئی نگاہیں زبانِ حال سے کہا کرتی تھیں "تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں" - ہندوستان کی موجودہ گورنمنٹ اور گذشتہ اسلامی

سلطنتوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جو اُلوالعزم سردار ہندوستان کی قدرتی زرخیزی اور آب وہوا کی تعریف کا شہرہ سنکر شمال و مغربی دروں سے اپنے گروہ کو لیکر اس سرزمین کے فتح کرنے کے شوق میں آتا تھا وہ یہاں کی سرحد میں قدم رکھتے ہی اپنے وطن اصلی کو اُسی وقت سے خیرباد کہدیتا تھا۔ یہ بہادر لوگ کچھ ایسا شگون لیکر گھر چھوڑتے تھے کہ اُن کو قطع نظر چند خفیف حملوں اور خفیف لڑائیوں کے تخت شاہی تک پہنچنے کے لئے پختہ سڑک تیار ملتی تھی وار دار السلطنت میں پہنچتے ہی عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ہندوستان کے دلچسپ مناظر۔ یہاں کی زرخیزی۔ رعیت کی خوشحالی اور اطاعت کا مادہ اُن کے دلوں کو کچھ ایسا لبھا لیتا تھا کہ پھر اُن کو بھول کر بھی کبھی اپنی غیر آباد اور وحشتناک سرزمین کی یاد نہ آتی تھی۔ اس وجہ سے فاتحین کا تعلق زمین مفتوح سے روز مرہ مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کے آخر میں کوئی تمیز باہمی باقی نہ رہتی تھی۔ چنانچہ ہند میں اہل اسلام نے جس رغبت و شوق سے مفتوحین کی راہ و رسم کو اختیار کیا اُس کا نمونہ اس وقت تک مسلمانوں کی طرز معاشرت اور شادی و غمی کی رسوم میں اچھی طرح پایا جاتا ہے۔ چونکہ انھوں نے پولیٹکل مصلحتوں سے اپنے قومی جذبات کو بالکل فرد کر دیا تھا۔ اس لئے یہاں کی قوم کی کسی ادا کو وہ نظر مغائرت سے نہ دیکھتے تھے اور نہ اُن کو اپنی جرأت شجاعت و سلطنت کے موجود ہوتے ہوئے شبہ پیدا ہوسکتا تھا کہ گھر ایل میل رعیت کی محبت اور جوش اطاعت کو ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ ہماری برٹش گورنمنٹ کا اول تو جماؤ ہی نرالے طور سے ہؤا۔ پھر حکومت ہاتھ آنے پر بھی ہندوستان کو باوجود اس کی وسعت و عظمت کے ایک باجگذار صوبہ قرار دیا۔ غدر کے بعد سے ہندوستان ہمیشہ کے لئے اُس تجلی سے محروم ہو گیا۔ جس کا جلوہ عایا کی باہمی نااتفاقیوں کو جوشِ اطاعت سے بدل دیتا تھا۔ تاجِ سلطنت کی شعاعیں اور بادشاہی چہرہ کے قدرتی انوار جو افق سے افق تک یکساں روشنی بخش ہؤا کرتے تھے مغربی بادلوں میں پنہاں ہو گئے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دل شکستہ رعایا کے حق میں بادشاہِ

وقت کا دیدار ایک نیا جوش پیدا کر دیتا ہے۔ انگلستان میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ باغیوں کے گروہ کے گروہ جن کی بغاوت کی موج خاص لنڈن میں داخل ہو چکی اور جن کے جوش کے سامنے ملکی فوج بھی ہار چکی تھی وہ نوعمر بادشاہ کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر اور صرف یہ لفظ سنکر کہ میں "تمہارا بادشاہ" ہوں۔ سب کے سب تتر بتر ہو گئے ہتھیار رکھ دیئے اور امان مانگی نپولین اعظم شاہنشاہ فرانس جب کہ فرانس کے جملہ اہالی و موالی سلطنت کی رائے کے مطابق اول مرتبہ جلا وطن کیا گیا تو چند روز کے بعد اس کی قدرتی امنگ نے اسکی بہادری کو پھر جوش دیا اور یہ خفیہ طور سے ایک کشتی میں چند دوستوں کے ہمراہ فرانس میں چلا آیا خیال کرنا چاہئے کہ اس اولوالعزم نے اپنی جان کو کیسے مہلک خطرہ میں ڈال دیا تھا یہ کوئی ملکی جنگ نہ تھی جس میں مارا جانا دائمی شہرت کا باعث ہوتا محض اپنی مستقل امیدوں پر بھروسہ کر کے کشتی سے اتر پڑا۔ سارا ملک امرا اور وزرا کی اپیچوں کو سن سنکر اس کا دشمن بنا ہوا تھا مگر نتیجہ کیا ہوا۔ نپولین سفر بازگشت میں تن تنہا اس فوج کے دستوں میں گھس پڑتا تھا۔ جو جا بجا ملک کی نگہبانی پر مامور تھی۔ اور بآواز بلند اپنی صورت دکھاتا ہوا کہتا تھا کہ میں "تمہارا" ہر دلعزیز "بادشاہ" ہوں۔ اس کی آواز اور صورت سامعین کے دلوں پر بجلی کا سا اثر کر جاتی تھی اور وہ فوراً اس کی اطاعت قبول کر لیتے تھے چنانچہ جس وقت یہ پیرس یعنی فرانس کے دارالسلطنت کے دروازہ پر پہنچا ایک جرار لشکر اس کے ہمراہ ہو چکا تھا۔ اس واقعہ سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بادشاہ کی موجودگی رعایا کے حق میں ایک ایسا عجیب اور ناقابل بیان اثر رکھتی ہے کہ جس کا بدل نہ قانون ہو سکتا ہے نہ فوج +

یہ مانا کہ انگلستان کے فرمانروا کا ہندوستان میں مقیم ہونا بوجوہات چند در چند ناممکن ہے۔ مگر کیسا بدل کر دینے والا خیال ہے کہ ملکہ معظمہ مرحومہ نے حکومت ہندوستان ہاتھ میں لئے بعد قریب نصف صدی کے سلطنت کی لیکن اس دراز مدت میں نہ قیصرہ نے اس وسیع ملک اور نزل مکنت پر کبھی نگاہ ڈالی اور نہ یہاں کی کثیر التعداد رعایا نے اپنے والی

اور فرمانروا کی کبھی صورت دیکھی محبت کے لئے موانست لازمی ہے۔ ہندوستانی والدین اور اولاد کے مابین رشتۂ الفت بہ نسبت انگلستانی والدین اور اولاد کے زیادہ مستحکم ہوتا ہے اور عموماً باپ کی بہ نسبت ماں بچہ کو زیادہ کیوں پیار کرتی ہے۔ یہی جواب کہ پاس رہنے کی مدت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ کسی کو اعتبار نہ ہو تو ویسی ریاستوں میں چھوٹے پیمانہ پر ہمارے مافی الضمیر کا نمونہ دیکھ لے۔ ہر ریاست کے فرمانروا پر بعض لوگوں کی قریب قریب ہر روز نظر پڑتی ہے مگر دیکھنے سے جی سیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ تیج تہواروں کے موقع پر سواری کے نکلنے کے وقت خلقت کا جو اژدحام ہوتا ہے اور جو کوششیں اس ایک چہرہ پر نظر ڈالنے کے لئے کی جاتی ہیں وہ اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ بلکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کی رعایا اپنے نواب اور راجہ سے اس سے بدرجہا زیادہ محبت اور قدر کرتی ہے جتنی کہ برٹش سلطنت ہند کے اعلےٰ سے اعلےٰ رتبہ والے تنخواہ دار رکن نے ہندوستان میں آکر ہندوستان کے باشندوں سے کبھی حاصل کی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے دل میں برٹش افسروں کی وقعت اور عظمت بہت زیادہ ہے۔ مگر وہ اُن کے قومی کیرکٹر اور ذاتی اخلاق حمیدہ پر مبنی ہے ورنہ بحیثیت حکمراں ہونے کے ہم اُن کو "منہ بولے" باپ سے زیادہ نہیں سمجھتے ❊

اوریس احمد۔ از رام پور

خدنگ نظر لکھنؤ کے ماہ مئی کے پرچہ میں پنجاب کے نامور اور مقبول شاعر پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کا فوٹو۔ سوانح عمری۔ اور ممدوح کی ایک پرزور نظم شائع ہوئی ہے۔ سوانح عمری سالۂ مخزن کے ایڈیٹر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ دیگر مضامین اور غزلیات بھی ہیں۔ شائقین حضرات اس نمبر کو مع فوٹو صرف چار آنہ قیمت پر منگا سکتے ہیں۔ بلا فوٹو دو آنہ علاوہ محصول ڈاک ❊

تصویر کے دو رُخ

یوں تو ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں - ایک روشن اور ایک دُھندلا - ایک سفید اور ایک سیاہ - ایک طرف نقش و نگار اور ایک طرف ورق سادہ - ایک رُخ خط و خال کی آرائش سے زیبا اور دوسرا حُسن و خوبی سے معرّا - مگر جو دردناک اور تعجب خیز نظارہ اہل ہند کی روزمرّہ زندگی کی تصویر کے دو رُخ دکھاتے ہیں بہت کم تصویریں دکھا سکتی ہیں - افسوس اس تصویر کی نقل اُتارنے کے لئے جیسے صاحبانِ فن کی ضرورت ہے وہ میسّر نہیں - نقّاشِ ازلی نے بھی اسے کھینچ کر "دست از قلم کشید" پر عمل کر لیا ہے - اور جب کبھی کسی مصوّر نے اس کا نقشہ اُتارنے کی کوشش کی ہے - وہ نور اور پرتو دونوں کو یکساں تناسب کے ساتھ دکھانے میں کامیاب نہیں ہوا - کسی کی تصویر میں نور اچھا جلوہ گر ہے تو پرتو نہ اور کسی نقّاش کی نظر پرتو پر جا پڑی ہے تو نور نظر سے اوجھل ہو گیا ہے - ہاں چشمِ بینا کے مطالعہ کے لئے نقّاشِ ازل کے ہاتھ کی تحریر کے اوراق ہر وقت وا ہیں - آنکھ کو چاہیئے کہ ذرا کھُل جائے اور تماشا دیکھے ❖

چلئے پہلے کسی دیسی عہدہ دار سرکاری کے مکان کی سیر کریں - ایک بڑی ڈیوڑھی سے گذر کر ایک وسیع صحن میں پہنچتے ہیں - صحن کے عین وسط میں ایک حوض ہے جو پانی سے لبالب ہے - حوض کے چاروں طرف خوشنما گملے رکھے ہیں - کُرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور ہمارے معزز عہدہ دار سرکاری جو ایک پُرانی وضع کے بزرگ ہیں - کچہری سے آکر چوغہ وغیرہ اُتار کر ذرا سستا رہے ہیں - فرّاش پیچھے ایک بڑا دستی پنکھا لئے کھڑا ہے - اور ہمارے معزز دوست پیچوان کی چاندی کی مہنال مُنہ میں لئے دھوئیں کے بادل نکال نکال کر اُن کی پیچ در پیچ رفتار کا ایک مست نگاہی کے ساتھ لُطف

لیے رہتے ہیں۔ گویا آرام و آسائش کی مورت ہیں۔ اگر کوئی اجنبی اتنی ہی کیفیت کو دیکھے تو سمجھے کہ ہندوستان میں لوگ بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گستاخی سے نگاہِ تصور کو زنانہ کی طرف لے چلئے اور نقشہ ملاحظہ کیجئے۔ کہ "گھر کے لوگ" کس حالت میں ہیں۔ بیوی صاحبہ ہیں کہ بیں بہ جبیں ایک چارپائی پر متمکن ہیں چارپائی پہ ایک طرف کو ایک پاندان رکھا ہے جس کے باہر تک کتھے چونے کے دھبے ہیں۔ اُس کے پاس ایک بچے کا ٹوٹا سا کھلونا پڑا ہوا ہے۔ پائنتی کی طرف کچھ ساگ پات دھرے ہیں اور وہ ماما کو پکار رہی ہیں " اری جلدی کھانے کا فکر کر۔ ابھی میاں آتے ہونگے۔ ذرا دیر ہو گئی تو میری جان کھا جائینگے۔ تیرا کیا جائیگا " اُدھر سے ماما بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے: "جب سے اس گھر میں آئے ہیں نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ سارا دن کام کاج میں کھپ جاتا ہے۔ اور پھر بیوی کو دیکھو تو پیشانی سے بل ہی نہیں اُترتا "، اور سامنے آ کر پکار کے کہتی ہے۔ "میاں تو آ بھی گئے۔ میں کون سی فارغ بیٹھی رہی کہ اس سے پہلے کچھ فکر کرتی۔" اتنے میں ایک چھوٹی سی لڑکی باورچی خانہ کی طرف سے راکھ سے کھیلتی ہوئی آجاتی ہے اور اُسے دیکھ کر اُس کی ماں طیش میں آتی ہے "ابھی نگوڑی کو نہلا دھلا کر بھیجا تھا۔ اور ابھی پھر لتھڑی ہوئی آگئی۔ اب کہاں تک کوئی ان کو صاف رکھے۔ اور وہ آئینگے تو مجھے ڈانٹینگے۔ ذرا آپ ایک دن بھی خبر گیری کرنی پڑے تو حال معلوم ہو۔" اور لڑکی سے مخاطب ہو کر۔ " اری چڑیل آ تو سہی تجھ سے سمجھونگی۔ اب کے باورچی خانہ میں جاتا۔ اگر دسپنا تجھ پر توڑ نہ دیا تو کہنا۔" یہ گھُرکی سنتے ہی لڑکی بسورنے لگتی ہے اور اُس حالت میں ماں کے ماتھے پر اور بل پڑتے دیکھ کر پھوٹ پڑتی ہے اور چلا چلا کر رونے لگتی ہے۔ رونے کی آواز مردانہ تک گئی اور ہمارے عہدہ دار صاحب چیخے۔ " یہ کیا غل مچا رکھا ہے۔ جب آؤ۔ اس گھر میں کچھ نہ کچھ شور ہی پاؤ گے۔ جاؤ جمن (نوکر کا نام ہے) ذرا لپک کے ننھی کو لے لینا۔" جمن آواز دیتا ہے تو اندر سے آواز آتی ہے

"ذرا اس کا منہ دھو لیں" مگر لڑکی بھاگ کر اُسی طرح لتھڑی ہوئی مُحسن کی گود میں آجاتی ہے اور وہ نامعقول بے سوچے سمجھے اُسے میاں کے سامنے لے آتا ہے۔ لڑکی کی صورت دیکھتے ہی جھلاتے ہیں۔ اور غصہ کے جوش بھرے ہوئے اندر جاتے ہیں۔ "سارے دن بیٹھی ہوئی کرتی کیا رہتی ہو کہ ذرا لڑکی کا بھی دھیان نہیں کر سکتیں لڑکے تو اب تمہارے محتاج نہیں۔ اُن کے لئے تو میاں جی نوکر ہے۔ وہی بیچارہ انہیں کپڑے پہناوے وہی سیر کو لیجائے وہی سبق پڑھا چھوڑے۔ ایک لڑکی ہے۔ اُس کی طرف بھرے گھر میں کوئی توجہ کرنیوالا نہیں" یہ عتاب سُنتے ہی بھلا تاب کسے! بیوی بھی بگڑ کر جلے پھپھولے پھوڑنے لگتی ہے۔ اگلے پچھلے گلے شکوے دفتروں کے دفتر کھل جاتے ہیں۔ اور آخر ایسی تلخی تک نوبت پہنچتی ہے۔ کہ میاں کھانا کھائے بغیر شام کو پڑ رہتے ہیں۔ اور بیوی الگ منہ لپیٹ کر اپنے بڑوں کو کوستی ہے کہ ایسے سخت گیر خاوند سے بیاہ دیا کہ عمر رونے میں کٹ گئی +

اب یہاں زیادہ ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔ انہی کے ہمسایہ میں ایک اور معزز عہدہ دار رہتے ہیں مگر وہ نئے رنگ کے آدمی ہیں۔ ذرا اُن کے ہاں ہوتے چلیں۔ ایک متکلف نشست ہے جس کے دروازوں پر چلمنیں پڑی ہیں۔ اندر پردے لٹک رہے ہیں۔ کمرہ کی آرائش میں انگریزیت کی صاف جھلک نظر آ رہی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مکان کے سجانے کا یہ نقشہ ضرور کہیں سے اُڑایا ہُوا ہے۔ کچھ کرسیاں قرینے سے دھری ہیں۔ کونے میں ایک میز رکھی ہے جس پر شیشہ کنگھی۔ انگریزی خوشبودار تیل بال سنوارنے کا برش سب سامان درست ہے۔ وسط میں ایک میز ہے جس پر چند نہایت عمدہ جلدوں کی کتابیں ہیں۔ اُن میں بعض تصویروں کے البم ہیں بعض عمارات اور مشہور مقامات کے نقشے ہیں۔ ایک آدھ دلچسپ ناول ہے۔ ایک کسی مشہور سیاح کا سفرنامہ ہے۔ غرض ہر چیز سے صاحب خانہ کی تربیت سلیقہ شعاری اور صفائی مذاق کا پتا

چلتا ہے۔ اتنے میں دو صاحب نئی وضع کے لباس میں ملبوس ملکر باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک تو صاحب خانہ ہیں۔ اور دوسرے اُن کے ایک دوست ہیں۔ جو نئے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اصلاحِ ملک و قوم کی فکر میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی خوش تقریری سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے خیالات کا اثر لوگوں کے دلوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ذرا ان کی گفتگو سن لیجئے:۔

صاحب خانہ:۔ اب کے آپ بہت دنوں میں تشریف لائے۔ آپ کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں دل خوش ہو جاتا ہے۔ قومی کاموں میں آپ کی طرح دلسوزی کرنے والے ہم لوگوں میں ابھی بہت کم ہیں۔

مُصلح:۔ جناب یہ سب آپ کی قدر دانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری خدمات کیا۔ واللہ! اگر آپ جیسے قدردان نہ ہوں۔ تو اس ملک میں دم گھٹ جائے۔ ملک کے واسطے آپ کوئی کام کیجئے۔ اہل ملک آپ سے بدظن ہو جائینگے۔ اور داد کی بجائے اعتراضوں کی بوچھاڑ کرینگے۔ اب اسی عورتوں کے اصلاح کے مسئلہ کو دیکھئے۔ جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ کیسا ضروری معاملہ ہے اور لوگ اس سے کس قدر غافل ہیں اور تو اَور۔ جو نیک صلاح دے اُلٹے اُس کے سر ہوتے ہیں۔

صاحب خانہ:۔ واقعی جس استقلال سے آپ ان دقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں آپ ہی کا کام ہے۔ فرمائیے اب کچھ عرصہ سے کوئی لکچر آپ نے نہیں دیا۔

مُصلح:۔ جناب مجمع ہی نہیں ہوتا۔ آپ کا شہر ایسے بے مذاق آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ورنہ بندہ تو ہر وقت حاضر ہے۔ اب پرسوں کے لئے ایک جلسہ قرار پایا ہے۔ اُسی کے اہتمام میں جاتا ہوں۔ اور آپ سے مرخص ہوتا ہوں۔ آپ بھی قدم رنجہ فرمائیے گا۔

غرض صاحب خانہ سے وعدہ لیکر وہ تو رخصت ہوئے۔ اور صاحب خانہ اندر تشریف

ے گئے۔ گوش زدہ اثرے وارد۔ ابھی ابھی عورتوں کی اصلاح کا ذکر تھا۔ بیوی سے
متعلق گفتگو شروع ہوئی :۔

میاں :۔ مَیں نے کئی دفعہ تم سے کہا ہے کہ ابھی موقعہ ہے۔ کچھ شُد بُد لکھ
پڑھنا سیکھ لو۔ واقعی جب کبھی باہر لکھی پڑھی عورتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ تو مجھے سخت
ندامت ہوتی ہے۔ اور مَیں تو اسی خیال سے تعلیم نسواں کی حمایت میں کچھ کہنے سے
شرماتا ہوں۔ کہ میرے اپنے گھر میں پڑھی ہوئی بیوی نہیں *

بیوی :۔ یہ کیا آپ کو دُھن لگی ہوئی ہے۔ کیا سارے زمانہ کی عورتیں پڑھی
ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے تو کنبہ بھر میں کبھی لکھنے پڑھنے کا چرچا نہیں ہوا۔ کسی کو بہت
خیال ہوا تو قرآن مجید ناظرے پڑھنا سیکھ لیا۔ کہ چلو ثواب کا کام ہے۔ یہ ایک نئی علت
لگی۔ کہ پڑھے بغیر گذارہ ہی نہ ہو *

میاں :۔ گذارے کی تو بات ہی الگ ہے۔ اب ہم زندگی بھگا ہی رہے
ہیں :۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بغیر خواندہ بیوی کے زندگی بے لُطف ہے *

بیوی (اچانک بگڑ کر) :۔ تو کوئی خواندہ ڈھونڈی ہوتی۔ میری تو ماں کی آنکھوں
پر تمہارے ہاں کی رزق روٹی دیکھ کر پٹی ہی بندھ گئی۔ کہ اُس نے مجھے یہاں جھونک دیا
ہر وقت پڑھائی کا طعنہ۔ ہر وقت پڑھنے کا جھگڑا۔ اور کوئی بات ہی نہیں۔ بس یہی
ایک چھیڑ ہاتھ لگ گئی۔ اب کوئی اور خواندہ کرلاؤ۔ ہم سے بھی جیسے ہوگا زندگی
کاٹ ڈالینگے (اور بلند آواز کر کے) آگ لگے ایسی روٹی کو! چولھے میں جائے ایسا
رزق! (رونے کی آواز آنے لگتی ہے) *

میاں بیچارے سلیم الطبع آدمی۔ دم بخود۔ خواہ مخواہ امن خانگی میں خلل اندازی
پر پچھتاتے۔ کچھ اپنی تعلیم کو کچھ اپنی قسمت کو کوستے باہر نکل آتے ہیں اور دل ہی دل میں
کڑھتے ہوئے خدا سے شکایت کرتے ہیں۔ کہ یا تو اس ضرورت کا احساس نہ دیا ہوتا۔

یا والدین کے دل میں بھی جن کے ہاتھ میں اوا او کی مناکحت کی باگ ہوتی ہے۔ اس صورت کا احساس ڈالدیا ہوتا ؎

ہوش است کہ سرمایہ دردِ سر است خرم آنکس کز جہاں بے خبر است

در بیضہ نمے کنند مرغاں فریاد ہر چند کہ بیضہ از قفس تنگ تر است

اب ذرا قومی مُصلح کا تعاقب کیجئے۔ دوست کی ملاقات سے فارغ ہوکر ایک چھاپہ خانہ میں پہنچے۔ وہاں اسی طرح ناقدردانیٔ زمانہ کے دُکھڑے روئے اور کہا کہ خیر:-

گر کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے مے کنم

بلا سے لوگ نہ مانیں۔ ہم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائینگے۔ ایک اشتہار لکچر کا پرسوں کے لئے چھاپ دیجئے۔ لکچر کا موضوع یہ ہو "عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہیں"۔ موضوع کا اظہار کرنے پر دیر تک صاحب مطبع سے اس اصول پر بحث رہی۔ حضرت مُصلح نے بڑے شد و مد سے اس اصول کو ثابت کیا اور کہا کہ مرد عورتوں پر اس ملک میں بڑا ظلم کرتے ہیں اور ان کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہیں۔ ان کو خدا کے روبرو جواب دینا ہوگا۔ اس گفتگو سے فارغ ہوکر گھر پہنچے۔ ایک پرانی سی کوٹھڑی جس میں کھاٹ کھٹولے تک درست نہیں۔ ایک دالان میں جہاں باوجود شام ہو جانے کے چراغ تک نہیں جلا تھا۔ ایک بیکس سی عورت لیٹی تھی۔ یہ ہمارے لکچرار صاحب کی اہلیہ تھی۔ لکچرار صاحب نے اُسے کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنے دیا۔ اُس کو پوچھا تک نہیں۔ اور آپ الگ صحن میں ایک ٹوٹی سی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ وہ نیک بخت اُٹھی۔ اور پنکھا لیکر جھلنے لگی۔ وہ کھڑی پنکھا کرتی رہی۔ ہمارے انصاف پسند دوست کے مُنہ سے یہ نہیں نکلا۔ کہ بیٹھ جاؤ۔ نہ کوئی شکریہ کا کلمہ نکلا۔ کچھ دیر کے بعد بڑی بے رخی سے خطاب کرکے پوچھا "کھانا تیار ہے؟" وہ دوڑی اور کھانا نکال لائی۔

پاس بیٹھ کر کھلانے لگی - جو کچھ پکا تھا - اُس نیک اور ایثار کرنے والی بی بی نے خاوند کے آگے لاکے رکھ دیا - اور جو کچھ اس نے کھانے کے بعد چھوڑا - اُس سے اپنا پیٹ بھر لیا - معلوم نہیں ہمارے بکھار کے دل میں ایک لحہ کے لئے بھی یہ خیال آیا یا نہیں - کہ اُن کے گھر میں زن و مرد کے حقوق کی مساوات کہاں تک ملحوظ ہے لیکن اگر آیا بھی ہوگا تو اُنھوں نے یہ من سمجھوتہ کر لیا ہوگا - کہ اگر عورت بھی پڑھی لکھی ہو تو اس کے حقوق اُن کے ساتھ برابر رہوں +

چلئے ان کے حال سے درگذر کر کے ان کے ایک پڑوسی بابو صاحب ہیں - اُن کی خانہ داری کا اندازہ کرتے چلیں - بابو صاحب کہیں باہر گئے ہیں - اُن کی غیر حاضری میں بام خانہ پر ایک عورت چھڑکاؤ کر رہی ہے - ایک چارپائی پر بچھونا بچھا ہے اُسکی پاس اسی عورت نے حقہ بھر کر رکھ دیا ہے - اُس عورت کی پوشاک یہ ہے - کہ ایک میلا سا کپڑا ہے - جسے سر سے پاؤں تک ساڑھی کے طور پر اوڑھے ہوئے ہے - مگر وہ ستر پوشی میں کچھ بہت مدد نہیں دیتا - شاید خیال گزرے کہ یہ کوئی خادمہ ہے - مگر نہیں - یہ بابو صاحب کی بیوی ہے - جو آپ تو روز دُھلے ہوئے کپڑے بدلتے ہیں اور ہم چشموں میں خوش خور اور خوش پوش مشہور ہیں - یہ بھی اچھے اچھے کپڑے رکھتی ہے - جن کی زرق برق سے آنکھیں چکاچوند ہو جائیں - مگر وہ تو تیوہار یا میلے پر جانے یا شادی بیاہ میں شریک ہونے کے موقعوں پر نکالے جانے کے لئے صندوقوں میں احتیاط سے بند ہیں - اس کے علاوہ اس کے پاس بھاری بھاری زیورات ہیں جن پر اسے ناز ہے - مگر اُن کو بھی خاص موقعوں پر ہی نکالتی ہے +

اسی مکان کے سامنے جلاہوں کا ایک گھر ہے - اُس میں ایک بڈھا دیرینہ سال جلاہا بیٹھا حقہ پی رہا ہے - آؤ آج کے شاہدات کے ختم کرنے سے پہلے اسکی باتیں سُن لیں - ویسے تو آپ جس دن آئینگے اور جتنی مرتبہ آئینگے ہندوستانی کی زندگی کی

تصویر کے دونوں رُخوں کا منظر آپ کو نشے سے نئے رنگ دکھا ئیگا۔ یہ بڑے میاں گزشتہ زمانہ کی خوبیوں کا بیان کر رہے ہیں:-

آپ:- کہو بڑے میاں آج کل کے زمانے کے بڑے شاکی معلوم ہوتے ہو +

بڈھا:- کچھ پوچھئے نہیں - زمانہ کیسے سے ایسا نکل گیا ہے کہ کوئی حد نہیں - خدا جانے کیا اندھیر ہونیوالا ہے - عورتوں کی بھی ایسی آزادی نہ دیکھی نہ سنی یقین جانئے عمرے کی ماں کو دیکھئے کا نام ہے - میں نے وہ دہ چپا ہے - مگر بیچاری نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں تمہارے گھر نہیں رہتی - مگر اس عمرے نالائق نے میرے گھر کا ستیاناس کر دیا ہے اپنی عورت کو اس قدر سر چڑھا رکھا ہے کہ خدا کی پناہ - ہمارا بھی جوانی میں بیاہ ہوا تھا - ہم تو اپنے باپ کے سامنے عورت کی اتنی پاسداری نہیں کرتے تھے - خواہ وہ اسے جھڑکتے تھے - خواہ زیادہ کام لیں خواہ کم - خواہ تھوڑا کھانے کو دیں خواہ بہت - یہ ناہنجار تو جس دن سے بیاہا گیا ہے مجھے باپ ہی نہیں سمجھتا - اور وہ نامراد ناشاد ساس سے یوں لڑتی ہے جیسے سوت ہو میں نے بارہا لڑکے کو سمجھایا تو آج آخر اس نے ذرا ہاتھ اُٹھایا تھا - گو صاحب وہ بگڑی ہوئی عورت ابھی دو چار ہی پڑی تھیں - کہ محلہ سر پر اُٹھا لیا - اور اس وقت سے رو رہی ہے - کہ میں تو طلاق ہی لونگی عجب مصیبت میں جان ہے - اُدھر یہ بےعقل پھر موم ہوا جاتا ہے - کہتا ہے عورت ہاتھ سے جائیگی - حالانکہ میں اسے کہہ چکا ہوں - کہ عورت کو تو جوتی برابر سمجھنا چاہئے - ایک اُتر گئی - دوسری پہن لی +

بڑے میاں کے خیالات کا نمونہ تو آپ نے سن لیا - چلو اب پیر کے سو رہو - خدا کرے خواب میں آپ کو تصویر کا سیاہ رُخ کسی قدر سفیدی سے بدلتا نظر آئے - تو صبح کو ہم آپ کو کوئی اچھی سی تعبیر بتائیں +

ایڈیٹر

طاقتِ خموشی

ہمارے کرم فرما منشی رام سہاے سنگھ صاحب تمنا دہلوی جن کی نسبت ایک عرصہ سے مخزن کو شکایت تھی۔ کہ باوجودیکہ اُن سے بہت توقع امداد قلمی تھی۔ مگر انہوں نے ایفائے وعدہ نہیں کیا۔ اب ایفائے وعدہ فرما کر ہمیں ممنون فرماتے ہیں اُن کا مضمون شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے *

انسان کے مشاہدہ اور تجربہ میں آیا ہے کہ زبردست آواز زبردست طاقت سے بے تغیر پیدا نہیں ہوتی۔ بادلوں کی کڑک۔ توپوں کی دھمک سے دل سینوں میں ہل جاتے ہیں۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ شیروں کی دھاڑ سے لوگ دہل جاتے ہیں۔ انجن کی بھک بھک اور ریل گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے سٹیم کی زبردست طاقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے آندھیوں کے زور اور دریاؤں کے شور عناصر باد و آب کی طاقت کے مظہر ہیں۔ لیکن بعض ایسی طاقتیں ایسی موجود ہیں جن میں آواز نہیں ہے۔ مگر اُن کی عظمت اور اُن کے وجود سے کوئی انکار نہ کر سکیگا *

کائنات کی سب سے بڑی طاقت کشش ثقل جس کی وجہ سے اجرام فلکیہ اور اُن کے نظام قایم ہیں۔ کیسے چپکے چپکے اپنا کام کر رہی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ مگر ہر ایک چھوٹی بڑی چیز اُس کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے *

قوت برقی اور قوت مقناطیسی بغیر کسی شور وغل کے اپنا کرشمہ دکھاتی ہیں۔ ان کو بھی جانے دو۔ تمام قوتوں کے مالک اور تمام طاقتوں کے خالق حضرت باری عزاسمہ کس خاموشی سے کوس لمن الملک بجا رہے ہیں اور کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں کہ کسی کو مجال قیل و قال نہیں *

آخر اس میں کیا بھید ہے کہ ہر ایک بڑا کام چپ چاپ ہوتا ہے چوروں اور راہزنوں

کے مشورے۔ انقلاب پسند مدبروں کے جلسے۔ پیروں مریدوں کے حلقے۔ تمام بڑی بڑی سازشیں۔ شب بیداروں کی عبادتیں۔ عشق و حسن کی گھاتیں۔ راز و نیاز کی باتیں۔ سب چپکے چپکے ہوتی ہیں۔ اگر خموشی مشکل کشا نہ ہوتی تو کیوں ہر ایک مقصد کے لئے اس کا سہارا ڈھونڈھا جاتا ×

خاموشی اور تنہائی فلاسفروں اور شاعروں کی ہمراز۔ موجدوں اور مصنفوں کی دستا ہے۔ پس اگر یوں کہیں کہ جس قدر دُنیا میں علم و ہنر کی روشنی۔ ایجاد و اختراع کی برکت ہے سب خموشی کی بدولت ہے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا ×

اے ہومر اور شکسپیئر۔ بائرن اور ملٹن کو زندہ یادگار کرنے والی۔ سعدی اور حافظ۔ خاقانی اور انوری کو بقائے دوام بخشنے والی۔ کالیداس اور والمیک کو حیاتِ ابدی کا جام پلانے والی۔ خاموشی! شیفن اور رو تجن تیرے ایسے ہی ممنون ہیں جیسے ایڈیسن اور مارکونی۔ سقراط اور ارسطو تیرے ایسے ہی گرویدہ ہیں جیسے کہ کارلائل اور سپنسر ×

شاعر ہو یا فلاسفر، ناول نویس ہو یا ایڈیٹر، تیرے بغیر بیچارہ ہے۔ تیرے ہی دم سے بزم جہاں کی رونق ہے۔ ہر طرف تیری ہی چہل پہل ہے ×

مرزا دبیر ممبر پر رونق افروز ہیں۔ مجلس میں تل رکھنے کو جگہ نہیں۔ چار طرف شور و غل ہے۔ مگر ایک رباعی کا مصرع شروع کرتے ہی سناٹا ہو جاتا ہے۔ ع
"شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں" ×

حضرات!

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں ۔ بھر جگئے ڈکار رہنگے جہاں بند کروں
خلاقی مضموں کا ہے سب کو دعوئے ۔ کھل جائے جو چند سے میں ناں بند کروں

لیکن اگر غور کریں کہ یہ شیرانِ مضامین کس جنگل سے نکلے ہیں تو معلوم ہوگا کہ گوشہ تنہائی سے مرزا صاحب کے میدانِ خیال میں چھلانگیں مارتے آئے ہیں۔ ذات کو مرثیہ کے بند

لکھتے لکھتے دو چار رباعیاں بھی لکھ دیتے ہیں +

آج مسٹر سریندر ناتھ بنرجی ٹاؤن ہال کلکتہ میں کسی بل پر تقریر کر رہے ہیں۔ فصاحت بلاغت کا دریا امنڈ رہا ہے ایک ایک فقرہ پر سامعین کا جوش بڑھتا جاتا ہے جو لفظ ہے فقرہ ہے گویا بندوق کی گولی ہے جو آتش بیانی دلوں میں آگ لگا رہی ہے۔ سحربیانی غضب ڈھا رہی ہے۔ ایسی تاثیر تقریر نہ سنی۔ مگر یہ لیاقت ہے مسٹر بنرجی رات کو دو گھنٹہ تک اس مضمون پر تنہائی میں سوچتے رہے ہیں۔ بلکہ اکثر اہم فقروں کی بندش بھی پہلے سے درست کر رکھی ہے۔ ہر شخص مسٹر بنرجی کے کلام سحر نظام پر لٹو ہے اور مسٹر بنرجی کی لسانی کا معتقد لیکن میں اس وقت تو اس گوشہ کا گن گاتا ہوں میں اُس گوشہ تنہائی اور سناٹے کا مداح ہوں جو اُن کی شہرت اور ناموری کا اصلی منبع ہے ؎

من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

معترض کہینگے کہ صاحب کسب یا وہب آخر کوئی چیز ہی نہیں۔ جب قابلیت ہی نہ ہو تو خاموشی یا تنہائی کیا بنائیگی۔ لیکن بندہ نواز قابلیت تب ہی پیدا ہوتی ہے۔ جب یکسوئی حاصل ہو۔ کسی کام میں خیالات کو جمع کر کے مصروف ہو جاؤ تم اس کے مالک ہو۔ اس میں خواہ تحصیل علم ہو یا کسب فن لیکن یکسوئی کے لئے تنہائی شرط ہے۔ اور تنہائی بھی ایسی کہ خیالات منتشر نہ ہوں۔ تنہائی میں تنہا ہونا مشکل ہے۔ خاموشی میں بھی چپ رہنا دشوار ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب انسان کسی کام کی دُھن میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ اپنی ہستی کا بھی علم نہیں رہتا تب شاہد مقصود سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ یہی کامیابی کا رستہ ہے۔ جس کا دل چاہے دولت وارین گوشہ تنہائی سے لوٹ لے +

موت کی فتحمندی سے کون بے خبر ہے۔ جس نے اوتاروں۔ پیغمبروں۔ اولیاء اور اقطاب کو بھی ملک خموشاں میں داخل کئے بغیر نہ چھوڑا۔ خدا کے منکر لاکھوں ہیں لیکن ملحد سے ملحد تک اُس یقینی طاقت کے وجود سے انکار نہیں کرتا۔ جس کے زبردست ہاتھ سے ہر فرد مخلوق کو جامِ کل من علیہا فان پینا ہوگا۔ لیکن موت کیا ہے؟ ایک حالتِ خاموشی ہے جو ظہور اور عدم کے مابین حائل ہے۔ ایسی خاموشی کہ جس کے عائد ہونے پر قیامت تک بولنا نصیب نہ ہوگا:-

کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

اَے شہرِ خموشاں کے رہنے والو! ہمارے اور تمہارے درمیان صرف موت کا پردہ حائل ہے جو ایک روز یقیناً ہر شخص کے لئے اُٹھایا جائیگا۔ اور پھر ہم بھی تمہاری عظیم الشان آبادی کا نظارہ دیکھ سکینگے۔ ہماری اور تمہاری بستیوں میں قطرہ اور سمندر کی نسبت ہے۔ اگرچہ موت نے مُہرِ خموشی تمہارے لبوں پر لگادی ہے۔ لیکن تم میں سے اکثر زندۂ جاوید بدستور ہماری عقلی۔ اخلاقی۔ روحانی طاقتوں کو اُبھارتے ہیں۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے اور گمراہوں کو رستہ بتاتے ہیں۔ تمہارے فیضِ صحبت کا دریا جبتک زمین و آسمان قائم ہیں جاری رہیگا۔ تم میں آواز نہیں ہے تو کیا یہ معجزہ نہیں۔ کہ تم لائبریری کے سنسان گوشہ میں اپنی داستان مجھے سُناتے اور دل بہلاتے ہو۔ قسم ہے پروردگار کی جو لطف تمہاری صحبت میں ملتا ہے وہ ہماری دنیا کے اکثر لوگوں کی صحبت میں نہیں جو صرف کہنے کو زندہ ہیں *

شیدا۔ دہلوی

آفتاب

ذیل کے اشعار رگوید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں۔ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظام عالم کے حیرتناک مظاہر کے مشاہدہ سے اول اول انسانِ ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل و نحل کے عالموں کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کی ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھنا تک نہیں۔ جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے اس دعا میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ سوِتر استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اردو لفظ نہ ملسکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اُس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالےٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اللہ نور السموات والارض" اور شیخ محی الدین ابن عربی عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالےٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علےٰ ہذا القیاس افلاطونِ الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیا کا بھی یہی مذہب تھا +

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں یہ دقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل الفاظ کی آواز موسیقیت اور روحانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعراء ٹنی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا

ناممکنات میں سے ہے۔ اسی مجبوری کی وجہ سے مَیں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتار) زیبا پر رکھی ہے جس کو سریا نرائن اپنشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے ترجمہ کرنے کو تو مَیں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں صاحب اس پر بھی رائے قایم کرینگے جو جیپ سن نے پوپ کا ترجمۂ ہومر پڑھ کر قایم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں۔ لیکن یہ گایتری نہیں ہے ۔ محمد اقبال

اے آفتاب روح و روانِ جہاں ہے تو ! شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو !
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا ! ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا !
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے ! ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے !
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے ! تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے !
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے ! دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے !
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو ! یزدانِ[1] ساکنانِ نشیب و فراز تو !
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں ! تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں !
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو ! زائیدگانِ[2] نور کا ہے تاجدار تو !

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری !
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری !

۱؎ یزدان کو قدیم حکمائے ایران اصلِ نور تصور کرتے ہیں۔ اس واسطے خالق کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا ۔

۲؎ یعنی دیوتے سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدایش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً اُن کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظِ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گرداننا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ اقبال

مذہب اور سائنس

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

جب کیا سائنس نے ختم اس طرح اپنا خطاب ۔ ہنس کے مذہب نے دیا پھر یُوں جواب باصواب
اس قدر شوخی و گستاخی بزرگوں کے حضور ۔ خود سمجھ کا ہے تری اے طفلکِ ناداں قصور
اپنی حالت کی اگر ہوتی تجھے کچھ بھی خبر ۔ تو کہاں پیدا ہوا اور پرورش پائی کدھر
جانتا گر تو کہ تیری سرپرستی کس نے کی ۔ نام سے بھی جن کے تو واقف نہ تھا تیرے کوئی
آج میرے سامنے اس طرح اتراتا نہ تو ۔ یوں نہ شوخی اور گستاخی سے کرتا گفتگو
کچھ تجھے ہوکر بڑوں کے نام سے بیزار ہیں ۔ اس زمانہ کے بھی لڑکے کیا ہی ناہنجار ہیں
خالقِ اکبر نے جب انساں کو پیدا کیا ۔ اُس کی صُورت اور سیرت تجھ کو بتلا دوں فقط
تھا بہائم کی طرح ننگا وہ از سر تا بہ پا ۔ مثلِ درندوں کے وہ بیباک اور خونخوار تھا
نفع و نقصاں کی اُسے اک شمہ بھی پروا نہ تھی ۔ تھا تو انساں پر تمیزِ نیک و بد اصلا نہ تھی
تھی ادا امر اد خواہی کی نہ اُس کو کچھ خبر ۔ ماں سے بیٹا بے خبر تھا اور دختر سے پدر
قاعدہ کوئی نہ تھا اُس وقت اُس کا رہنما ۔ کوئی قانوں اُس کے قول و فعل پر جاری نہ تھا
تھا نہ تہذیب و تمدن کا زمیں پر کچھ نشاں ۔ تھا نہ دُنیا میں ترقی کا کوئی وہم و گماں
علم و فن کو کب کوئی پہچانتا تھا اُن دنوں ۔ نام تک تیرا نہ کوئی جانتا تھا اُن دنوں
جب کہ تاریکی میں یکساں ہو رہے تھے باغ و راغ ۔ بر سرِ راہ مَیں نے آ کر رکھا شریعت[1] کا چراغ
مَیں نے ہی انساں پر ظاہر کیا نامِ خدا ۔ حق و ناحق کا اُسے مَیں نے ہی بتلایا پتا

[1] ہر ایک مذہب کی شریعت مُراد ہے ؎

ایک ہی تھا میں ازل سے اور ابد تک ایک ہوں
اختلافِ باہمی ہے صرف انساں کا جنوں

نوح و ابراہیم و موسےٰ عیسےٰ و ختمِ رسل
تھے اصولوں میں پرافیسر وہ اک کالج کے کل

ہے نہیں تورات اور قرآں میں چنداں اختلاف
زند و اوستا و بید اور انجیل تو اور ہیں صاف

اختلافِ رائے کا تحریف یا تاویل کا
یا مرے احکام میں تکثیر یا تقلیل کا

فلسفی کی دانش اور ناداں کی اُلٹی فہم کا
یا کسی کی اپنی ایجاد اور گھڑت یا وہم کا

ضامنوں اور ذمہ داروں میں مجھے کرنا شمار
گر یہی انصاف ہے تو میں نے بھر پائے ہزار

میں جیالوجی[۱] پڑھانے کو نہیں آتا ہوں یہاں
میرے مکتب میں نہیں علمِ طبیعی کا نشاں

ہسٹری جغرافیہ میرے سکولوں میں نہیں
ہندسہ اور ہیئت اپنے کریکولوں[۲] میں نہیں

غیب اور ناسوت میرے مدرسہ کا ہے نصاب
ہے بس اک اخلاق اور روحانیت کی یہاں کتاب

گر کوئی علمی اشارہ ہو میری تحریر میں
یا ہو گر مذکور تاریخی میری تقریر میں

مدعا اُس کا نہیں ہے دنیوی علم و ہنر
محض روحانی مقاصد ہیں میرے مدنظر

صاف و سادہ ہے سلیس اور عام فہم اپنا کلام
مستفید اس سے ہوں ناداں اور دانا تمام

اُلفتِ ہمسایہ و ہمدردیٔ باہم دگر
نقش میں نے ہی کئے لوحِ دلِ انساں پر

گر کوئی دھپڑ لگا دے تیری دائیں گال پر
حکم[۳] تھا میرا کہ تو بایاں بھی اُس کے پیش کر

پر نہ جب نچلے رہے اُس کے تھمائے انتقام
میں نے ہی جاری کیا لا تعتدوا[۴] کا حکم عام

میں نے انساں کو معیشت کا سبق پہلے دیا
بابِ آدابِ تمدن میں نے ہی بیاں کیا

حفظِ صحت کے اصول اُس کو سکھائے میں نے ہی
آدمیت کے حقوق اُس کو بتائے میں نے ہی

میں نے ہی اعمالِ حسنہ کی اُسے ترغیب دی
میں نے ہی فعلِ شنیعہ سے اُسے ترہیب کی

میں نے ہی اس جد و جہد و سعی سے کر کے تیار
ابنِ آدم کو کیا علم و ہنر کا خواستگار

میں نے ہی انسان کو تاکید سے یوں کہہ دیا
چین تک بھی جستجو علم و ہنر کی ہے روا

---

۱ علم طبقات الارض ۲ یعنی نصاب ۳ حکم انجیل مقدس ۴ حکم قرآن مجید

سوچ برخوردار ناداں اپنے دل میں تو ذرا
میں ترا دشمن ہوں یا کہ تیرا قبلہ گاہ

پیشوایانِ مذاہب کے مصائب کا گلا
مجھ سے اے الٹی سمجھ والے ہے خود تیری خطا

ملک گیری کی ہوس پہ بادشاہوں نے فسانے
بار لوگوں نے بنائے مذہبی جنگ اور جہاد

باوجود اس کے کہ تو نے بال کی کھینچی ہے کھال
تیری تحقیقات کا گو روز افزوں ہے کمال

پر تجھے معلوم کرنے کی یہ طاقت ہے کہاں
دہر و نیچر کی کلوں کو کون رکھتا ہے رواں

تو عناصر کی حقیقت کا ابھی ماہر نہیں
باعثِ ایجاد و تکوین تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں

تجھ کو تشریحات میں حاصل ہے گو دست رسا
روح کا اب تک لگا سکتا نہیں کچھ تو پتا

گرچہ لاثانی ہوا حفار اور رمال تو
عاقبت کو یہ بتا سکتا نہیں کچھ حال تو

ہے تجھے تیری سے یا امیری سے تہو رستی
دخل ہے جس میں نہ ناسوت و شہادت کا کوئی

خلقِ حسنہ کا سبق تیری کتابوں میں نہیں
عملِ صالح تیرے کالج کے نصابوں میں نہیں

تجھ سے دیکھا نہ پایا پر مضامین کو ترے
کچھ تعلق رکھ سکے جو عقل اور انصاف سے

قادرِ مطلق کی قدرت ہے بے چون بے دلیل
گر ہوا کچھ تو تو فتوے ہے مرا الاقلیل

اس تگ و دو میں کروڑوں سال گر گذریں تجھے
پھر و پایاں تو نہ علمِ غیب کا کچھ پا سکے

سراج الدین احمد

آیا بنانے ہنسنے انساں میں جب خلل
روتا ہے بے حصول کہ ہے سعی بے محل

جاتا ہے کوئی آج جہاں سے تو کوئی کل
رو رو کے خاک اڑاؤ نہیں چھوڑتی اجل

انیس

لے دہر و نیچر کے کلوں کے رواں رکھنے والے کی بابت کوئی نہیں بتلا سکتا ہے

دنیا کی بے ثباتی سے سبق

مندرجہ ذیل نظم ہمارے مکرم جناب پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ المتخلص کیفی تلمیذ مولنا حالی مدظلہ کی طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک عرصے سے ہمارے ذخیرہ میں پڑی تھی۔ آج ہدیۂ ناظرین ہوتی ہے۔ ہم پنڈت صاحب سے معافی چاہتے ہیں کہ اس کے شائع ہونے کی نوبت اس قدر دیر میں آئی:-

گلہ کرتا ہے کیا ناداں دورِ آسمانی کا ہے شکوہ سراپا بیجا جہانِ فانی کا
غنیمت جان جو دم شکر و اطمینان میں کٹ جائے بھروسا کیا ہے ہمدم اس بروزہ زندگانی کا
دنیا اس پست فطرت ہے مانہ جس کس کس کو ہے ذرہ ذرہ شاہد اس کے جور و ظلم رانی کا

وہ کیوان بارگاہوں کے مکیں کیا ہو گئے کہئے کہ لکھتے ہیں لقب جن کے لئے جنت مکانی کا
کہاں وہ نائب ذات خدا ہیں صاحبِ کشور کہ تھا گردوں سے بالا پایہ جنکی راجدھانی کا
تھے چاروں کھونٹ میں جھنڈے گڑے جنکی حکومت کے پھریرا تھا شش جہت میں شہنشہی کامرانی کا
نشاں نسلوں کا ان کی ہو گیا مفقود عالم سے ہے باقی نام ہی جشنِ جم و نوشیروانی کا
کہاں ہیں وہ شہنشاہانِ ہفت اقلیم اسکندر شہ خاور تھا اک چاؤش جس کی حکمرانی کا
کہاں زابلستانی ہیں کہاں عباسی و طوسی پتا بتلائے تو کوئی خجندی و کیانی کا
نشاں رومائیوں ساسانیوں کا کوئی بتلاؤ بتاؤ غزنوی کا کچھ پتا اور سیستانی کا
نہ غوری ہیں نہ چغتائی۔ نہ خلجی اور نہ تغلق ہیں پتا ملتا ہے تو بس مقبروں میں گورگانی کا
کہاں ہیں چندر بنسی اور سورج بنسی وہ راجے کہ مہر و ماہ پر سکہ تھا جن کی حکمرانی کا
قلم و قطب سے تا قطب تھی پھیلی ہوئی جن کی نہیں ملتا ہے اب پتھر بھی اینٹوں کی نشانی کا

ہوئے کیوں ہم کو ساتھ اُن کے دعوے سر بسر جھوٹے — کہ لوہا مانتا تھا دہر جن کی تیغ رانی کا
اگر باقی ہے تو بس نام ہی اک رہگیا باقی — فلاں بیکنٹھ باسی اور فلاں عرش آشیانی کا

نہ وہ عالم نہ وہ فاضل نہ وہ شاعر ہی باقی ہیں — کہ جن کو زعم تھا اسرارِ حق کی راز دانی کا
کہاں علم و حقایق کے وہ ماہر اور کامل ہیں — کہ اک اک جن میں تھا غوّاص دریائے معانی کا
زباں تھی جنکی یا گنگا رواں تھی ایک جنّت سی — سخن تھا جن کا اک چشمہ حیاتِ جاودانی کا
نہ اب تک جن کے علم و فضل کی کچھ تھاہ ملتی ہے — کہ تھا ایک ایک جن میں اک سمندر نکتہ دانی کا

کہاں ہیں وہ حسیں نو بادۂ فردوسِ محبوبی — گماں بھی تھا نہ جن کو لطمۂ بادِ خزانی کا
صفا تھی جن کے عارض کی صفائے دل کا آئینہ — تعلق قلب سے تھا جن کے اقرارِ زبانی کا
دہن ایسے کہ جب اُن کی نہ پوری کھنچ سکی صورت — ذرا سا رہگیا خفّت سے مُنہ بہزاد و مانی کا
غضب کا کاٹ کرتی تھیں اداٗیں جن حسینوں کی — اُبھاروں پر تھا جوبن اور عالم نوجوانی کا
ہلال و بدر کی کچھ حیثیت گر تھی تو بس یہ تھی — کہ وہ چربہ تھا بچپن کا تو یہ خاکا جوانی کا
کلامِ روح پرور تھا کہ امرت رس کی چھالیں تھیں — ثبوت اعجازِ عیسےٰ کا کرشمہ خوش بیانی کا
عنادل جن کے منموہن لبوں سی چہچہے سیکھیں — سبق لے طوطیٔ باغ عدن شکر فشانی کا
جو دلداری کی جاں تھی۔ بوالہوس گو انکو کہتے تھے — "گلی میں ان کے ہے چھڑکاؤ تلواروں کے پانی کا"
اُمنگوں کی کسک جن کو اگر بے چین کر دیتی — نزاکت روک دیتی ولولہ جوشِ جوانی کا
نہ جن کے عشق میں تھا دخل شمّہ بھر مجازی کا — کہ جن کا نور تھا اک لمعہ شمعِ لامکانی کا
بغل کیا اے سگِ دنیا! وہ شکلیں دل کی زینت تھیں — جو ارواحِ مطہّر کو تھیں مایہ شادمانی کا
شہودِ پاک کا منظر وجودِ خوب تھا جن کا — لقب شایاں تھا جن کے واسطے جانِ جہانی کا
عزیزو ہاں بتاؤ تو۔ کہاں وہ پیاری شکلیں ہیں؟ — مگر وہ بلبلہ تھیں ایک اِس دریائے فانی کا

کہیں مرگِ طبیعی ہے کہیں ہے مرگِ اسبابی
کہیں فتوے اطبا سے ہے مرگِ ناگہانی کا

غرض اک پاؤ گے طاقت ہو جو حاوی زمانے پر
نہ سُنتی ہے جو حیلہ بے مثالی۔ نوجوانی کا

جو بنتی ہے وہ اک دن مٹنے والی ہو کوئی شے ہو
یہ کہنا سچ ہے۔ حادث ہے مرادف لفظِ فانی کا

خموش اے کیفیِ محزوں نہ پانی ڈال جوشوں پر
مقامِ پند ہے یہ یا کہ موقعہ نوحہ خوانی کا

پر آدھی بات کو ذی عقل بے معنی بتاتے ہیں
نتیجہ چاہئے آخر کچھ اس طولِ بیانی کا

میں اس میں یہ کہونگا اے عزیز و صاحبِ دانش
تو کیا مانند یہی ہے لمبی چوڑی اس کہانی کا

کریں کس واسطے ہم کام اور کس کے لئے کوشش
بھروسا ہی نہیں ہے جب کہ اپنی زندگانی کا

نہیں اے دوستو! یہ اک غلط فہمی بلا کی ہے
مناسب دُور کرنا دل سے ہے اس بدگمانی کا

یقیں ہے ہم کو جب اس زندگی کو ہے فنا آخر
نکوکاری نہ کیوں مقصود ہو اس زندگانی کا

بھلا اس واسطے تم کام کل پر آج کا چھوڑو
یقیں کل تک نہیں ہے جبکہ تم کو زندگانی کا

کرو وہ کام فیضِ عام کے ہو نام دُنیا میں
اگر ہے آپ کو ارماں حیاتِ جاودانی کا

زمیں کی طرح دو ہر دشمن کو گنج بدلے میں
شجر ساں سنگدل کو دیجیے پھل نقصاں رسانی کا

نہ میٹھا کس لئے بولیں کریں کیوں بات ہم ایسی
اثر پیدا کرے سامع پہ جو اک سرگرانی کا

جراحت تیغِ بُرّاں کی تو اکثر بھر بھی جاتی ہے
کبھی بھرتا نہیں ہے گھاؤ لیکن بدزبانی کا

کہیں گھسنا زباں پر ہی نہ سارا حصر نیکی کا
زباں ہو ساتھ دل کے تب مزا ہے نیک بانی کا

ہے جینا چار دن تو پھر یہ کیوں بغض و حسد رنجش
ہے کے دن کے لئے یہ حوصلہ ایذا رسانی کا

تعصب کس سے؟ نفرت کیسی؟ جب اک شہر ہوتا ہے
مسلماں اور ہندو کا ہر اک قاصی و دانی کا

خوشی اور خوش دلی میں آؤ اس کو کاٹ دیں بھائی
بقیہ ہے جو کچھ اس چند روزہ زندگانی کا

انجمن

کلکتہ کی ایک علمی انجمن میں شرکت کے لئے لوگوں کو ترغیب دینے کے واسطے مندرجۂ ذیل چند بند مولوی غلام یٰسین صاحب آہ دہلوی مقیم کلکتہ نے ایک جلسہ میں پڑھے ہیں۔ اور اب بہ نظر اشاعت دفتر مخزن میں ارسال فرماتے ہیں۔ اور ساتھ ہی چند تمہیدی سطریں لکھتے ہیں:۔

ملک الشعرا ناصر بخاری کی غزل پر پیارے دو کے بند کہے گئے ہیں۔ یہ ہی ناصر بخاری ہے جس نے مکہ شریف جاتے ہوئے بغداد میں چند روز قیام کیا اور وہاں کے شاہی استاد خواجہ سلمان کو اپنے گروہ تلامیذ میں داخل کیا۔ یہاں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی حالت افلاس اس قابل نہ تھی کہ خواجہ سلمان جیسے کے گھر پر ملاقات کی غرض سے جاتا۔ اتفاقاً ایک دن دریائے دجلہ کی سیر کو خواجہ صاحب مع معززان شہر و شاگردان مشتاق تشریف لائے۔ آپس میں بڑی دیر سے یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اب کے سال (کچھ دنوں پہلے) دجلہ بڑے زور و شور پر تھا اور خوب چڑھ آیا تھا۔ ناصر نے ان کے یہاں آنے کی خبر سن پائی۔ اپنی اسی خستہ حالی کا تحفہ لئے ہوئے جا پہنچا اور موقع پاکر سلام کیا خواجہ صاحب نے کہا " چہ کسی" ناصر نے جواب دیا کہ " مرد غریب شاعرم" اسی اثنا میں خواجہ سلمان کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا ع

دجلہ را امسال رفتار عجب مستانہ بود

پھر کر جو شاگردوں کی سمت نظر اٹھائی سب کو سرنگوں پایا کسی نے ثانی مصرع نہیں کہا۔ سب کے سب تفکر کے دریا میں غوطہ کھانے لگے۔ مایوسی کے عالم میں (بطور امتحان) سلمان نے ناصر سے کہا اگر تو شاعر ہستی مصرع ثانیش بگو" ناصر نے کچھ آگے بڑھ کر کہا " بچشم" ے

دجلہ را امسال رفتار عجب مستانہ بود

پائے در زنجیر و کف برلب۔ مگر دیوانہ بود

خواجہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں دوڑ کے معانقہ کیا نام پوچھا اور بعد تعریف و ستایش سید ھے گھر لے آئے۔ اور بڑی عزت کی۔ اس کا شہرہ ہونا تھا ہی ہوا اتھا اب عین الیقین کا رتبہ حاصل کرتے تھے اپنے کلام پر اصلاح لی اور ناصر بخاری کی شاگردی کا فخر پایا۔ ناصر نے اسی وقت یہ پانچ شعر کی غزل

کہی تھی جو بغداد میں عام زبان دہ ہوگئی تھی اور جیسے بغداد والے ہر کہ مہ کی زبانوں پر پاتے تھے +

اجمال کی تفصیل ہے اور بات ہے ایسی
اور دل سی تو مطلب نہیں میں کہتا ہوں اپنی

زورِ کششِ سلسلۂ اُلفتِ جاناں
کھینچے لئے جاتا ہے مجھے سوئے گلستاں

پھولوں سے سروکار نہ کانٹوں سی عداوت
کچھ ہیں سے نہ ان بن ہے نہ بلبل سی محبت

ما را ہوسِ صحبتِ جاں پرور یار است
ور نہ غرض از بادہ پرستی نہ خمار است

دو چار اکٹھے ہوں اگر بات کے پورے
پڑنے ہوں کبھی کام نہ رہجائیں ادھورے

ہمت کی طرح چاہ کے انداز فزوں ہوں
رکھتے ہی قدم بزم میں سرگرمِ جنوں ہوں

جو عشق کے بندے ہیں وہ غم کھائیں تو کھائیں
جو مرد ہیں میداں میں وہی آئے کے پیام آتے ہیں

آتش نفساں قیمتِ میخانہ شناسند
افسردہ دلاں را بخرابات چہ کار است

مشتاق ہیں مشتاق ہیں صورت تو دکھاؤ
مطلب کی کہو آؤ ۔ ار بن گئے

مل بیٹھکے دس پانچ کرو کام کی باتیں
کٹ جائیں کبھی سا ز بن گئے

یاں آؤ تو معلوم ہو ایمان کی حالت
ملجاؤ تو کثرت ہی بنا دے ار بن گئے
گئے

در مدرسہ کس را نہ رسد دعوئے توحید
منزل گہِ مردانِ موحد سرِ دار است

تم پہلے تو ملتے نہیں یہ دیکھ کے نقشا
ملتے ہو تو سنتے نہیں پھر دل کی کہیں کیا

اسلام ہے اسلام کی بو باس نہیں ہے
بو باس ہے بو باس کا کچھ پاس نہیں ہے

جب شکل ہی بھونڈی ہی تو انداز سے حاصل؟
تم روح تو رکھتے نہیں اس سانچے سے حاصل؟

تسبیح چہ کار آید؟ وسجادہ چہ باشد؟
بر مرکبِ بے طاقتِ روح ایں ہمہ بار است

ہ یعنی انجمن کی جانب سے اور یہ انجمن حمایت الاسلام کا جلسہ انہیں دعوت دیتا رہتا ہے جو شریک نہیں ہوتے ہیں +

اپنوں کا بُرا حال تو دیکھا نہیں جاتا
ہم جیسوں کو ہنسنا نہیں آتا نہیں آتا

کیوں دور پڑے پھرتے ہیں ملجائیں خدارا
شکل اپنی ہمیں بزم میں دکھلائیں خدارا

اور یہ نہیں تو آہ سے کہدیں کہ نہ آنا
پھر آہ کی حالت کو نہ پوچھیں نہ ٹھکانا

ناصر اگر از ہجر بنالد عجبے نیست
مہجور زیار است و پریشان ز دیار است

کچکول

ہیں نہ ہو مبتلا کبھی
ایسی بلا کسی پہ نہ ڈالے خدا کبھی

دور ہو قسمت میں اے کریم
بدلے گی بھی ہمارے چمن کی ہوا کبھی

ے ہی پڑے ہیں پائے
افسوس بھول سے بھی نہ ظالم کھلا کبھی

تو حالِ زار پر
اُٹھ اُٹھ کے رہ گئے ہیں جو دستِ دعا کبھی

ے نیم نگاہی پہ کیا جئے
ہوتا ہے رستہ چلتے یونہی سامنا کبھی

ب وہ لب ملو گے قیامت کب آئیگی؟
جو منہ سے کہہ چکے ہو وہ تم نے کیا کبھی

مجبور اُٹھ کے جاتے ہیں اس در سے نا کش
کڑھنا نہیں جو یاد بھی آئے صدا کبھی

افسوس گو مگو ہی رہا اپنا رازِ دل
ہم نے کہا کبھی نہ کسی نے سنا کبھی

تھمتی نہیں ہے کاوشِ مژگاں کی چھیڑ چھاڑ
جاتا نہیں ہے زخمِ جگر کا مزا کبھی

شاعر کچھ اُس کی شانِ کریمی سے دور ہے؟
پھر چین ہیں مزے ہیں جو سُن لے خدا کبھی

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

دل چرا کر آپ تو بیٹھے ہوئے ہیں چین سے
ڈھونڈنے والے سے پوچھے کوئی کیا جاتا رہا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال
دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

ہو سکے مطلب نگاری کیا پریشاں طبع سے
ذہن میں آتے ہی حرفِ مدعا جاتا رہا

کس قدر اُن کو فراقِ غیر کا افسوس ہے
ہاتھ ملتے ملتے سب رنگِ حنا جاتا رہا

اب کئی دن سے وہ رسم و راہ بھی موقوف ہے
ورنہ برسوں نامہ بر آتا رہا جاتا رہا

(شیخ محمد اکرام) —— (داغ)

شکوہ نہیں کسی کی ملاقات کا مجھے
تم جانتے ہو وہم ہے جس بات کا مجھے

ڈرنا کسی کا اور وہ بجلی کا کوندنا
موسم بہت پسند ہے برسات کا مجھے

( ) —— ( )

وہ ڈرا ہوں یہ سمجھتا ہوں کہ دھوکہ تو نہ ہو
اب وہاں سے جو محبت کے پیام آتے ہیں

( ) —— (نامعلوم)

گیسوئے عنبریں جو شبِ تار بن گئے
بدرِ منیر اس مہ کے رخسار بن گئے

طرزِ خرام کہتی ہے انداز کو ترے
ہم فتنہ ہائے حشر بھی رفتار بن گئے

پاتے نہیں شفا وہ مسیحا کی ہاتھ سے
اُس چشمِ فتنہ زا کے جو بیمار بن گئے

ایمان و کفر عشق میں بالائے طاق ہیں
صد تارِ سبحہ دیکھیے زنار بن گئے

حیرت سی ہیں خموش بصدقِ صفائے دل
آئینہ ساں جو طالبِ دیدار بن گئے

رہتا ہی برکنار تھا موزوں مرے لیے
منظورِ بارگاہ جب اغیار بن گئے

تاب و تواں نے دیدیا مضطر کو جب جواب
تائب ہر اک گناہ سے ناچار بن گئے

(قریشی غلام مرداں صاحب مظفر)

——

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا	اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
(قاضی تفضل حسین)	(غالب)
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد	یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
بیگانگئ خلق سے بیدل نہ ہو غالب	کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے
(؍؍)	(غالب)
رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے	دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم	بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر	پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
(؍؍)	(غالب)
دُنیا کے الم ذوق اُٹھا جائینگے	ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائینگے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے	اب جائینگے اوروں کو رُلا جائینگے
(میر لیاقت حسین ہمسر)	(ذوق)
سرکش کو باغ دہر میں نیکی کا پھل کہاں	دیکھو کہ سرو میں کبھی ہوتا ثمر نہیں۔
(منشی دیا نرائن نگم)	
محفل یار سے اُٹھنے کو تو اُٹھے لیکن	درد کی طرح اُٹھے گر پڑے آنسو کی طرح
(؍؍)	
لگائے ٹھٹھ کھڑی ہے نامرادی	تمنائے دلی نکلے کدھر سے
(؍؍)	
روک دو گر غلط سے چلے کوئی	بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند	کس کی حاجت روا کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب	کیوں کسی کا گلا کرے کوئی
(؍؍)	(غالب)

طلبہ سے خطاب

ہمارے قابل دوست منشی احمد حسین خاں صاحب بی۔اے نے چند روز ہوئے اسلامیہ کالج لاہور کے حصہ سکول کے طالب علموں کے ایک جلسہ میں جو طلبہ نے تعطیلات گرما کے شروع ہونے سے پیشتر منعقد کیا تھا اور جس میں انگریزی اردو فارسی عربی نظمیں نہایت عمدگی سے بھرے مجمع میں پڑھ کر سنائیں۔ مندرجہ ذیل اشعار پڑھے جن میں انہوں نے طلبہ کو مخاطب کر کے بہت بیش قیمت نصیحت دی۔ یہ اشعار حاضرین جلسہ نے نہایت پسند کئے۔ ایک بند پر بالخصوص بار بار پڑھنے کی فرمائش ہوئی کیونکہ اس میں عالم شباب کے خطرات کا بہت خوبی سے ذکر کیا گیا ہے۔ ہم اس نظم کو لئے کچھ کل کے ایک حصہ کو چھپنے سے روک کر جگہ نکالتے ہیں اس خیال سے کہ التوا میں اس کا لطف نہ جاتا رہے۔ کیونکہ وہ تقریب جو ان اشعار کے کہے جانے کا باعث تھی پرانی ہو جائیگی:-

نوروزِ جم سے بڑھ کے یہ جلسہ ہے بیگماں — اسلامیہ سکول ہمارا ہے میزباں
سب مہمان آج ہیں خورسند و شادماں — ہاں آشنا ہے لذتِ شکرانہ سے زباں
ہم آئے اور آپ کا دل اس سے بڑھ گیا
لیکن ہمیں بھی یاد رہے۔ چاند چڑھ گیا

ہاں تم نے خوانِ خلق و محبت بچھا دیا — اور ہم کو جامِ شیرِ مسرت پلا دیا
تم گدڑیوں میں لعل ہو۔ تم نے دکھا دیا — جوہر بھرے ہیں تم میں یہ ہم کو جتا دیا
ہو بہرہ ور رحمتِ حق کے جلال سے
خالق بچائے آپ کو عین الکمال سے

اے نوجوانو! تم پہ لیاقت نثار ہو — تم قوم خوش نصیب کے دل کا قرار ہو
اسلامیہ سکول اگر لالہ زار ہو — ہر ایک تم میں سرو لب جوئبار ہو
تم ہو ہمارے باغ کے پودے ہرے بھرے

تم سے خزاں کے ہاتھ الٰہی رہیں پرے

یارب ہمارے باغ کے یہ نونہال ہیں یہ نو بہن ہم کو حرم کے غزال ہیں
ہر چند ماہِ عید ہیں یعنی ہلال ہیں لیکن یہ پیشِ خیمۂ جاہ و جلال ہیں

یارب ہم ان کو دیکھ کے ہوتے ہیں باغ باغ
یارب بنادے قوم کے گھر کا انہیں چراغ

اک دشت پرخطر ہے جوانی کا آستاں چلتی ہیں اس میں روز بلا خیز آندھیاں
ہر ہر قدم پہ اس میں چمکتی ہیں بجلیاں آتی ہیں دم زدن میں نحوست کی بدلیاں

صحرائے پُرخطر ہیں جوانی کے اے خدا
کرو کرم کہ دُور رہے اِن سے ہر بلا

اور تم معلمانِ سخن وہ صفات ہاں اس باغِ نوبہار کے اب تم ہو باغباں
تم ہم پہ مہرباں ہو سے خدا تم پہ مہرباں پھر پھول اس چمن کا ہو رشکِ گلِ جناں

یہ لاجواب باغ ہے اس کو سنگھار دو
یہ بے نظیر ہیرے ہیں اِن کو نکھار دو

تم نوجوانو! مجھ کو نہایت عزیز ہو اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ وافر تمیز ہو
گر یہ نہیں تو یاد رہے تم پشیز ہو پھچّن تمہارے اچھے ہیں نایاب چیز ہو

مرنے سے پہلے گر تمہیں سرسبز پاؤنگا
مَیں بامراد گلشنِ جنت کو جاؤں گا

طرف سے عوام کے لئے ایک دستور العمل ہوتے ہیں - یہ قوانین صرف تعذیری ہوتے ہیں جن کا موضوع افعال نیک کی تحریص و ترغیب نہیں ہوتا بلکہ افعال بد سے روکنا اور بچانا ان کا مقصود ہوتا ہے - تاریخ اور نیز تجربہ اس کا شاہد ہے کہ دانشمند واضعان قانون کا منشا کبھی کسی خاص وقت اور مقام میں بھی حسب خواہش پورا نہیں ہو سکا جوں جوں ملکی قوانین زیادہ دماغ سوزی سے بہتر اور مفید تر بنانے کی کوشش کیجاتی ہے - اسی قدر جرائم کی نوعیت بڑھتی جاتی ہے - مثلاً چوری خودکشی - مردم کشی وغیرہ کے ارتکاب کے وسائل کو بیکار کرنے کے لئے بڑے بڑے اہل عقل و دماغ راتوں کو تنہائی میں دماغ سوزی کرکے قانونی کتب میں اصلاحیں کرتے ہیں اور یہ شائستہ ذہین طباع اور تربیت یافتہ لوگ دل ہی دل میں ایک ایک جرم کے ارتکاب کے وُہ وُہ پہلو سوچتے ہیں جو ناخواندہ اور جاہل چوروں کے خواب میں بھی نہیں آسکتے - ادھر قانون مشتہر ہوا - جرائم پیشہ لوگوں نے سُنا اور غور کیا - "قدم جرم پیشتر بہتر" - انہوں نے قانون کی زد سے بچنے کو کوئی نیا ڈھنگ سوچا - "ضرورت ایجاد کی ماں" مانی جاتی ہے - غرض کوئی نئی ترکیب گھڑ لیتے ہیں - یہ ماننا لازم ہے کہ اس زمانہ میں امن و آسائش عامہ بہت کچھ ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ملکی قوانین انسداد جرائم میں حسب توقع حصّہ نہیں لیتے - اگر آج ڈاکے کم پڑتے ہیں - یا راہزنی کم ہوتی ہے - یا دھاڑے سُننے میں نہیں آتے تو کچھ نرے قانون کی برکت نہیں ہے بلکہ علوم و فنون نے ان اسباب کے پیدا کرنے میں بیشتر حصّہ لیا ہے جو ان جرائم کے ارتکاب کے لئے موانع ثابت ہُوئے ہیں -

تیسری قسم کا قانون - قانونِ سوسائٹی (رسم و رواج) اور عام رائے ہے - جس کا نفاذ کہیں پنچایتوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کہیں کسی درمیانی توسط کی ضرورت نہیں پڑتی - عوام کی رائے کا اثر ہی کافی ثابت ہوتا ہے - اِس بات کا ثبوت کہ یہ

تیسری قسم کا قانون عوام کی عادات و اخلاق پر اثر ڈالنے میں دوسری قسم کے قوانین سے بدرجہا زیادہ پُر تاثیر ہے۔ یہی کافی ہے کہ ان کے زندہ کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ دیہات میں دراصل اسی قسم کے قانون کی حکومت ہے۔ تیلی پنساری دُھنے جلاہے۔ راہزن۔ ڈاکو۔ لٹیرے وغیرہ وغیرہ یہ سب قومیں اور فرقے اس قانون کے مطیع ہیں۔ اس میں ایک یہ خوبی اور ہے کہ یہ اُن قبائح اور خباثت سے بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن کے ارتکاب کی طرف سے ملکی قانون آنکھ بند کئے ہُوئے ہے۔ مثلاً جھوٹ بولنا۔ گالی دینا۔ شراب پینا۔ زنا کرنا وغیرہ۔ یہاں جس محلہ میں میرا قیام ہے اُس کے ایک گوشہ میں ایک دھوبیوں کا گروہ مقیم ہے۔ ان دھوبیوں کی برادری کا شہر بھر میں ایک پنچ ہے۔ جس کی اس کل برادری پر حکومت ہے۔ کیونکہ اُمور متنازعہ میں اس کا فیصلہ ناطق ہوتا ہے۔ دریا پر کپڑے دھوتے ہُوئے اس دھوبیوں کے گروہ میں سے ایک شخص سے پنچ نے غیر معمولی خدمت لینا چاہا۔ اور انکار پر اس کو گالی دی۔ واپسی پر اس شخص نے برادری سے اپیل کیا۔ پنچایت ہُوئی۔ شہادت گذری۔ شکایت صحیح نکلی۔ برادری نے پنچ کو معزول کر دیا۔ جلسہ کے شروع میں پنچ ایک وقیع شخص تھا اور جلسہ کے ختم پر اس کی طرف سے یکایک سب کا التفات جاتا رہا۔

کائیتھوں نے برادری کے قانون میں اصلاح کر کے اپنی بیاہ شادی کے عملدرآمد میں بہت سی بدعات سے نجات پائی اور راجپوتانہ کے بڑے بڑے راجپوتوں نے اجمیر میں سبھا قائم کر کے بہت سے مذموم رسم و رواجات مسدود کر دیئے۔ سینکڑوں ہزاروں جنٹلمین ٹمپرنس سوسائٹی کی ممبری اختیار کرتے ہیں اور جتنا کچھ اس سوسائٹی کے وقیع ممبروں کا "فورس آف کیریکٹر" مدد دیسکتا ہے۔ ممبری سے فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ رسم و رواج کی جس قدر حکومت ہندوستان میں ہے اس کی

نظیر دوسری جگہ کم ملیگی۔ اور پبلک رائے کا اثر تو عموماً ہر زمانہ اور ہر ملک میں پورا پورا پایا جاتا ہے۔ پبلک کی نظر میں تحسین حاصل کرنے کے لئے سیکڑوں جانیں میدان جنگ میں قربان ہو جاتی ہیں۔ اور پبلک ملامت سے بچنے کے لئے بڑے بڑے شہروں میں بیسیوں خودکشیاں ہوتی ہیں۔ اس تمہید کے ساتھ یہ بھی جتلا دینا ضروری ہے کہ پبلک رائے بعض اوقات قانون سماوی سے بھی زبردست ثابت ہوتی ہے بلکہ اب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پبلک رائے پر مبنی رسم و رواج کے سامنے قانون سماوی نے اپنی گردن جھکا دی۔ جس گناہ کو برادری اور قوم بُرا نہ سمجھے وُہ گناہ ہی نہیں تو کچھ نہیں۔ مثلاً مسلمانوں کا قانون سماوی بتلاتا ہے کہ کسی کی غیبت کرنا اپنے بھائی کے گوشت کھانے کے برابر ہے۔ رشوت کھانا سود کھانا۔ حرام ہیں۔ مگر مسلمان عموماً سود کھانیکو تو بُرا سمجھتے ہیں۔ مگر غیبت کرنا۔ رشوت کھانا بے تکلف حلال سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے اس فعل کے ارتکاب پر کوئی تیور بھی نہیں بدلتا۔ بیوہ عورتوں کا نکاح اس رواج کی بدولت حرام سمجھا جاتا ہے۔

اس قدر تمہید کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم کے سرگروہ جن کو قوم کی طرف سے امتیاز کی عزت ملی ہے اور جو ہر قومی جلسہ میں کیا ذریعہ نظم اور کیا ذریعہ نثر تحریری اور زبانی گذشتہ عروج اسلام کا دُکھڑا روتے ہیں اور یہ کہتے جاتے ہیں کہ چونکہ ہم نے اصول اسلام کی پابندی چھوڑ دی۔ اس لئے ہم حقیر اور متبذل ہو گئے اگر ہم ان دانشمندانہ اصول کو پھر اختیار کریں تو ہماری قوم پھر ترقی کر سکتی ہے۔ آیا یہ قوم کے بزرگ اخلاص کے ساتھ سچ بولتے ہیں اور واقعی انکو اصلاح قوم مدنظر ہے یا یہ بزرگ لوگ کسی قدر ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔ یا تو ان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اسلامی اصول کی پابندی قوم کے عروج کا باعث ہوئی تھی۔ یا یہ لوگ اُن وسائل کو کام میں لانے سے مصلحتاً گریز کرتے ہیں۔ جو طہارت۔ پابندی اوقات۔

اعتدال ۔ خیرات وغیرہ کی تعلیم دینے والے اسلامی اصولوں کی زندگی کا باعث ہوں
میرے نزدیک جس قدر فصاحت کلامی اور عذوبت بیانی دیہات میں اہل دیہہ کے
جیب سے دس روپیہ چندہ وصول کرنے میں صرف ہوتی ہے ۔ اس کی چوتھائی
استعمال سے گانوں کے مسلمان اس امر پر برضا و رغبت متفق ہو سکتے ہیں کہ اُن کے
گانوں میں جو نماز روزہ کا پابند نہ ہو یا نشہ کی چیز استعمال کرے ۔ یا واجب زکوٰۃ
نہ دے تو اس سے رشتہ اتحاد قائم نہ رکھا جائے یعنے جیسا کہ اصطلاح میں کہا جاتا
ہے اُس کا حقہ پانی بند کر دیا جاوے ۔ اگر وُہ جب زکوٰۃ مسلمان ادا کرنے لگیں
تو میں سمجھتا ہوں کہ قومی کاموں کے لئے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے یہ نت نئے
ڈھکوسلے اور نئے نئے سانگ بھرنے کی ضرورت ہر سال پیش نہ آوے ۔ اب
رہ گئے بڑے بڑے شہروں کے رہنے والے ذی حیثیت لوگ جنکو کسی کے حقہ
پانی کی پروا نہیں ۔ ان کو قوم کے لیڈر اپنی "فورس آف کیرکٹر" سے اگر چاہیں تو ایک
سال میں سیدھا کر سکتے ہیں ۔ اگر وُہ لوگ جو رہنمایان قوم اور ہادیانِ قوم تسلیم ہو چکے
ہیں ۔ اگر وہ ایسے لوگوں سے جن کے افعال اچھے نہیں ۔ ملاقات ترک کر دیں یا اگر وقت
اسکا مقتضی نہ ہو تو اُن سے ملنا عار سمجھیں اور کم از کم پبلک یہ سمجھ لے کہ اُنکی ملاقات سے
فلاں وجہ سے گریز کیجاتی ہے اور ملاقات اِس لئے اخلاص سے خالی ہوتی ہے تو ممکن نہیں کہ
جن بھولے ہوئے اصولوں کا آئے دن مرثیہ پڑھا جاتا ہے وُہ زندہ ہونے لگیں ۔ خصوصاً رشوت
کا عیب تو روزگار پیشہ سے سوائے اس ترکیب کے چھوٹ نہیں سکتا ۔ جب ممتاز سے ممتاز قوم
جیسے ان معیوب اخلاق والوں کو بسر و چشم جگہ دیتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وُہ اپنے اُن اخلاق
سے شرمائیں ۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ قوم کا مرثیہ پڑھنے والے بزرگ خود بھی کچھ پابندی اصول
کی داد دیتے ہیں یا نہیں ؟ ۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ؛ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

ز ادریس احمد ۔ از رام پ

تبادلۂ خیالات

(۳)

یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا حقائق انتقالی صورتوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کیا ایک حقیقت ایک موقعہ پر حقیقت ہے اور دوسرے پر دائرہ حقیقت سے نکل جاتی ہے۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ حقیقتیں کبھی اپنی حقیقت کو ترک نہیں کر سکتی ہیں۔ لیکن حقائق یکساں کیفیت یا یکساں کمیت کے نہیں ہیں حقائق باعتبار اپنے اقسام کے چند قسمیں رکھتے ہیں۔

(۱) حقائق کلیہ (۲) حقائق جزیہ۔ (۳) حقائق عامہ۔ (۴) حقائق خاصہ۔ (۵) حقائق قومیہ۔ (۶) حقائق ملکیہ۔ (۷) حقائق معاشرت۔ (۸) حقائق معاد۔

حقائق عامہ اور حقائق کلیہ وہ حقائق ہیں جو ہر وقت اور ہر ملک میں بلا کسی تمیز کے اپنا اثر ڈالتے ہیں اور ہر فرد بشر کو ہر وقت اُن کی ضرورت ہے اور انسانی زندگی کی اعلیٰ غرضیں اُنکے وجود سے مربوط اور وابستہ ہیں اگر ایسے حقائق صرف جنوبی جانب میں ہی ہوں تو دیگر اطراف شرق و شمال او غرب میں بھی وہی اثر اور وہی خوبی رکھینگے جو انہیں جنوب میں حاصل ہے۔

جو حقائق جزیہ یا قومی ہیں اور بعض ایسے اسباب سے وابستہ ہیں۔ جو اُوسی خطہ یا اُسی قوم سے مربوط ہیں۔ اُن کا بعض اوقات تو دوسرے خطہ والوں اور دوسری قوموں سے مقابلہ ہو سکتا ہے لیکن بعض اوقات بالکل مغائر ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے حالات اور ایسے کوائف میں ان کا اقبال اور اُن پر عامل ہونا گونہ مخالف ثابت ہوگا اور وہ حقیقت باوجود اس نکے کہ دوسرے دل نکے مقابلہ میں ایک حقیقت ہے

اس گروہ کے واسطے کبھی بلحاظ حالات موجودہ کے سودمند حقیقت ثابت نہ ہوگی گو وہی حقیقت کسی اور موقع پر بوجہ تغیر و تبدیل حالات اور کوائف کے کسی قدر مفید نکل آئے۔

ڈاکٹروں اور اطبّاء کے نزدیک ہر جڑی بوٹی اور ہر دوا کو بجائے خود ایک اثر حاصل ہوا اور بمصداق حقائق الاشیاء ثابتۃٌ یہ اثر بذاتہٖ ثابتہ ہیں لیکن ان کا اثر ہمیشہ طبائع یا کبھی کبھی موسم کے لحاظ سے ظاہر ہوتا ہے باوجود اس کے کہ ایک شئے ایک طبیعت یا ایک فرد میں کچھ اور اثر رکھتی ہے یا دُوسری طبیعت میں اس کے خلاف عمل کرتی ہے۔ یہ اختلاف صرف تخالف طبیعت یا قبول کرنے والی قوت کے اختلاف کی وجہ سے ہے اسی طرح دیگر حقائق کا حال ہو۔

چونکہ حقایق کے اقسام اور تخصیص وغیر تخصیص کی بحث بجائے خود ایک جُدا گانہ بحث ہے اسواسطے ہم اس کو کسی اور موقع کے واسطے چھوڑ کر صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہمیں ہر خیال اور ہر پیش آمدہ صورت کو انہیں اصولوں اور اُنہیں ضوابط سے مقبول یا مردود قرار دینا چاہیئے کہ جو ہم نے اُوپر کے جملوں میں بیان کیے ہیں۔ اندھا دھند قبولیّت یا تردید اصول حق کے منافی ہے۔

تبادلہ کی اعلیٰ غرض یہ ہونی چاہیئے کہ جو شخص یا جو ملک اور جو قوم اُسے قبول کرتی ہے اُس کے حق میں وُہ یا تو منفرداً مفید ہو اور یا مجموعہ افراد کے لئے سودمند ثابت ہو اور اس کا سودمند ہونا بالعرض نہ ہو بلکہ باللزوم۔

متبدّل خیالات کا صرف اس غرض سے خیر مقدم کرنا زیبا ہے کہ ان کے اقبال سے ایک سوسائٹی یا ایک قوم یا کم سے کم ایک ذات واحد میں بہبود اور بہتری کی صورتیں پیدا ہوا اور دلآویز عمدگیاں باغ زندگی میں نشو ونما پاویں اور اُنکے ذریعہ سے وہ اُمور اور وُہ باتیں اور وُہ فتوحات حاصل ہوں جن کا

وجود پہلے نہیں تھا اور جن کا حصول ضروری ہے۔

جو لوگ تبادلہ خیالات سے صرف ایک جدت اور فیشن کے طور پر مستفید ہوتے ہیں وہ دراصل کوئی اعلیٰ غرض حاصل نہیں کرتے بلکہ عارضی طور پر ایک ایسا عمل کرتے ہیں جو اُن کے یا اُن کے اَور افراد کے حق میں بالخصوص مفید ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی اُن کے اس عمل سے سوسائٹی یا قومی افراد کے حق میں کوئی صورت ترقی کی نکلتی ہے۔

دراصل ایسی حالت میں خود اُن لوگوں کا ہی اُن پر وثوق اور اعتبار نہیں ہوتا۔ وُہ جب دیکھتے ہیں کہ جس ماخذ سے اُنہوں نے اس غتیل خیال کا تبادلہ کیا تھا اب اُسی ماخذ میں سے ایک اَور خیال معرضِ ظہور میں آکر نشوونما پا رہا ہے تو وُہ بہت گھبراتے اور مضطرب ہوتے ہیں اور جلدی کرتے ہیں کہ اُس پہلے خیال کے معاوضہ میں اُس جدید خیال کو قبول کریں۔ یہ مجبوری انہیں صرف اسواسطے لاحق ہوتی ہے کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے عادل نہیں ہوتے بلکہ محض فیشن کے لحاظ سے دراصل ضرورت اور فیشن کے معانی اور اغراض میں بہت کم فرق رکھا جاتا ہے جو امر یا جوبات ضرورت کے اعتبار سے اختیار کی جاتی ہے یا جسے ضرورتاً ترک کرتے ہیں۔ وُہ اپنے ساتھ دلائل رکھتی ہے لیکن جو عمل محض دیکھا دیکھی ہوتا ہے وہ اخیر پر ایک تماشا ثابت ہوتا ہے۔ ضرورت۔ سُودمندی اور ناسودمندی کو مقدم رکھ کر تبادلہ خیالات سے حصہ لو۔ یہی عمل تمہارے حق میں ایک مستقل افاضہ ہے۔

۱

تبادلہ خیالات کی سُودمندی باعتبار وسعت۔ تبادلہ خیالات شخصی بھی ہوتا ہے اور خاص وعام بھی۔ اتفاقی بھی اور ارادی بھی۔ موثر بھی اور غیر موثر بھی۔ سودمند بھی اور ناسُودمند بھی۔ عارضی بھی اور لازمی بھی جُزوی بھی اور کلی بھی

ایک شخص پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے اور ساری قوم پر بھی - یا صرف ایک مخصوص گروہ پر - تبادلہ خیالات خواہ کسی پیمانہ پر ہو - وُہ اس حالت میں مفید ثابت ہوگا جب واقعی سودمندی کے خیال سے اختیار کیا گیا ہو - اگر ایک قوم کسی غیر قوم سے چند معاشی یا معاشرتی خیالات کا اخذ یا اکتساب کرے تو وُہ اس حالت میں بحیثیت مجموعی مفید ہوگا - جب وُہ ان چند اصولوں کی پابندی سے اختیار کیا جاویگا جن کا ذکر پہلے ہو لیا ہے - جو تبادلے محض وہمی اور اندھی جوش سے کئے جاتے ہیں - وُہ کسی حالت میں اخیر پر سودمند ثابت نہیں ہوتے - گو وُہ بجائے خود صادق ہوں اور اُن میں سودمندی کی صفت پائی جاوے - مگر ان کی ایسی صداقت بوجہ تخلف اصول الضاع الشئے فی محلہ دُوسروں پر اپنے اظہار صداقت سے باز رہتی ہے -

وہی طریقہ اور وُہی تبادلہ اختیار کرو جو بلحاظ اپنی عام سودمندی کے پسندیدہ ہو اس حال پر چلو کہ جو کلیتہً مفید ہے اُن راہوں سے پرہیز کرو جو تمہیں تمدن اصلی منزلوں سے دُور رکھتے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ کسی قوم کی لازوال خوبیوں کا عکس لو - تو تمہارا اعلیٰ فرض یہ ہے کہ ضرورت اور فرض کے خیال سے ایسا کرو نہ کہ دیکھا دیکھی یا کور تقلید سے -

اگر تم عزیزوں کے کمالات اخذ کرنا چاہتے ہو تو سب سے اوّل یہ دیکھو کہ انکا طریق اخذ کیا ہے اور کیا وُہ نمائشی کمالات تو نہیں ہیں اور کیا اُن میں صداقت اور اُن کے مقابلہ میں تم اپنے اندر کیا کچھ رکھتے ہو - پھر کھو اور مقابلہ کرو اور پھر کہو کہ معاملہ کیا ہے - جو قوم اپنی خوبیوں کو چھوڑتی اور دوسروں کی کیفیات کو اندھی تقلید سے اختیار کرتی ہے وُہ دراصل اپنا خزینہ لٹا کر دوسروں کے مال کو تکتی ہے - وُہ دونوں حالتوں میں قابل نفرت ہے -

اور جو قوم اپنی بُرائیوں اور اپنے بُرے خیالات کو غیروں کی عمدگیوں اور غیروں کی اچھائیوں سے صرف اِس واسطے نہیں بدلتی کہ وُہ غیروں کی ہیں وُہ اپنی ذات اور اپنی قوم پر ظلم اور قہر کرتی ہے۔ اچھی خصلت اور اچھا خیال جہاں سے ملے اس خوشی سے اخذ کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کروگے تو تم کفرانِ نعمت کرتے ہو۔

بے وقوف اور بے وقر ہے وہ قوم جو اپنی خوبیوں کو ترک کرتی اور دُوسروں کی خوبیوں کی طرف حسرت سے تکتی ہے۔ احمق ہے جو اپنی عظمتوں کو حقیر جانتا اور غیروں کے نقائص کو قبول کرتا ہے۔ سادہ لوح ہے وُہ فرقہ جو اپنی برائیوں کو غیروں کی اچھائیوں سے نہیں بدلتا۔ ناقص العقل ہے وُہ جماعت جو خُذ مَا صَفا اور دَع ما کدر پر عمل نہیں کرتی۔ بیہودہ ہے وُہ گروہ اور پاگل ہے وُہ شخص جو اپنی برائیوں پر اتراتا اور دوسروں کی نیکیوں اور عمدگیوں کو نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا اور بے وقوفی سے ترک کرتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو تمام برکتوں کے مالک ہم ہونگے۔ ے

اگر ہم پہلو ئے نفع و ضرر کو بھی دیکھتے جاتے ہمیشہ حسنِ کوشش کا ثمر بھی دیکھتے جاتے

ایک غلط فہمی۔ وسعت اثر تبادلہ کی بابت ایک غلط فہمی چلی آتی ہے۔ بعض وقت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تبادلہ خیالات کی معمولی غلطی کل افراد کو کیونکر حاوی ہوسکتی ہے اور اس کا بُرا اثر اَوروں کو کیسے متاثر کرسکتا ہے۔ یہ ایک شرم دلانے والی مسامحت ہے ایک بُرا خیال اگرچہ ایک ہی فرد کی ذات میں اثر پذیر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی نیت رفتہ رفتہ بہت سے افراد کو گھیر لیتی ہے۔ لوگ غور نہیں کرتے ورنہ انہیں معلوم ہوجاوے کہ ایسی معمولی غلطیاں کہاں تک خوفناک ثابت ہوتی ہیں۔

تبادلہ در تبادلہ۔ لوگ تعجب کرتے اور حیران ہوتے ہیں کہ ایک خیال یا ایک اثر جس کو ایک فرد یا چند لوگ اختیار کرتے ہیں۔ ساری قوم میں کیونکر ساری ہوجاتا

ہے اور کیونکہ ایک چنگاڑی شعلہ بن جاتی ہے۔
یہ نہیں سوچتے کہ ہوا کیونکر تمام ابدان میں نفوذ کر جاتی ہے اور کس طرح مسام اُسے قبول کرتے ہیں۔
تبادلہ خیالات بھی ایک ہوا ہے جو چاروں طرف سے چل رہی ہے ہوا کا چلنا لوگوں کی خواہشوں پر موقوف نہیں۔ لوگوں کی خواہش ہو یا نہ ہو وُہ ضرور چلے گی اور ضرور اُس کا دلوں اور دماغوں پر اثر ہوگا۔ ؎

رہنما شوقِ نہاں کی سرد آہیں ہوگئیں میرے دل سے اُن کے دل تک صاف راہیں ہوگئیں

لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ جدید تبدیلیاں اُن کی طبیعتوں اُن کے اخلاقی مساموں میں گھر کرتی ہیں۔ وہ لوگ جو اس بات پر اُڑتے اور ضد کرتے ہیں۔ کہ غیروں کے حقائق صادقہ کو ہم کسی حالت میں بھی قبول نہیں کرینگے۔ غلطی پر ہیں وُہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ آفتاب صداقت کی کرنیں اپنے ذاتی زور سے ہی سرایت کر جاتی ہیں۔ ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ جو تبدیلیاں معاشرت میں ہوتی ہیں اور جن کی ضرورت ہے اور جو زمانہ پیش کر رہا ہے وہ ہو کے رہینگی۔ خود تم چاہو یا نہ چاہو۔ تمہاری مرضی ہو یا نہ ہو۔ تم پسند کرو یا نہ کرو۔ صداقتیں اپنی حکومت منوا کے رہینگی اور حقائق کا عمل دخل اپنا دخل پاکر اور اپنا قبضہ جما کر رہیگا۔ زمانہ کی طاقت تمہیں خود ہی سیدھا کرے گی۔ تم خود ہی رفتہ رفتہ اُس مرکز پر آتے جاؤگے جہاں صداقتوں کے آفتاب کا درشن ہوتا ہے۔ تمہاری ضد اور تمہاری نفرت اخیر پر ندامت کا باعث ہوگی۔ تم بتدریج اپنی ذات میں مختلف تبدیلیاں پاؤگے اور دیکھوگے کہ تمہارے خیالات میں کیا کچھ حیرت ناک انقلاب ہوتے ہیں۔ تمہیں معلوم بھی نہیں ہوگا اور تم محسوس بھی نہیں کروگے۔ لیکن خیالات میں برابر اور لگاتار تبدیلی ہوتی جاوینگی۔ مایحتاج ضروریات روزمرہ تمہیں آپ ہی اُن باتوں

اُن کیفیات پر لائینگی جنہیں تم سخت معیوب خیال کرتے تھے۔ ایک طرف سے تم نفرت اور کراہت کروگے اور دُوسری جانب سے تمہاری طبیعتیں خاموشی کے ساتھ تبادلۂ خیالات سے متاثر ہوتی جاوینگی۔

تاریخوں کے ورق الٹو پلٹو اور دیکھو کہ تبادلۂ خیالات کے وقت دنیا اور انسانی جماعتوں میں کیسے کیسے شور وشر اُٹھے اور کیا افراتفری پڑی۔ اور آخر اُس کا نتیجہ کیا ہوا۔ جو لوگ اور جو طبیعتیں مخالفتوں پر لگی بیٹھی تھیں وُہ باوجود مخالفت کے خود ہی اُن راہوں پر آٹھہریں جو زمانہ نے دکھائی تھیں۔

کس سے بچو۔ تبادلۂ خیالات میں ریس اور محض بھیڑ چال سے بچو حقیقت کے معاوضہ میں ایک حقیقت لو اور وُہ راہ اختیار کرو جو سیدھی ہو ایسا نہ ہو۔ کہ اندھی ریس اور اندھی تقلید تمہیں اندھا کنواں دکھادے۔ دُنیا میں صدہا قسم کے خیالات متداول ہوتے اور گوناگون ہوائیں چلتی ہیں۔ لیکن سب خیالات اور سب ہواؤں کا رُخ ایک نہیں ہوتا۔ تبادلۂ خیالات سے جو کیفیات حاصل ہوتی ہیں وُہ آبِ زلال بھی ہیں اور زہر ہلاہل بھی اور ان دونوں میں تمیز ضرور کرنی چاہیئے۔

اکثر صورتیں نمایش اور دکھاوے میں دلربا ہیں لیکن سودمندی اور ثبات میں مہلک اور بیوفا۔ کسی شئے کی ظاہری خوبصورتی یا نمائش و حسن واقعی متلاشی دلوں اور دردمند روحوں کے واسطے ایک پیغام نشاط افزا ہے۔ لیکن جب سیرت اور اصلیت بُری نکلیگی تو یہی حسن اور یہی نمائش وبالِ جان ہو جاویگی۔

کس کا لحاظ رکھو۔ ہر ایک تبادلہ میں قوم اور قومیت کا لحاظ رکھو قومیت معاشرت کے لحاظ سے جُداگانہ ایک مذہب اور ملت ہے جو لوگ قومی عظمتوں قومی خصوصیات کو کھوتے اور برباد کردیتے ہیں۔ وہ اپنے بُتِ عظمت کو آپ ہی توڑتے ہیں۔ یاد رکھو کہ ان قوم دوسری قوم کے سامنے اپنے بُتِ قومیت کو توڑ کر عزت

نہیں پاتی۔ یاد رکھو تمہاری قومیت تمہاری عزت تمہاری عظمت ہی تبادلہ خیالات کے ذریعہ سے سب سے بڑھ کر یہ خیال قابل تمکنت ہے کہ وُہ فرقے جو آجکل عزت میں قومیت کے بُت عظیم کو کس تقدیس اور کس تعظیم کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور تبادلہ خیالات کی دیوی کا فیضان کس نمط کا ہوتا ہے۔

غیروں سے حقایق حاصل کرنے میں سخت بے صبر بن جاؤ۔ جس طرح ایک پرلے درجہ کا حریص اور طامع دوسروں کے مال اور دولت کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا اور اڑا لینے پر دوڑتا ہے۔ اسی طرح پر تم بھی کوشش کرو۔ عمدگیوں کو لے لو اور اُن پر سو جان سے قربان ہو جاؤ۔ لیکن اپنی قوم۔ قومیت۔ قومی امتیازات کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ دو۔

اگر تمہاری قومیت چھٹ گئی اور تم اس دائرہ سے دُور جا پڑے تو تم نے کچھ بھی نہ حاصل کیا یہ وُہ راز ہے جس نے قوموں کو بنایا اور قوموں کو قائم رکھا ہے۔ یہ وہ بھید ہے جو قوموں کو قوموں میں محترم اور باعزت ثابت کرتا ہے۔ ہماری حرمت ہماری عزت ہمارا اقبال ہماری قومیت میں ہے۔ ؎

مجھے نہ کچھ نظر آیا سوائے جلوۂ یار
جدھر جدھر دل روشن سوا دیکھے پھرا

صبح

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نُور ہو گیا — پھر مشک شب جہاں سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دُور ہو گیا — باطل رسالۂ شب دیجور ہو گیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامہ میں
مضموں تھا آفتاب کا ذرّوں کے نامہ میں

بسمل کانپوری

زندہ اہلِ کمال

سیّد علی محمد شاد

ملک میں ایک طرف تو یہ رونا ہے کہ اہلِ کمال دن بدن مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ اور جو جاتا ہے۔ اُس کا قائم مقام پیدا نہیں ہوتا۔ اور دوسری طرف یہ تماشا اکثر نظر آتا ہے۔ کہ ذی علم اور صاحبانِ فن عمریں کاٹ دیتے ہیں اور ملک اور اہلِ ملک کی جانب سے اُن کی کافی قدر دانی نہیں ہوتی۔ جس سے وُہ اپنے علم اور فن میں ترقی کریں۔ اور جس سے دوسروں کو ترغیبِ ترقی ہو۔ اس وسیع ملک کے ہر گوشہ میں ایسے قابل گوہر موجود ہیں۔ جو اپنے رنگ میں فرد ہیں۔ مگر اُن کے معاصر اور ہمسائے تو تنگ خیالی کے سبب ان کی قدر افزائی اپنے لئے نقصان رساں سمجھتے ہیں اور دُور رہنے والے اُن کے کمالات سے آگاہ نہیں ہوتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مخزن کے ذریعہ کبھی کبھی ملک کے زندہ اہلِ کمال کے حالات ملک میں پھیلتے رہیں۔ تاکہ جن لوگوں کی خدمت میں صاحبانِ فن نے عمریں صرف کر دی ہیں۔ وہ انہیں پہچان تو لیں۔ اور احسان نہ مانیں۔ بلا سے۔ یہ تو نہ ہو کہ انہیں خبر بھی نہ ہو اور وہ ان کے لئے جان لڑا دیں۔

سوختیم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نشد چوں چراغانِ شبِ مہتاب بیجا سوختیم

اس سے پہلے بھی دو چار مضامین "زندہ اہلِ کمال" لوگوں کی حالات کے متعلق درج رسالہ ہو چکے ہیں۔ گو اس عنوان سے نہیں ہوئے اور اب بھی اس امر کے التزام کا ہم وعدہ نہیں کر سکتے۔ کہ باقاعدہ طور پر ایسے حالات شائع ہونگے۔ لیکن گاہے گاہے اس فرض کا ادا کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان باکمال لوگوں میں مولوی سید علی محمد صاحب شاد رئیس و آنریری مجسٹریٹ پٹنہ ہیں۔ ان کے کلام کے ہم ایک عرصہ سے معترف ہیں گو ہمیں اخبارات اور رسالوں کے ذریعے محض چھوٹے چھوٹے ٹکڑے حضرت شاد کی نظم کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور حضرت شاد نے باوجود ایک ضخیم مجموعہ اصنافِ کلام کا رکھنے کے آج تک بوجوہات چند در چند جو انکی بعض مجبوریوں کا نتیجہ ہیں۔ اپنا کلام مکمل شائع کرنے میں بخل کو کام فرمایا ہے۔

اس اعتراف میں ترقی دو موقعوں پر ہوئی۔ اوّل تو ایک دفعہ ہمیں جناب قبلہ میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم یادگار انیس مرحوم کی زبان مبارک سے حضرت شاد کی تعریف سُننے کا موقع ہوا اور دوسرے ۱۹۰۱ء میں سفر کلکتہ سے لوٹتے ہوئے ہمیں پٹنہ میں خود حضرت شاد سے مختصر سی ملاقات کا فخر حاصل ہوا۔ جس میں ان کا کلام اُن کی زبان سے سُنا۔ پرانی بندشوں میں نئے خیالات لکھنے کا پہلو جس خوبی سے یہ شخص نباہتا ہے۔ بہت کم آدمی نباہتے ہونگے۔ ہمارے ایک کرم فرما جو حضرت شاد کے مداحوں میں ہیں اور روسائے پٹنہ میں سے ہیں۔ صاحب موصوف کے کچھ واقعات زندگی لکھ کر ہمیں بھیجتے ہیں۔ ہم انہیں درج رسالہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ جتا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اگر ہمارے مضمون نگار دوست بجائے مولینا شاد کے ذاتی اور خاندانی اعزاز پر زور دینے کے اُن کے علمی کمالات زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے۔ تو اس علم ادب کے رسالہ کے لئے موزون تر ہوتا۔ آئندہ اگر کوئی صاحب اس قسم کے مضامین پر لکھنے کا قصد فرمادیں۔ تو یہ ضروری پہلو مدنظر رکھیں ایک بسیط سوانح عمری میں ہر قسم کے حالات درج کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ مگر کسی علمی رسالہ میں ایک مصنف کی تعریف کرتے ہوئے زیادہ زور اس کی تصانیف کی خوبیوں اور خصوصیتوں پر دینا چاہیئے۔

(ایڈیٹر)

جون ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں ایک تحریر زبان وقلم کے عنوان سے دیکھ کر دل و دماغ پر عجیب طرح کا اثر ہوا۔ صاحب مضمون نے اہل کمال کی بے قدری کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ اس پر بے ساختہ زبان سے تحسین و آفرین کے کلمے نکلے۔ صاحب تحریر جو زمانہ کی ناقدرشناسی پر افسوس کرتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ اس وقت بھی کتنے ہی اہل کمال ایسے ہیں کہ اگر قوم کے صاحبان بصیرت اُن کو پوچھیں تو روا ہے مگر حیف کہ ایسے ذی کمال قوم کی غفلت شعاری اور محض تعصب کے سبب سے زاویہ خمول میں پڑے ہیں۔ اور قوم اُن کے کمالات سے بہرہ یاب نہیں ہوتی۔ اگرچہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ایک وقت ایسا ضرور آنے والا ہے کہ اُن کا کمال رائگاں نہیں

جائیگا۔ لیکن کیا فائدہ کیونکہ اُن کو تو زمانہ چشم خلق سے معدوم کر دیگا۔ اگر بعد کو قدر ہُوئی تو خود اس صاحب کمال کو اس سے کیا نفع اس اثر انگیز تحریر کو دیکھ کر مجھ کو بے اختیار اپنے شہر کے صاحب کمال اور اُستاد یگانہ جناب خان بہادر مولوی سید علی محمد صاحب شاد یاد آ گئے۔ ہرچند کہ وجاہت ظاہری انہیں نصیب ہی۔ اور روپیہ پیسہ بھی خُدا نے حسب ضرورت انہیں دیا۔ تاہم جس قدر دانی کے وُہ مستحق تھے۔ وُہ آج تک نہیں کی گئی۔

جناب ممدُوح سادات حسینی الحسنی اور اولاد امام زین العابدین علیہ السّلام سے ہیں۔ آپ تک حضرت امام علیہ السّلام سے لیکر ۳۴ ویں پُشت ہے۔ دہلی میں آپ کا خانوادہ سادات کمبل پوش کے نام سے مسمّٰے تھا۔ نوّاب امیر الامرا خانِ دوران خان بہادر آپ ہی کے اجداد میں ہیں جو نادر شاہ قہرمانِ ایران کی فوج کے ہاتھ سے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے ہمرکاب کمالِ شجاعت کے ساتھ مارے گئے۔ آپ کے ننھیال حضرت خواجہ عبد اللہ انصاری مشہور بپیر ہرات کی اولاد سے ہیں اور آپ کے نانا نواب شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق بہادر نیکنام ہیں جو علاوہ اَور اَور مناصب کے نادر شاہ کی چڑھائی کے زمانہ میں محمد شاہ بادشاہ کی غیبت کے وقت قلعہ معلّٰے میں بادشاہ کے نائب رہے۔ اور تمام کارخانہ جات شاہی حتیٰ کہ پردگیان حرم بادشاہی آپ ہی کے سپُرد تھے۔ دہلی اور پانی پت میں اب تک بعض عمارتیں نوّاب موصی الیہ کی بنوائی ہُوئی ہیں۔ علی الخصوص کشمیری محلّہ میں ایک مسجد بھی اب تک موجُود ہے۔ نواب خان صادق بہادر اور خاتم الم نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر جد اعلائے حضور پُرنور ہز ہائینس۔ والی حیدرآباد دکن خلد اللہ ملکہ سے بیحد دوستی اور یکجہتی تھی۔ اس کی اکثر نقلیں دفتر تاریخ میں مندرج ہیں۔ چنانچہ جب مسٹر بہیوز صاحب بہادر سٹی مجسٹریٹ پٹنہ

اسسٹنٹ پولٹیکل اجنٹ حیدرآباد مفرز ہوکر جانے لگے تو خان بہادر مولانا شاد نے بطور یادگار ایک قدیمی تصویر اُن کو دی وہ تصویر حضور نواب آصف جاہ بہادر کی تھی جسکی پشت پر خود نواب ذیجاہ ممدوح کے قلم سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی " کار نقاشان حیدرآباد دکن" پھر یہ عبارت تھی "این مختصر ہدیہ ایست از آصف بے سلیمان بخدمت نواب معلےٰ جناب شمس الدولہ بہادر محمد شاہی ع گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف" اس کے نیچے تاریخ و ماہ و سال پھر دستخط اور بڑی مُہر تھی مسٹر ہوز نے جس خوشی کے ساتھ اس ہدیہ کو قبول کیا اس کا کیا بیان ہو سکے زیادہ تر اُن کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ ہندوستان کی قدیم مصوری کا یہ ایک عمدہ اور بیش بہا نمونہ تھا۔

حضرت مولانا شاد کی دادی صاحبہ سادات بارہ اور نواب قطب الملک بہادر کی اولاد امجاد سے ہیں اور نانی صاحبہ نواب غفران پناہ علی وردی خان بہادر مہابت جنگ مشہور صوبہ دار بنگالہ و بہار کے خانوادہ سے ہیں۔ مولانا کے پرنانا نواب محمد اسمعیل قلی خان بہادر سراج الدولہ مرحوم کے حقیقی خالہ زاد بھائی ہیں انہیں سراج الدولہ پر بمقام پلاسی سرکار انگریزی نے فتح پائی تب سے رفتہ رفتہ کل ہندوستان پر سرکار کا تسلط ہو گیا اب اس خاندان میں بظاہر بجز ہمارے مولانا کے دوسرا شخص باقی نہیں ہے آپ کی نانی صاحبہ کو سرکار سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن ملا کرتی تھی جو بیخبری کے سبب سے اُن مرحومہ کے مرتے ہی ضبط ہو گئی حضرت مولانا کے ددھیال اور ننھیال دونوں خاندانوں میں لاکھوں روپے ماہانہ کی جائداد اور بادشاہ کا عطا کردہ آل تمغا تھا یہ جائداد کثیر بہت کچھ تو دو عملی کے زمانہ میں اور باقی ہمارے مولانا کے بلوغ سے پیشتر ہاتھ سے جاتی رہی۔ بایں‌ہمہ بقیہ جائداد اتنی تھی جتنی ایک رئیس متوسط الحال کے لئے کافی ہو مگر حضرت نے ان سب کو بعوض زر دین مہر اپنی زوجہ اولےٰ اور ثانی کے ورثا کے حوالہ کر دیا۔ آپ ہمارے شہر میں کیا باعتبار اپنے خاندان نامی کے اور کیا باعتبار

اوصاف ذاتی کے نہایت موقر اور با اثر شخص ہیں۔ مدتوں سرکاری طریقہ سے میونسپل
کمشنر رہے اور اس عہدہ کو ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اب تک واقف کار دعاگو
ہیں۔ آج بھی آپ آنریری مجسٹریٹ ہیں اور ہمیشہ چاہتے ہیں کہ جس طرح سے اور [illegible]
ت رنگ زمانہ دیکھ کر دست کش اور گوشہ گزین ہیں بالکل ہی کنارہ کش ہوں مگر عام و
خاص کسی طرح سے اس کو پذیرا نہیں کرتے اس لئے آپ بھی خلق اللہ کا نفع اور اصرار
دیکھ کر جہاں تک مشق تحصیل وغیرہ سے فرصت پاتے ہیں۔ اس خدمت کو بجا لاتے ہیں۔
آپ نہ فقط ہم ہندوستانیوں میں باعتبار اپنے کمالات کے موقر اور یگانہ اور مشہور و معروف
ہیں بلکہ حکام یوروپین میں اور بخصوص ان ذی علموں میں جو اردو زبان کو بھی اچھی طرح
سے جانتے ہیں۔ بیحد عزیز اور نہایت قابلِ قدر خیال کئے جاتے ہیں اکثر حضور صاحب
کمشنر اور حضور نواب لفٹنٹ گورنر اور جناب عالی حضور وایسرائے بہادر کے عالی شان
درباروں میں آپ نے اپنی لاجواب نظمیں مناسب وقت پڑھیں اور داد پائی خصوصاً
افسران سررشتہ تعلیم و ڈائرکٹران پبلک انسٹرکشن نے آپ کی نظموں اور تصانیف
کو بڑے بڑے مشہور اردو فارسی و عربی کے مصنفوں کے پاس بنظر تحریر رائے و ریمارک
بھیج بھیج دیا۔ حضرت مولانا نے امپریس آف انڈیا کی ہر تقریب میں اپنا ہدیہ نظم بذریعہ حکام پیش کیا
اور نہایت مقبول ہوا۔ چنانچہ اخیر جوبلی میں آپ نے ایک نہایت قیمتی اور نئی ترکیب کا ہدیہ
بھیجا نہایت عمدہ سرخ مخمل پر جو غالباً دو گز سے زیادہ لمبا ٹکڑا تھا اٹھارہ شعر کا ایک قطعہ
زرکار اور جواہرات کے حرفوں میں بطور کارچوب کڑھوایا جس نے اسکو دیکھا ہے وہ جانتا
ہے کہ ہر اعتبار سے وہ ہدیہ کیا تھا۔ ان نستعلیق چوب حرفوں میں ۳۲ - تولہ سلمہ ستارہ اور بائیس
سو سچے موتی اور بارہ سو سچے قیمتی نگینے تھے۔ جس وقت خوشی کے ساتھ جناب مسٹر بورڈمن
صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی کمشنر پٹنہ نے اُس کو اپنی پارٹی کے جلسہ میں خود اونچی
کرسی پر کھڑے ہوکر کھولا اور جناب مسٹر انگلس صاحب کلکٹر اور دیگر یوروپین حکام نے لمب

کی روشنی اُس پر ڈالی تو قریب چار پانچ سو یورپین اور ہندوستانی رئوسا وہاں موجود تھے۔ سب کے سب دنگ ہو کر رہ گئے اور ہر شخص معترف اور تحسین و آفرین کرتا رہا یہانتک کہ بعض معزز انگریزوں نے کھلے طور سے یہ کہہ دیا کہ ہم لوگ جانتے تھے کہ اب مسلمانوں کے دماغ سے قوت ایجاد بالکل سلب ہو گئی مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہ زرکار تہنیت نامہ بذریعہ حضور وائسرائے بہادر کے بندگان شاہی میں پیش کش کیا گیا اور خاص حضور قیصرۂ ہند نے اس کی بیحد تعریف کی اور اپنی طرف سے اُس کا بہت کچھ شکریہ اور تعریف کی غالبًا مقبولی ہدایا کے بعد ایسی چٹھی ہندوستان میں کم کسی کے پاس آئی ہو گی۔ اس کے بعد جناب صاحب کمشنر بہادر اور دیگر کمال دوست یوروپین حکام نے مولانا سے کہا کہ اسی قسم کا کوئی ہدیہ حضور پُرنور بندگان شاہ حیدرآباد دکن خلد اللہ ملکہ کی خدمت میں پیشکش گذراننے کے لئے مرتب کرو۔ بلکہ جناب کمشنر صاحب بہادر نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تم ایسا کرو تو ہم بذریعہ مسٹر پلوڈن صاحب رزیڈنٹ کے کوشش بلیغ کر کے حضور شاہ میں مقبول کروا دینگے مگر بعض وجوہ سے اس میں تعویق ہو گئی۔ یہانتک کہ دائرہ دولت شاہی کی رونق افروزی کلکتہ کی خبر مشتہر ہوئی۔ آخر حسب ایمائے صاحب کمشنر بہادر بعینہ ویسا تہنیت نامہ جشن سالگرہ مع دیگر ہدایائے علمی مرتب کیا نہ فقط حضور بادشاہ دکن کے لئے بلکہ جناب رزیڈنٹ بہادر کے لئے بھی اور ایک زرکار تہنیت نامہ حضور وائسرائے بہادر اور ایک حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال کے لئے۔ اس میں کئی ہزار روپیہ صرف ہو گئے۔ صاحب کمشنر بہادر نے ازراہ قدردانی کئی چٹھیاں لکھیں۔ ایک فارن افس کے سکرٹری صاحب کے لئے اور ایک حضور وائسرائے کے پرائیوٹ سکرٹری جناب الٹر لارنس صاحب بہادر کے نام اور ایک حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کے پرائیوٹ سکرٹری کے نام اور سب میں یہ کلمہ تحریر کیا کہ علی محمد شاد ہر اعتبار سے اور خصوصًا اپنے کمالات نظم میں آج منفرد ہے۔ غرض ان چٹھیوں اور ہدایا کو لیکر مولانا کلکتہ روانہ ہوئے حضور مسٹر بولٹن صاحب چیف سکرٹری بنگال نے نہایت

افسوس کر کے فرمایا کہ حضور نظام بہادر کل ہی کلکتہ سے روانہ حیدرآباد ہونگے اور ساتھ ان کے ہدایت کی کہ فارن آفس کے سکرٹری کے پاس جلد جائیے اور ہمدردی سے ایک چٹھی خود بھی لکھی چونکہ وقت آخر ہو گیا تھا۔ اس لئے چار بجے صبح کو ان کی خدمت میں پہنچے معلوم ہوا کہ صاحب آٹھ بجے آرام سے اٹھینگے۔ ہمارے خان بہادر ایک تو کثرت محنت کے سبب سے تپ میں مبتلا۔ دوسرے سردی اور گھوڑے کی کثرت تیسرے کرایہ کی گاڑیوں کے لئے حکم سخت۔ غرض انہیں تکلیفوں کے ساتھ نو بجے تک موجود رہے۔ اتنے میں مسٹر ہیوٹن صاحب کی گاڑی پہنچی ہر چند دو اعلیٰ درجہ کے حکام یورپین کی خاص چٹھیاں تھیں اور چپراسی نے انکو مع کارڈ کے پیش نظر میز پر رکھ بھی دیا تھا مگر جب تک مسٹر ہیوٹن صاحب تشریف رکھے رہے یعنی بارہ بجے دوپہر تک تب تک وہ چٹھیاں وکھی نہ گئیں بعد ملاحظہ کے صاف جواب ملا کہ آج حضور نظام جاتے ہیں۔ ہم ملاقات نہیں کروا سکتے۔ خلاصہ یہ کہ وہ دونوں تہنیت نامے تو حضور وائسرائے بہادر اور حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کی خدمتوں میں پیش ہو کر مقبول ہوئے مگر یہ زرین تہنیت نامے اسی طرح آج تک پڑے ہیں صاحب کمشنر بہادر اور دیگر حکام نے کمال دوستی کے خیال سے اس ناکامیابی پر حد سے زیادہ افسوس کیا اور پھر مستعد کرتے رہے کہ آپ ضرور حیدرآباد جاتے اور ہم لوگ اپنے اپنے احباب کو خطوط لکھ دیں مگر مولانا کے دل و دماغ اور قوائے جسمیہ پر ایسا سخت اثر پڑا تھا کہ کئی مہینے تک بیمار رہے اور اب تک قصہ حیدرآباد نہیں کہیں

سنہ ۷۶ء میں بعض رؤسائے نے ایک اردو اخبار جاری کیا اور چونکہ اس میں چندہ بقدر کفاف نہ تھا اس لئے چار پانچ برس تک کوئی مستقل اڈیٹر اس کا نہ تھا ہمارے مولانا اس کے چار برس برابر آنریری اڈیٹر رہے حالانکہ اس شہر میں وہ زمانہ نہایت پرشور و شر تھا لیکن صرف آپ کے قلم کے زور اور اعتدال نے آپس میں ربط و اختلاط معقول پیدا کر دیا۔ اسی زمانہ میں شہر کے اندر اردو و فارسی و عربی و انگریزی کی تعلیم کا ایک مدرسہ آپ کی

کوشش سے جاری ہوا جس کے آپ آنریری سکرٹری رہے۔ جب باوجود ان سب پبلک خدمات کے آپ کے کمالات پر اگر غور کیا جاتا ہے تو حد سے زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا کم خوراک متوسط اندام عدیم الفرصت شخص کیونکر متحمل تکمیل ایسے کمالات علمیہ کا ہوا۔ اس وقت تک تنہا آپ کے سب تصانیف کے ۳۳ چھوٹی بڑی کتابیں چھپ چکی ہیں جن کی نسبت اکثر علما اور صاحبان یورپین نے اپنی بیش بہا رائیں بذریعہ اخبارات ورسالہ جات کے شائع کیں اور ہندوستان کے علم وکمال وانصاف دوست بزرگوں نے بھی کچھ کم مولانا کی داد نہیں دی ہے یہاں تک کہ مولانا نے اُن تمام یادگاروں اور اس قسم کے خطوط وغیرہ کو فریم کے اندر بند کر کے اپنا پورا ایک کمرہ انہیں بیش بہا تحریروں سے سجا دیا ہے۔ ان میں حضور پرنور قیصرہ ہند مرحومہ اور حضور وائسرائے و لفٹنٹ گورنر بنگال و ممالک غرب وشرق و پروفیسران و ڈاکٹران و دیگر اہل کمال یورپین و علمائے باکمال و شعرائے مشاہیر ہند مثل جناب شمس العلما مولانا مفتی سید محمد عباس مغفور وجناب مولانا تاج العلما سید علی محمد صاحب مجتہد و جناب مولانا حاج سید مہدی شاہ مرحوم وجناب مولانا شمس العلما مولوی محمد سعید مرحوم و دیگر ارباب علم و زبدۃ الشعرا مرزا اسد اللہ خان غالب مرحوم و فخر المتاخرین جناب میر انیس و میر مونس و مرزا دبیر و میر خورشید علی نفیس و آغا حسن مرحوم لطافت و منشی مظفر علی خاں اسیر و منشی امیر احمد مرحوم مینائی امیر وغیرہ باکمالوں کے خطوط اور قطعات تاریخ اور اشعار پر رائیں اور ان شعرائے باکمال کی نسبت محاورات استفتا اس کثرت سے ہیں کہ چار طرف کی دیواریں انہیں سے مزین ہیں اگر باستیعاب کوئی دیکھنا شروع کرے تو ایک پورا دن اسی میں صرف ہو جائیگا اور مدتوں اس کی لذت دل و دماغ کو پہنچیگی۔ ایک پوری بڑی الماری صرف آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودوں سے بھری ہوئی ہے جو اسٹیل پن سے ذرا اوسط باریک حرفوں میں لکھے گئے ہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا دفتر مختلف تصنیفات کا ایک شخص نے کیونکر لکھ ڈالا

اس الماری کے چار بڑے بڑے درجے ہیں۔ دو درجوں میں صرف نثر کتابوں کے مسودے اور دو درجوں میں مختلف نظم کے مسودے ہیں۔

ایک ضخیم کتاب فن ادب کے متعلق ایسی مفید اور دلچسپ ہے کہ بیان نہیں۔ یہ کتاب ۱۹ بابوں پر منقسم ہے اور اردو ادب کے لئے جہانتک جن جن چیزوں کی ضرورت ہے سب کو حتے علمی محاورات کو بھی نہایت سلاست سے ادا کیا ہے مثلاً جہاں فن عروض کو بیان کیا ہے۔ وہاں تحریر کرتے ہیں کہ فن عروض کو بنیوں کی دوکان سے مشابہت ہے جہاں مختلف اجناس اور مختلف چند باٹ ہیں انہیں باٹوں سے مختلف چیزیں اور مختلف اجناس تول دیا کرتا ہے۔ اسی طرح عروضیوں کے پاس دس باٹ ہیں جن کا نام اصول افاعیل رکھ دیا ہے۔ پھر اس خوبصورتی سے اس کا تطابق کیا ہے کہ دیکھنے کے قابل ہے اس نایاب کتاب میں کل صنائع و بدائع متعلق ادب کے اصطلاحیں اور مثالیں اردو ہی میں دی ہیں اور اردو شاعری کا موازنہ دیگر زبانوں سے کر کے یہ دکھایا ہے کہ فی نفسہ اردو شاعری کا مذاق کیا ہے اور مقتضائے زبان اردو کون کون سی ترکیبیں ہیں اس کتاب کے علاوہ ایک کتاب اور بھی بطور کشکول کے لکھی گئی ہے۔ اس میں کثرت سے علمی لطائف و دیگر دلچسپ مضامین اعلے درجہ کے کتب اور مختلف فنون سے لئے گئے ہیں۔ کتب بینی کے وقت جو جو مضامین مختلف عربی کی کتابوں میں دیکھے ہیں نقل کر لیے ہیں۔ اب یہ کتاب بھی بیس پچیس جزوں سے کم نہیں ہے۔

نظم کی مختصر حالت یہ ہے کہ اسی پچاسی جزوں کا ایک کلیات ہے جس میں چالیس جزو کا دیوان غزلیات اور آٹھ نو جزوں میں صرف رباعیاں۔ باقی ہیں قطعات وغیرہ مختلف مضامین کے اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ دس مثنویاں ہیں ان تمام منظومات خصوصیں غزلوں اور قطعوں اور رباعیوں کو دیکھ کر خدا کی قدرت

آتی ہے کہ ایسے فلسفی اور طبیعات و الٰہیات کے مضامین ایسی سلیس اور بامحاورہ زبان میں کیونکر نظم ہو گئے۔ بیشتر اتفاق ہوا ہے کہ صحبت میں سیکڑوں مختلف خیال کے اہل علم اور عام لوگ جمع ہیں اور آپ نے غزل خوانی شروع کر دی۔ چند عرصہ میں صحبت کی صحبت محو ہو گئی اور جس کو دیکھئے رونے لگا۔ قادر الکلامی کا یہ حال ہے کہ طولانی متفرق مضامین کے اشعار اور اور بہتیرے کاموں کے ہجوم میں حسب فرمائش ایسے ایسے کہہ دیے کہ لوگ دنگ ہو گئے۔ مولانا کی شاعری کا ایک تکلف خاص یہ ہے کہ نئے خیالات کو پرانے طرز و انداز میں اس خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں کہ نئی طرز کے پسند کرنے والوں سے لیکر پرانے انداز پسند کرنے والوں تک پر پورا پورا اثر ہوتا ہے۔ غزلوں وغیرہ میں تیس برس کامل انتہا درجہ کی مشاقی پیدا کر لینے کے بعد آپ نے مرثیے اور مولود کی طرف توجہ تام کی اور ان دونوں چیزوں کو ایسا بے مثل کہا کہ طرز خاص کے موجد ہو گئے مرثیے اور نصوصاً میر انیس مرحوم کے مرثیے حد کمال پر پہنچے ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے باعتبار نفس مضامین کے کچھ عجب نہیں کہ ایک محقق یا ایک مؤرخ یا فلسفی ضرور اتنا کہہ دیگا کہ بحیثیت شاعری کے تو درجہ بلند پر پہنچے ہوئے ہیں۔ مگر واقعی حالات میں کمی ضرور ہے مگر ہمارے مولانا کے مولود و مراثی سنکر جیسا کہ ایک نہایت خوش مذاق زبان دان شاعر حیرت زدہ ہو جائے گا۔ اُسی طرح سے ایک فلسفی یا حکیم وقت خواہ مؤرخ یا متکلم۔ یہی سبب تھا کہ مولانا نے سنہ ۹ء میں جب مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں مولود پڑھا ہے اور کثرت سے وہاں اہل علم موجود تھے کیونکہ اسی تقریب سے نوٹس چھپ کر تقسیم ہوا تھا تو خاص کر کے مسٹر ماریسن صاحب نے یہ لفظ اس کی تعریف میں فرمایا تھا کہ نہ ایسی عمدہ نظم سنی اور نہ نظم میں ایسے اعلیٰ درجہ کے مضامین۔ اس کا لطف جس کا دل چاہے جناب مولانا حالی اور جناب مولانا شبلی مدظلہم سے پوچھ لے۔ خوبی یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ کبھی اس کام کو بطور ذاکری نہیں کیا۔ مگر پہلے ہی دن جس کو دس برس کا زمانہ ہوتا ہے

جو مرثیہ لیکر منبر پر گئے تو ڈھائی سو بند کا مرثیہ نہایت باقاعدہ شد و مد سے پڑھ کر اُتر آئے

کئی سال ہوئے کہ دو تین دنوں کے لئے آپ لکھنؤ تشریف لے گئے تھے -

اتفاقاً جناب میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم سے مُلاقات ہُوئی - میر صاحب یہ تو خوب جانتے تھے کہ آپ قادر الکلام اور اُستاد شاعر ہیں مگر یہ واقف نہ تھے کہ تھوڑے دنوں سے مرثیے بھی تصنیف فرماتے ہیں - اثنائے کلام میں حضرت نے میر صاحب سے کہا کہ آپ نے تو مرثیہ گوئی میں مثل اپنے پدر بزرگوار کے وہ کمال حاصل کیا کہ اس سے زیادہ ترقی ناممکن ہے - مگر اب چونکہ علم پھیلتا جاتا ہے اور لوگوں کی نظریں نہایت وسیع ہوتی جاتی ہیں - لوگ اصلیت کے زیادہ تر جویاں ہیں ایسے موقع میں اگر آیندہ کے لئے سوچ سمجھ کر طرز مرثیہ گوئی میں کوئی خاص اصلاح دی جائے تو نہایت ہی مناسب ہے - میر صاحب نے ارشاد کیا کہ اگر محض اصلیت اختیار کی جائے تو بجز سادہ سادہ تاریخی حال کے اور کیا ہوگا نہ کوئی متاثر ہوگا اور نہ مجلس کا نتیجہ حاصل ہوگا حضرت نے جواب دیا کہ میں آپ کی نسبت ایسا نہیں عرض کرتا - آپ نے جس طرز میں کمال پیدا کیا ہے - وہی مناسب ہے - مگر ہاں آیندہ اپنے عزیزوں شاگردوں کو اس بات کی توجّہ دلوائی جائے کہ اصلیت قائم رکھی جائے - غرضکہ بعد چند گفتگوؤں کے حضرت نے مثالاً اپنے مرثیہ کا ایک بند پڑھ کر کہا کہ دیکھئے اس میں اصلیت کے ساتھ ویسا ہی اثر ہے یا نہیں میر صاحب نے بند کو سُنکر نہایت تعجب کیا آخر حضرت سے اُن کے اصرار سے مرثیہ منگوا کر پڑھنا شروع کیا غالباً جیسی تعریف میر نفیس مرحوم نے کی اب تک اُس حد کی تعریف ایک سے بھی نہیں سنی انہوں نے اور اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ صاحبو آپ کو دیکھ لو کلام سُن لو ایک وقت مباہات کرتا ہوگا کہ ایسے ہمہ دان اور کامل کو ہم نے دیکھا اور کلام سُنا اس وقت تک حضرت کے پچاس مرثیوں سے زیادہ ہیں اور ڈھائی سو بند سے لیکر تین سو بند تک کے ہیں - علیٰ ہذا پانچ مولود حضرت

زیادہ مقبول ہیں وُہ بھی بطور مسدس اور چار چار سو بند تک کے ہیں - گوکہ ابھی تک ملک کی ناقدردانی سے حضرت کا کل کلام نہیں چھپا اور نہ اُمید ہوتی ہے کہ اس طرز نوید میں ان اصلی ذی کمالوں کی طرف جیسا چاہیئے مُلک متوجہ ہو لیکن کسی کی محنت کو خدا رایگاں نہیں کرتا انشاءاللہ جب آپ کے کُل کلام اور ساتھ اس کے سوانح عمری چھپے گی تب زمانہ نہایت ہی افسوس کریگا کہ ہم نے اپنی غفلت کاری سے کس جوہر قابل کو کھو دیا - مولانا کے مراثی کا تکلف یہ ہے کہ جمہور اہل اسلام سُنی ہوں یا شیعہ سب قائل ہیں اور مذہبی صواب سمجھ کر (علاوہ لطف شاعری کے) شریک مجلس ہوتے اور خود مجلسیں کرکے باصرار تمام حضرت سے پڑھواتے ہیں میں نے علمائے شیعہ و سُنی دونوں کو بالاتفاق حضرت سے یہی کہتے سُنا کہ آپ پر واجب ہو گیا ہے کہ اِن مرثیوں کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلائے اور دکھائے کہ مذہب اسلام میں کیا کیا خوبیاں اور محاسن ہیں کیونکہ یہ اثر انگیز طریقہ بالکل نیا اور حقیقت میں دین اسلام کا بجد معین ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ حضرت کے متفرق اشعار بھی اس تحریر میں مذکور کروں ہرچند چاہا کہ اختصار کے ساتھ یہ خیالات درج ہوں تاکہ گنجائش باقی رہے لیکن باہمہ اختصار پھر بھی طول ہو گیا میں ناظرین مخزن سے وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ حضرت کے سب قسم کے کلاموں میں سے تھوڑا تھوڑا ضرور نذر کرتا رہوں گا ٭

سیّد عنایت حسین - آمدو عظیم آباد

خزاں - دلخراش خزاں کیسی حاسد ہے - جو موسم خزاں کی نئی کوپل کو بھی ڈنگ مارنے سے باز نہیں آتی" ٭

(شیکسپیر)

مُسدّس اور سرسیّد

مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی کی مشہور کتاب مسدّس مدّ و جزرِ اسلام کو جو خداداد قبولیت اردو دان دنیا میں حاصل ہوئی ہے۔ وہ سارے زمانہ پر روشن ہے۔ ہزاروں بامذاق بندگانِ خدا نے اُسے بار بار پڑھا ہے اور حاضر اور غائب داد دی ہے۔ مگر جو داد دینے کا حق سرسید مرحوم نے ادا کیا ہے انہی کا حصہ تھا۔ ہمیں حسنِ اتفاق سے سرسید مرحوم کا ایک خط جو انہوں نے مولانا حالی کو اُس زمانہ میں لکھا تھا۔ جب مسدّس طبع ہوئی۔ ہمیں ہاتھ لگ گیا ہے۔ اُسے ہم نہ صرف اس لئے چھاپتے ہیں۔ کہ وہ سرسید مرحوم کا خط ہے۔ بلکہ اس میں خاص دلچسپی کی یہ بات ہے۔ کہ جوش میں جو جو خواہشیں اس کتاب کے متعلق سرسید نے خط میں ظاہر کی تھیں۔ خدا کی قدرت سے سب کی سب نہایت نمایاں طور پر پوری ہو گئی ہیں۔ خاصی پیشین گوئیاں معلوم ہوتی ہیں وہ لکھتے ہیں :-

عنایت نامہ مع جلد مسدّس کے پہنچا۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدّس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون۔ جو مبالغہ۔ جھوٹ اور تشبیہات دُور از کار سے کہ جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہیں۔ بالکل مبرّا ہے۔ کیونکر ایسی خوبی اور خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے؟ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشمِ نم پڑھے نہیں جا سکتے سچ ہے "جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے"۔ بیشک (جیسا کہ آپ نے دیباچہ میں لکھا ہے) میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے

سمجھتا ہوں کہ جب خدا پُوچھیگا کہ تو کیا لایا؟ مَیں کہونگا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں"۔

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرستہ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے مَیں دل سے شکر کرتا ہُوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو۔ جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا اُنکے ماتم کا مرثیہ ہے۔ کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وُہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاویں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے اور سارنگی پر گاویں۔ قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس سچّے حال پر وجد کریں اسیقدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی +

(اڈیٹر)

فلسفۂ محبت۔ چشمے دریاؤں سے اور دریا سمندر سے ہم آغوش ہیں۔ نسیم اور بادِ صبا عجب دلفریبی سے ہمیشہ ایک دُوسرے سے ہمکنار ہیں۔ قوانینِ قدرت کے رُو سے کوئی چیز اکیلی نہیں رہتی بلکہ ایک دوسرے کے اصل سے شادماں ہے۔

پھر میں کیوں دردِ فرقت میں مبتلا رہوں۔ دیکھو پہاڑ فلک سے مصروفِ بوس و کنار ہیں۔ موجیں ایک دُوسرے سے تڑپ تڑپ کر مل رہی ہیں۔ دُنیا میں گل ہرگز قابل عفو نہیں۔ اگر وُہ اپنے محسن کو نظرِ حقارت سے دیکھے۔ شعاعِ آفتاب زمین سے بغلگیر ہے اور چاندنی لہروں کی بوسہ بازی سے محظوظ ہو رہی ہے۔ یہ تمام دلفریب اختلاط کس کام کے۔ اگر تو مجھ سے اجتناب کرے +

(شیلے)
مشہور انگریزی شاعر

(منشی فضل الٰہی از کیمبرج)

اہلیہ بائی

اہلیہ بائی کے نام سے ہندوستان کے بہت سے آدمی واقف ہیں۔ کھنڈے راؤ اہلیہ بائی کا خاوند تھا۔ وہ کونبھیر کی لڑائی میں مارا گیا۔ اس کا لڑکا [illegible] راج پر بیٹھا لیکن نو مہینے کے بعد وہ بھی راہی ملک بقا ہوا۔ راج پروہت گنگا دھر جسونت نے اہلیہ بائی سے کہا کہ آپ کسی شریف خاندان کے لڑکے کو متبنّٰی کرلیں۔ پروہت موصوف نے بہت اصرار کیا۔ آس پاس کے راجاؤں کو فساد کے لیئے آمادہ کیا۔ بہت سے امیر اور رئیسوں کو بائی صاحبہ کے پاس بھیجا اور اُن سے یہی کہلایا کہ آپ کسی کو متبنّٰی کرلیں۔ رئیسوں کی ایک جماعت اس غرض سے اہلیہ بائی کے پاس آئی۔ اسوقت بائی صاحبہ نے جو برجستہ تقریر کی۔ وہ مدلّل اور فلسفیانہ ہے۔ اس گمنام نگری کے راجہ مہاراجہ۔ تم یہ جانتے ہو کہ مَیں ایک زبردست راجہ کی عورت تھی۔ اور دوسرے راجہ کی ماں۔ پرمیشر نے انہیں اُٹھا لیا۔ اس کا منشا ہے کہ مَیں اس راج کو سنبھالوں۔ خدا نے انسان میں عجیب و غریب قابلیّتیں پیدا کی ہیں۔ گو مَیں عورت ذات ہُوں لیکن میرا دل مردانہ ہے۔ دُنیا کے واقعات نے میری معلومات کو بہت بڑھا دیا ہے۔ مَیں اِسے توہین خیال کرتی ہُوں کہ ایک دوسرے خاندان کا لڑکا متبنّٰی کروں۔

جب اس پُر معنے اور مختصر تقریر کا چرچا ہُوا تو اہلیہ بائی کو بھی خیال پیدا ہو گیا اور اب جنگی تیاریاں شروع کردیں۔ اہلیہ کی اس مستعدی کا بڑا اثر پڑا اور سب فتنے فساد دبنے کے دبے رہ گئے۔ پروہت کا قصور معاف کردیا اور اسے اپنا دیوان مقرر کیا۔ تکوجی ہلکر کو سپہ سالار بنایا۔ تیس برس تک بڑی قابلیّت سے حکومت کی۔ رفاہ عام کے کاموں سے بے انتہا دلچسپی تھی۔ سیکڑوں گھاٹ اور کنوئیں بنوائے۔

اور جا بجا مسافروں کے آرام کے لئے باغ لگوائے۔ اہلیہ بائی کو کتابوں کے مطالعہ کا
بہت شوق تھا۔ حسن رسیدہ آدمیوں کو بلاتی اور اُن سے پچھلے کارنامے سُنا کرتی
تھی۔ اہلیہ بائی کی لیاقت اور سمجھ [illegible] تھی۔ دو بجے دن سے شام تک
دربار کرتی اور پھر رات کو نو بجے سے بارہ بجے تک عبادت میں مشغول رہتی
تھی۔ اکثر [illegible] ہم سب کو ایک دن اپنے کاموں کا حساب دینا ہے
اور ہم سب اپنے کرم کے ذمہ دار ہیں۔ اہلیہ بائی بہت رحمدل تھی۔ چڑیوں کا اتنا خیال
تھا کہ اُن کے لیے کھیت خرید لئے جاتے تھے۔ مچھلیوں کو آٹے کی گولیاں کھلانے
کے لئے بہت سے آدمی نوکر رکھے گئے تھے۔ انسانی مصیبتوں کا ہر وقت خیال
رہتا تھا۔ بھیلوں نے تمام راستے روک رکھے تھے۔ اپنی فوج کے جانباز سپاہیوں کو بھیج کر
سب کو گرفتار کرایا۔ اور اُن سے کہا کہ تم لوگ کیوں یہ پیشہ کرتے ہو۔ صرف پیٹ بھرنے
کی خاطر تم یہ ساری باتیں کرتے ہو۔ آج سے ہمارے یہاں کام کرو اور اچھی طرح زندگی
بسر کرو۔ ظاہری حُسن تو نہیں تھا۔ لیکن حسن باطن اس درجہ دلفریب پایا تھا کہ سارا
اندور غلام تھا۔ ایک پنڈت صاحب نے اہلیہ بائی کی تعریف میں کوئی کتاب تصنیف
کی۔ بائی صاحبہ نے اسے پھینکوا دیا اور کہا اس فانی شہرت کو دفن کردو۔ انگریزی
مؤرخوں نے اور خاصکر ان مصنفوں نے جنہوں نے کتاب انسانی کی کئی جلدیں
اُلٹ ڈالی ہیں۔ اور زمانہ سلف کے قدیم کارناموں کو زندہ کیا ہے۔ وُہ اہلیہ کی
اور خاص باتوں میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے خوشامد سے قطعی نفرت تھی۔ ملکہ ایلزبتھ
سے اس بات میں وُہ بڑھ گئی تھی۔ اندور کو ایک گاؤں کی حیثیت سے شہر بنا دیا۔
۱۷۹۵ء میں اہلیہ کا انتقال ہوا۔ یہ سب اس کی رُوحانی ترقی۔ پاکبازی اور آئندہ
زندگی کے خیالات کا نتیجہ ہے کہ ابھی تک وُہ زندہ ہے۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ گذر
گئے لیکن جیسا اہلیہ کا نام ہر دلعزیز ہے ایسا کسی کا نہیں۔ سہ

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

جہانتک دیکھا گیا۔ ایشیائی عورتیں مغربی عورتوں سے جسمانی اور رُوحانی دونوں قوتوں میں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ اب بھی مشرقی آب وہوا میں خیالات کے گوناگون ولولے شاعرانہ اور فلسفیانہ جذبے۔ بلند پروازی۔ مبالغہ یا ممکنات کے درجہ سے آگے بڑھنے کے ارادے طلسمی اور خیالی سمندروں میں جہازرانی کرنے کے حوصلے۔ بہت جلدی نشوونما پانے کے موقعے۔ اور رُوحانی ترقی کے منصوبے جس قدر جلد پیدا ہوجاتے ہیں وُہ کہیں اور نہیں ہوتے۔ تحقیق اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایشیائی عورتیں مغربی عورتوں سے جسمانی قوت میں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان میں فطرت نے کمالات باطنی کے بھی عجیب غریب جوہر پیدا کئے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہم تعلیم نسواں کا مطلق نہیں خیال کرتے۔ فروعی اور بیکار باتوں میں مثلاً یہ کہ ان کو باہر نکالا جائے یا نہ۔ ہم غلطاں پیچاں ہیں۔ کوئی یہ تو پوچھے کہ آزادی اور اس آزادی کو وُہ کب سمجھیں گی جب تک وُہ تعلیم یافتہ نہیں ہونگی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ علیحدہ بڑی بڑی عمارتوں میں انکو تعلیم دیجاتے۔ اور قبل اس کے کہ انکو پردہ سے نکالیں۔ نہایت ضروری ہے کہ ہم عورتوں کو اس بات کا موقع دیں کہ وُہ سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہوجائیں۔ ہم کو اگر خیال ہو تو خود ہی انکو گھر میں لکھا پڑھا سکتے ہیں۔ لیکن یہ کہاں۔ محض بیکار اور فضول باتوں میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ ملک اور قوم کے لئے اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ تعلیم اور اعلےٰ تعلیم کی اشاعت ہو۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک تھوڑی سی جماعت ہے۔ جو تعلیم یافتہ ہے۔ وہی جماعت اگر صرف تعلیم کی طرف پوری توجہ کرے اور تمام بیکار باتوں کو چھوڑ دے تو یقین ہے کہ ہماری قدرتی قابلیتیں مکمل ہوجائیں اور ہم ایسی زندگی بسر کریں جو ایک شائستہ قوم کے شایان ہو۔

(شاد محمد نذیر ہاشمی غازی پوری)

٤١٥

خیرات

خواہی کہ خدائے بر تو بخشد
با خلقِ خدائے کن نکوئی
(سعدی)

حالانکہ آدمیوں کے گرد و پیش بہت سی ایسی اشیا ہیں۔ جو کہ انکی خیرات کی محتاج ہیں۔ مگر پھر بھی وُہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مال و دولت کے حاصل کرنے یا کسی بے فائدہ چیز کا افسوس کرنے میں گذار دیتے ہیں۔ یا جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے وُہ ظاہری طور پر تو دنیا کی برائیوں اور بدتہذیبیوں پر نہایت افسوس ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا دل یا تو غرور اور نمائش کے خواب دیکھ رہا ہے۔ یا کسی خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف رہتا ہے۔

اور باوجود ان باتوں کے ان کے پاس ہی مصیبت و تکلف کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ جس کو اُنکے کان تو سُنتے ہیں مگر اُن کے دلوں پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس کو ایک کان سنتے ہیں۔ اور دوسرے کان اڑا دیتے ہیں۔ انکو یہ خیال کرنا چاہیے۔ کہ ان کے آگے خیرات کے کتنے مصرف موجود ہیں۔ انکو دیکھنا چاہیے کہ کتنے غریب مزدور ہیں۔ جو کہ محض اپنا پسینہ بہانے سے روٹی کماتے ہیں۔ کتنے غریب قحط زدہ کسان ہیں جو کہ سارا دن اپنی ہڈیوں کو پیلتے ہیں۔ اور جب جاکے کہیں ان کو رات کو روکھی سوکھی روٹی کھانے کو ملتی ہے۔ ان کو خیال کرنا چاہیے کہ کتنے انکے ابنائے جنس ہیں۔ جو کہ غلامی کی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ انکو اپنے ہم قوموں کی کم علمی کا خیال کرنا چاہیئے۔

غرضکہ یہ اور اور ایسی بہت سی بُرائیاں ہیں کہ جنکی طرف اگر انسان توجہ کرے

تو لازمی امر ہے ۔ کہ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی اصلاح کر ہی دے ۔ اگر انسان صرف اسی بات پر غور کرے ۔ کہ ان میں سے کن باتوں کی کتنی اصلاح ہوئی ہے ۔ اور کتنی کی گنجایش باقی ہے ۔ تو یقین ہے ۔ کہ وہ اس سے بھی بہت کچھ فائدہ پہنچائے ۔ بہت سے ایسے بھی حضرات ہیں ۔ جو یہ کہینگے کہ یہ سب کچھ ٹھیک اور بجا ہے ۔ اور بہت کچھ نیکی کی گنجائش ہے ۔ مگر صاحب یہ تو بتایئے ۔ کہ ہم کریں تو کیا کریں اتنے کام کرنے کے ہیں ۔ کہ ہمارا دماغ چکر میں آگیا ۔ یہ ہی نہیں سمجھ میں آتا ۔ کہ کس کو شروع کریں تو مجھ سے اُسکا جواب سُنیئے ۔ کیوں صاحب کیا کوئی بھی ایسا کام نہیں ۔ کیا کوئی بھی ایسی خدمت نہیں ۔ جس میں آپ کو دلچسپی ہو ۔ اور کوئی بھی ایسا خیرات کا کام نہیں ۔ جو کسی خاص حالات کے باعث آپ سے کرنے کے لائق ہو؟

اگر کوئی ہے ۔ تو جلد اس کو شروع کیجئے ۔ اگر نہیں تو پھر بھی آپ کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھ رہنا چاہئے بلکہ آپ کوئی سا بھی خیر خواہی انسان کا کام لیں اس کو سوچیں ۔ اور غور کریں ۔ پھر دیکھیں کہ وہ آپ کے دل کو لگتا ہے یا نہیں ۔

دیکھو ہم کیسی سرسری نظر سے اس ملک کے نقشے کو دیکھتے ہیں ۔ جس کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا ۔

در آنحالیکہ ہمیں اس ملک کا نقشہ دیکھنے میں جس میں ہم سفر کر چکے ہیں ۔ نہایت دلچسپی ہوتی ہے ۔ اسی طرح اگر آپ کسی مضمون پر غور و خوض کریں گے تو یقین ہے کہ آپ کو اس سے ایک قسم کی دلچسپی اور انسیت ہو جائیگی ۔ کئی لوگ اپنے اوقات شطرنج اور چوسر میں گذار دیتے ہیں ۔ اور اپنی ساری توجہ کو اس طرف منعطف کر دیتے ہیں ۔ تو کیا انسانی ہمدردی کا مسئلہ بانسوں کے داؤں اور گھوڑے کی چال سے بھی کم دلچسپ ہے ۔

بعض ایسے بھی اشخاص ہیں ۔ جو اپنے ابنائے جنس کی ضرورتوں اور تکالیف

کو اگر نہایت ہی رنج کے ساتھ نہیں - تو پھر بھی تھوڑے افسوس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں - لیکن وہ اس قدر نہیں ہوتا - کہ انکو فوراً اپنی ذات سے ان تکالیف کو دور کرنے کی ترغیب دے انکو یہ یقین نہیں ہوتا - کہ انکی کوشش کچھ دُنیا کے بڑے مرض کو رو بصحت کرنے میں مدد دیگی - اگر کوئی بات اُنکے ذہن میں آتی ہے - تو وُہ یہ کہکر خاموش ہو رہتے ہیں - کہ آپ ہی رفتہ رفتہ یا جب دُنیا علم کی روشنی سے زیادہ منور ہو جائیگی - تو یہ سب باتیں بھی درست ہو جائینگی -

الغرض وُہ صرف ناظر بنے رہتے ہیں - یا زیادہ سے زیادہ اس بات کا انتظار کرتے رہتے ہیں - کہ کوئی ایسا موقعہ آئے کہ انکو بھی اپنی خیرات کے استعمال کا موقعہ ملے -

لیکن نیکی کے مواقعہ اگرچہ بہت سے اور واضح ہیں - مگر ایسے نہیں ہیں - جو ٹھیک طور پر ہمارے کرنے کے قابل ہوں - ہمیں ان کے استعمال کے لئے پہلے سے تیار رہنا چاہیئے - خیرات کے لئے طریقہ چاہیئے -

یہ کسی طرح ایسی بات نہیں ہے - جیسے کہ ایک آدمی جس کا شکم پُر ہو ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹ کر اپنا دل بہلانے کے لئے ان لوگوں کو دیکھے - جو دھوپ میں کام کر رہے ہوں -

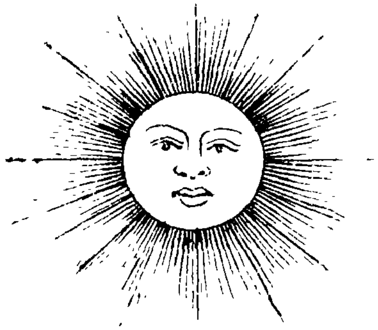
اب رہی یہ بات کہ ہمیں جب نیکی کا کام شروع کرنا چاہیئے - جب ہم میں اس کے کرنے کی طاقت موجود ہو - یقیناً آدمی کی خیرات اس کے دُنیاوی جاہ و مرتبت پر منحصر نہیں ہوتی - ہر ایک آدمی آج نیکی کی بُنیاد ڈال رکھ سکتا ہے - اگر اس کو کر نہیں سکتا - اور جو شخص اس بات کا انتظار کرتا ہے - کہ جب اس کے پاس مال و دولت ہوگا - تو کوئی نیکی کا کام کریگا - اس کو خاطر جمع رکھنی چاہیئے - کہ جب مواقعہ اسے پیش بھی آئینگے - تو بھی وُہ اُن سے پُورا فائدہ نہ اُٹھائیگا -

دُنیادار آدمی کہہ سکتا ہے۔ کہ کیا یہ نیکی کے کام آدمی کو اس کے فرایض منصبی سے جیسے کہ وہ کہتے ہیں، نہ روکینگے؟ ہمیں اس کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا۔ کہ وُہ کیوں روکینگے۔ یقیناً قدرت نے ہماری روزی کمانے کو ایسا مصروفیت کا کام نہیں بنایا کہ کسی نیکی کے کام یا خیرات کے لئے فرصت ہی نہ رہے۔ اگر ایسا ہو بھی۔ تو اگر انسان اس وقت کو جو وہ خیالی پلاؤ پکانے یا سوچنے میں کہ لوگوں کی اس کی بابت کیا رائے ہے صرف کرتا ہے۔ خالی کر دے۔ تو اس کے پاس کافی وقت نیکی کے کام کرنے کے لئے ہو جائیگا۔

جانوروں کے ساتھ مہربانی کرنا بھی ایک خیرات کے استعمال کا عُمدہ طریقہ ہے ہم یقین رکھتے ہیں کہ جانوروں کی رُوح بھی اُن کے جسم کے ساتھ ہی تلف ہو جاتی ہے اور یہ کہ وُہ پھر زندہ نہیں ہونگے تو ان کی زندگی کی اس مدتِ قلیل ہی کو ان کے ساتھ حلم سے کام لینے کی سفارش کرنی چاہئے۔ بیچارے غریب کیڑے جو پانی کی سطح پر ہیں۔ کون ایسا بے رحم ہوگا۔ جو اُن کے ناچ کو بے ضرورت بند کر دیگا؟ ایسے ہی خیالات ہمارے تمام جانداروں کی نسبت ہونے چاہئیں۔ ان جانوروں کے جو ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہم پر بہت سے فرایض ہیں۔ یہ ایسا واضح امر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس پر زور دینا کچھ غیر ضروری سا ہے۔ لیکن بعض اشخاص ایسے ہیں۔ جو جانوروں کے ساتھ اس قسم کی بے رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ گویا کہ اُنھوں نے اُن کی قیمت ادا کرنے سے خدا کی مخلوق کو اذیت دینے کا بھی حق خرید لیا ہے۔ ہمیں کسی صورت جانوروں کے ساتھ بے رحمی کرنے کی اجازت دینی نہیں چاہئے۔

اور اگر کوئی یہ خیال کرے۔ کہ وُہ ایسی حقیر چیز ہیں کہ انکے ساتھ انسانی برتاؤ کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو یہ سخت اخلاقی اندھاپن ہے۔ چند لحظے جو ہم ہر روز کوئی نیکی کا کام کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ وُہی لحظ ایسے ہیں۔ جو خدا کی نظر میں مقبول ہیں۔

آفتابِ عالمتاب



نکلتا ہے ہر روز جو آفتاب — ہے سب سے زیادہ جو باآب و تاب
بتائیں اِسے سب ستارہ پرست — کہ ہے یہ خداوندِ بالا و پست
پرستش کریں اس کی سارے ہنود — نہا کر کریں اِس کے آگے سجود
بتاتی ہے ہیئت کی ہر اک کتاب — کہ ذرّوں سے پیدا ہوا آفتاب
بھرے جوّ میں تھے جو اجزائے نور — ہوئی اُن سے ترکیب اس کی ضرور
کوئی یوں سخن سنجِ اسرار ہے — کہ سورج نہیں کُرۂ نار ہے
کہے وہ کہ ہم دیکھتے ہیں زمیں — زمیں پر نظر آتے ماءِ معیں
ہوا کا بھی محسوس پائیں اثر — جسے دیکھتے سب ہیں اہلِ نظر
مگر کُرۂ نار ہے کیوں چھپا — اُسے کیوں نہ دیکھیں محیطِ ہوا
یہ کہکر وہ کہتا ہے دانشمآب — کہ ہے وہ کُرہ بس یہی آفتاب
کریں اس کو رد اور اربابِ قال — مباحث سے جنکے پریشاں خیال
کہے کوئی خورشید روشن نہیں — نہیں ہے منوّر یہ مہرِ مبیں
نہیں ذات میں نور اِس کے جناب — یہ ہے دوسرے نور سے فیضیاب

بتاتی ہے ہم کو یہ تحقیق حال — جو ہے اہلِ یورپ کا اوجِ بیاں
کہ خورشید رکھتا ہے جرم سیاہ — نکلتی ہے آگ اُس سے وہ ہے تباہ
رخ مہر کا یوں نظر آئے حال — کہ لہرائیں جس طرح عارض پہ بال
اُبلتا ہو جوں کوہ آتش فشاں — نکلتا ہو آتش سے جیسے دھواں
پہاڑ اور دریا ہیں خورشید میں — کئی غار پیدا ہیں خورشید میں
جنہیں دیکھتی دوربیں میں نظر — مگر ٹھیک سمجھے نہ اُن کو بشر
ہیں سورج کے اندر وُہ جلتے پہاڑ — فروزاں ہوں جس طرح سے گرم بھاڑ
ستارے ہزاروں ہیں دنبالہ دار — پھریں گرد جو اس کے پروانہ وار
بتاتا ہے اک اور دانش مآب — کہ ہرگز نہیں گرم یہ آفتاب
یہ گرمی جو محسوس ہو اس قدر — نہیں اس میں سورج کا کچھ بھی اثر
وُہ لاتا ہے اس بات پر یہ دلیل — کہ اُوپر ہے سردی بلا قال و قیل
سوا اس کے اُوپر ہو جتنا صعود — ہوتا ہے کی سورج سے رنگت نمود

بتاتا ہے گرمی کا وہ یہ سبب
کہ ہووے رگڑ سے یہ پیدا غضب

خواب عجیب

یہ نظم علاوہ اپنی اور خوبیوں کے یہ خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ کہ اس کو دو طباع شعرا نے مکمل کیا ہے۔ اور خوبی یہ کہ گرہ معلوم نہیں ہوتی۔ اگر نشان نہ دیا جائے کہ کون سا حصہ کس کا ہے تو یہ کہنا مشکل ہو کہ یہ دو دماغوں کی محنت کا نتیجہ ہے:—

خیال لے گیا اک شب کسی گلستاں میں — گماں تھا کہ اس [illegible] نہیں ہوگا [illegible]

جھلک سی نور کی ہلکی سی تھی پر پیدا — نسیم ناز میں پھرتی تھی کھیلتی در در
پرند چہچہے کرتے تھے آشیانوں میں — کسی کی دیتے تھے تشریف آوری کی خبر
وہ نرم نرم ہوا تھی کہ بوستاں کے حسیں — پئے ہوا خوری نکلے تھے خوب بن ٹھن کر!
وہ مسکراہٹیں غنچوں کی ماری فرحت کے — جو سبزہ خوردہ دلوں پر کریں خوشی کا اثر!
وہ جوئے آب کہ پیہم صبا کے بوسوں سے — گھٹی سی جاتی تھی دلہن کی طرح شرما کر!
سماں وہ چھایا تھا عالم میں صبح ہونے سے — ہر ایک سمت میں پھرتی تھی ماری ماری نظر۔
یہ لطف تھا ہی کہ پورب کی سمت سے ناگہ — سنہری جھول سا ہونے لگا مکانوں پر۔
کچھ ایسی بات تھی اس میں کہ اسکے ہوتے ہی — وہ تم جو شب کی تھی سب ہوگئی رفو چکر۔
پکارا ہاتف غیبی وہ جان جاں آیا — بجانے گانے لگی فطرت صفا پرور۔
نظر اٹھا کے جو دیکھا تو روبرو تھا مہر — گماں ہوا کہ حسیں آگیا کوئی اٹھ کر۔
وہ تاب حسن کہ اک بار دیکھ کر اس کو — نہ دیکھے شوق کی اترا کے پھر کبھی بھی نظر!
ادھر یہ حال کہ محو نظارۂ دلکش — ادھر ادائیں وہ ڈھاتی تھیں جو ستم دلبر۔
میں اس نظارے سے اب تک ہوا نہ تھا فارغ — کہ دم زدن میں کچھ عالم ہی اور آیا نظر۔
وہ یہ کہ قبلہ کی جانب سے اٹھ کے ابر سیہ — دھواں سا چھا گیا آکر تمام منظر پر۔
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تن میں جان جو ڈالے — وہ بھوری بدلیاں پانی کی چھائیں گردوں پر!
وہ رک کے ایک جگہ ان کا جی بڑھا دینا — مسلنا پاؤں میں اپنے وہ ان کا چل چل کر!
وہ مسکرانا غضب انکا اک نظر بھر کے — گرانا بجلیاں عاشق کے قلب مضطر پر!
وہ انکا جوش میں آ آکے پیار کو جھکنا — وہ سبزہ رنگوں کا اٹھنا امنگ ہو ہو کر!
وہ دھوم نہر پہ مرغابیوں کی تازوں کی — وہ اڑ کے بگلوں کا چھا جانا نیلے گردوں پر!
وہ لے نے چھوٹے پرندوں کی نغمہ پیرائی — نکلنا آپے سے باہر وہ ان کا تن تن کر!

—{نذیر حسین احمد (انبالوی)}

یہ دیکھ سانپ سا چھاتی پہ پھر گیا میری — کسی نے چہرے پہ حسرت کا مَل دیا پوڈر ۔

ہے مختصر کہ وہیں رہ گیا کھڑا کا کھڑا — مثالِ پیکرِ تصویر بے خبر ہو کر ۔

کہ دفعتہً یہ صدا میرے کان میں آئی — "لو آؤ سیر کرائیں میاں کھڑے ہو کدھر"

جو دیکھتا ہوں تو اک ماہ وش پری چہرہ — قریب مجھ سے مرے سامنے کرم گستر،

کشیدہ قامت و نوخیز و شوخ مستِ شباب — غزال چشم و سمن بو و گل رُخ و گلبر!

نہ بات اس کی لگاوٹ سے کوئی بھی خالی — فسوں وہ اُس کا کرے موم دل جو ہو پتھر؛

بس آپ خود ہی سمجھ لیں جہاں یہ باتیں ہوں — وہاں سے جائے بھلا کوئی کس طرح بچکر ۔

میں اُس کے دیکھ کے انداز محوِ حیرت تھا — کہ ایک مردِ معمر کہیں سے آئے اُدھر؛

وہ یا تو سیدھے چلے اپنی دُھن میں جاتے تھے — مجھے یہاں جو کھڑا دیکھا آ گئے مُڑ کر ۔

پکارا ہو کے مخاطب کہ او میاں گبھرو! — "سنو کہاں سے تم آئے یہاں کھڑے ہو کدھر؟"

میں اُن کی وضعِ بزرگانہ دیکھ کر بولا — "کہ قبلہ یوں ہی چلا آیا تھا ذرا میں ادھر"؛

مگر جناب! وہ اِک کائیاں جہاندیدہ — نہ بھانپ جاتے بھلا میرا مدعا کیونکر!

تو آپ کہتے ہیں کیا؟ خیر ہو گیا معلوم — پہ یہ تو کہئے کہ کچھ ہے بسنت کی بھی خبر؟

"یہ جن پہ آپ کھڑے ہیں نثار ہونے کو — ان ہی کا نام ہے غفلت وہ یہ ہیں خوش پیکر؛

اُن ہی کے بھائی ہیں عیش و تکلف و آرام — ان ہی کو رہتی ہے تذلیل مرد مدِ نظر

اُن ہی کی سمجھو عنایت کہ قتلِ عام ہوا — وگرنہ ہند میں آجاتا نادری لشکر؟

اُن ہی کے سبز قدم نے تباہ کی دِلّی — ان ہی نے کر دیا بے تاج و تخت شاہ ظفر ۔

یہ وہ بلا ہیں جہاں انکی کچھ بھی پاؤں جمے — مٹا دیا اُسے یوں جیسے لکھنؤ کا گھر ۔

غرض عزیز نہ تم ان کے پھیر میں پڑنا — یہ ناگ وہ ہیں نہیں جنکی کاٹے کا منتر ۔"

میں مارے بارِ ندامت کے تھا مرا جاتا — بڑے میاں نے کیا ختم اپنا پر لکچر ۔

نگاہ غور سے دیکھا تو بات تھی سچی — اسی لئے ہوا اپنے بھی دل پہ اُس کا اثر

۳۲۷

یہ خواب دیکھ رہا تھا بڑا مزے سے میں　　کہ دفعۃً جو کھلی آنکھ ہو گئی تھی سحر
لو ہم نے آج سے غفلت کو خیرباد کہا　　کبھی نہ جائینگے پھر اُس کی بھولی صورت پر

{ سیّد علمدار حسین (بنوڑی) }

آغازِ محبّت

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے　　دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا　　اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے
حُسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے　　اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں　　یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حُسن و اُلفت کی نرالی شوخیاں　　التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے
جلوہ ہستی فزائے دلربا کی لذتیں　　بیخودی ہائے دلِ مخمورِ حیرت کے مزے
یاد ہیں وہ آرزو ہائے لقائے یار میں　　کشمکش ہائے شبِ تاریک فرقت کے مزے
شوقِ عرضِ آرزو کے وہ نرالے ولولے　　فکرِ مضموں ہائے عنوانِ کتابت کے مزے
یاد ہیں وہ انتظارِ نامۂ محبوب میں　　بیقراری ہائے ناکامِ طبیعت کے مزے
صحّتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار　　جس میں اُٹھی بارہا اُنکی عیادت کے مزے
وہ زمانہ بھی غرض تھا کیا زمانہ لطف کا　　دل کو جب حاصل تھے سارے عیش و عشرت کے مزے

لیک حسرت آہ! اس تغافل کیش کے بیداد نے
بدلے سب محرومیوں سے وہ محبّت کے مزے

حسرت موہانی (از علیگڈھ کالج)

پاکھال

(بزبانِ حال)

دہقان کی داستان کو جو پچھلے دنوں مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ جناب نواب عزیز جنگ بہادر وظیفہ خوار سرکار نظام اور مالک و مہتمم عزیز الاخبار نے اپنے بیش قیمت پرچہ میں درج فرماکر مجھے فرمائش بھیجی کہ حیدرآباد دکن میں ایک نہایت وسیع تالاب پاکھال نام ہے اس کی نسبت بھی چند اشعار عرض خدمت کروں۔ ہر چند کہ کثرت کار سرکار کے باعث عدیم الفرصتی اور علاوہ ازاں اپنی کم بضاعتی کے مقابلہ میں اس فرمایش کی تعمیل متعسر تھی۔ مگر ایک نادیدہ مشتاق معزز مہربان قدرشناس کے ارشاد کی بجاآوری کے خیال نے مجبور کیا۔ اور میں نے چند اشعار نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کئے نواب صاحب ممدوح نے اشعار مذکور کو اپنے رسالہ اجلد ۲ - نمبر ۱۲ میں درج فرماکر مجھے مشکور کیا اور زیادہ احسان یہ فرمایا کہ ان میں اپنی طرف سے بھی کچھ ایزادی فرمائی۔ مگر اس وقت ان اشعار کی صورت کچھ نامکمل سی تھی۔ اب خیال آیا کہ کسی قدر ترمیم تضمین اور تکمیل کے ساتھ ہدیہ ناظرین مخزن کروں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ نواب صاحب کے ایزاد شدہ اشعار بھی اس میں شامل ہیں۔ اور انکے اشعار کے دونوں مصرعوں کے درمیان حرف "ن" لکھدیا گیا ہے۔

(سراج الدین احمد)

ہزاروں ہی عجوبے ہیں نمائش گاہ نیچر میں
عناصر میں زمیں میں آسماں میں بحر میں بر میں

خیابانِ گلستاں میں ہے حسن و عشق کا چرچا
گلوں میں بلبلوں میں قمریوں میں اور صنوبر میں

بجز قرآں نہ پاؤ گے کہیں تم نور کا سورہ
عطارد میں قمر میں مشتری میں مہرِ انور میں

سخن کی آبداری اور طبیعت کی روانی سے
قلم غوطہ زناں اپنا ہے گویا فالِ گوہر میں

دوات اپنی کا ہر قطرہ ہے رشکِ چشمۂ حیواں
تلاشِ آبِ ظلمات اک جنوں تھا شعر کے سر میں

اسی سے بوستانِ سعدیِ شیراز ہے تازہ — اسی سے جان ہے ابتک گلستانِ نظمِ ہومر[1] میں
دکن میں آج جو قدرِ سخن ہے وہ کہاں ہوگی — عرب میں چین میں لنڈن میں واشنگٹن میں پیرس میں
مذاقِ انبساطِ عہدِ آصف جاہِ خامس نے — بھرا پانی دہانِ دورِ کسریٰ و سکندر میں
تفاوت کفر و دیں ہے حیدرآباد اور پیرس میں — شنید و دید کا ہے فرق آصف اور پطر[2] میں
بہشت آنجا است کازارے نباشد کہتے ہیں شاعر — دکن میں لیک ہے عیش و طرب کی دھوم گھر گھر میں

مطلع ثانی

بہشتی ہل پر پکھال لیجاتا ہے گھر گھر میں — میں گاواں ارض کی پکھال ہوں آصف کے لشکر میں
اگر کچھ فخر ہے خلدِ بریں پر حوضِ کوثر کو — تو میں ہوں پائیگاہ یادگارِ عہدِ اکبر میں
میں زندوں کا ہوں مامن اور وہ مُردوں کا مشرب ہے — حیات و موت کا ہے فرق مجھ میں اور کوثر میں
شعاعِ مہر و مہ سے لطف ہے جو میرے پانی میں — کہاں وہ خوبیاں ہیں آبِ ظلماتِ سکندر میں
فلک ہے آئینہ دار اور صبا ہے اپنی مشاطہ — یہ لہریں ہیں کہاں زلفِ پریشاں کے مقدر میں
لطافت میں ہے میری ہمسری کا اسکو گو دعویٰ — طراوت پر کہاں یہ چشمۂ خورشیدِ خاور میں
سُنے ہیں جب سے چرچے اسنے میرے آبِ شیریں کے — سمندر کے ہزاروں شور ہیں سینہ میں اور سر میں
مری دریا دلی پر ہے کہ رشک آرد شود کافر — کہ پلتے ہیں ہزاروں مرغ اور ماہی مری تہ میں
اُٹھا اے پیرِ مغاں آتش کدہ سے اور مجھے تو چ اب — خدارا فرق کر جاں سوز میں اور جان پرور میں
عیاں ہے عیبِ شعلی اور عیبِ عین جوئی سے — تفاوت صنعِ حق میں اور ایجادِ سکندر میں
مری دریا دلی ثابت ہے دریا مجھ سے جاری ہیں ن — مرے پانی کا شہرہ ہے وقارآباد و بیدر میں
مرے پانی سے شیراں ہر کنارے کے عادی ہیں ن — قضا لاتی ہے انکو گھیر کر ناکے کے چکر میں
شکایت اپنی بے فیضی کی سنتا ہوں عزیز[3] سے — کہ فرماتی ہیں حضرت اپنے چندیں مصرعۂ تر میں

[1] یونان کا ایک فصیح شاعر زمانہ قدیم -
[2] Peter the Great -
[3] نواب عزیز جنگ بہادر بیرسٹر کا اشارہ ہے جن کے دو شعر آگے درج ہیں -

مری ان خوبیوں سے کچھ نہیں حاصل زراعت کو ن مرے پانی کا پانا ہے نہیں اس کے مقدر میں
ہتی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل ن کہ آبِ چشمۂ حیواں نہ تھا بخت سکندر میں
مگر سوروباں جھیلیں ہزاروں گرمیاں دیکھیں اُڑا ئیں ابخرے بن کر فضائے چرخِ اخضر میں
بنا میں ابر و باراں مدتوں خونِ جگر پی کر لپیٹا روئے عالم میں ذرے رحمت کی چادر میں
شہادت میرے ہی خوں کی عیاں ہے آبِ گوہر سے عرق ریزی ہی میری ہے نہاں شاخِ گلِ تر میں
مری برکت سے تازہ کشتِ امید عزیزاں ہے برستی ہے یہ دولت میری ہر سرکار کے گھر میں
مصیبت جھیلنا ہونا فنا اور فیض پہنچانا یہ فیاضی کہاں ہے نقشِ سنگ و آبِ گوہر میں

مطلعِ ثالث

غلط سودا سماتا ہے خیال و وہم شاعر میں رسائی ہے مگر کوتہ سخن سنجوں کے جوہر میں
جو فرماتے ہیں حضرت نقش پانی پر نہیں جمتا نہیں رکھتی وہ شاید دیدۂ عبرت نگر سر میں
ہزاروں نقش ہیں مرقوم میری سطحِ صافی پر سبق ملتے ہیں مجھ سے سنگ دل اہلِ ہنر کو میں
جو سچ پوچھو تو پانی پر ہی نقش صنعِ قدرت میں صدف میں لعل ہیں گر اور انساں بطنِ مادر میں
سکوں اور کنجِ عزلت میں صفا مجھکو ہوئی حاصل نہیں بحرِ رواں کی طرح غرق آبِ مکدر میں
تو ناداں سیکھ لے مجھ سے ہر اک سانچہ میں ڈھل جانا صراحی میں سبو میں جام میں شیشہ میں ساغر میں
نہ ہونا آشنائے بحر انس اس آشنا کے ساتھ جو ساحل دیکھ کشتی کو پھنسا جاتا ہے لنگر میں
کسی کے عیب گر دیکھو تو دھو ڈالو خموشی سے حصولِ آبرو کی میل ہے گر طبعِ انور میں
اُٹھا و سینہ و دل سے بھی پیچ گردِ کلفت کو سبق یہ مجھ سے پڑھ لو صورتِ آبِ مطہر میں
مصفا ہی نہیں کرتا ہے مجھ میں آب بیرونی میں خود ہی فرق کرتا ہوں مصفا اور مکدر میں
مخالف کی غضب کی آگ کے آگے ہو نانی کہاں ہے یوں کتابِ داستانِ آبرو دانہ گوہر میں
دمِ تیغِ رواں آبِ رواں پر بلبلا بولا کہ بربادی کا باعث ہے ہوائے دنیوی سر میں
سراج الدین احمد کا میں ممنون ہوں کہ آج اس نے زبانِ حال کی تشریح کی ہے نظم و نثر میں

سراج الدین احمد

خُدا کی حمد

(ٹھیٹ ہندی میں)

وُہ ہے اِک آپ روپ آپ آنے والا — کروڑوں رُوپ پھر دکھلانے والا
اُسی کی ہاں سے جگ جی اُٹھنے والا — اُسی کی جی سے جی جی جانے والا
جو ہو کچھ اور چھور اُس کا تو سمجھو — وُہ ہے ہر ایک کو چکرانے والا
اُسی کے جی سے نو جی اور دس بُدھ — وُہی نو دس یہ ہے گنوانے والا
اُسی سے تت اُسی سے کال کا جال — وُہی سب جال ہے پھیلانے والا
وُہی آکاس کو آکاس بانی — دَیا سے اپنی ہے سکھلانے والا
وُہی آکاس پر آکاس گنگا — ہے جل سے جوت کے چھلکانیوالا
جلاتا ہے وُہی سورج کا دیپک — وُہی ہے ہر دِیا اُکسانے والا
اُسی سے ہے یہ امبر جگمگی چھت — سُرگ کو ہے وہی چمکانے والا
وُہی آکاس اگن گولے کے منہہ سے — چھتوں پر آگ ہے برسانے والا
اُسی سے سب گگن کے ہیں یہ تارے — وُہی ہے بجلیاں تڑپانے والا
اُسی سے ہے گھٹا کا یہ گھٹا ٹوپ — وُہی سب چھاونی ہے چھانے والا
یہ گلیوں گلیوں سبزے کا بچھونا — وُہی ہے گھانس سے بچھوانیوالا
اُسی سے ہیں سمندر میں یہ لہریں — وُہی پانی کو ہے لہرانے والا
اُسی نے بھر دیئے ہیں ساری جل تھل — سمندر ہے وُہی چھلکانے والا
وُہی آکاس میں چھوٹے دلوں کو — انوکھے ڈھب سے ہے لڑانے والا
وُہی اس ڈھنگ سے پانچوں تتوں کو — لڑا کر ہے گلے ملوانے والا
اُسی سے ہے اندھیرا اور اُجالا — وُہی دونوں کا ہے جھمکانے والا

کہیں پھیلانے والا رات کا ہے ‏ کہیں ہے دن وہ کر دکھلانے والا
کہیں سکھ کے لئے ہے چھاؤں ٹھنڈی ‏ کہیں ہے دھوپ پھر چمکانے والا
بنا کر پتلیاں آنکھوں کے گھر میں ‏ ہے رسیلا اک نئی دکھلانے والا
بنا کر سونگھنے کو ناک منہ پر ‏ ڈالی باس ہے پھیلانے والا
کھلا کر باورے ہونٹوں کی کلیاں ‏ ہے چڑیا چپ کی چہکانے والا
سہانی سی بٹھا کانوں میں چوکی ‏ ٹکوریں سوہنی سنوانے والا
لگا کر پانو میں پھرتی کے پہیے ‏ سمندر تک رتھیں دوڑانے والا
چھپا ہے آپ اپنی آڑ میں وہ ‏ ہے آپ ہی ڈھونڈنے ڈھونڈوانے والا

نہ بیٹھو تھک کے ڈھونڈے جاؤ شہباز
جو پاتا ہے تو یوں ہی پانے والا

(پروفیسر شہباز)

تعریف سخن

ہمارے کرم فرما جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا سید حسن ضیا صاحب امروہی المعروف بہ حسان الہند کے کلام میں سے سخن کی تعریف میں مندرجہ ذیل بند انتخاب کر کے بھیجتے ہیں۔ جو انہوں نے خاص کوشش سے حاصل کئے ہیں:۔

ہاں طبع ضیا کھینچ ذرا پائے سخن ‏ ہر سخن رس کو ہر اک دم ہو تمنائے سخن
اہل معنی کو دکھا دے رخ سلمائے سخن ‏ سب کی آنکھوں میں پھرے صورت زیبائے سخن

نکہت نظم سے سب بزم معنبر ہو جائے
ساری مجلس گل مضموں سے معطر ہو جائے

یہ وہ محبوب ہے جو روح کو ہاں دیتا ہے ‏ یہ وہ اسلوب ہے جو جسم کو شان دیتا ہے

یہ وُہ مرغوب ہے جو دل کو ... دیتا ہے | یہ وہ مطلوب ہے جو تاب و تواں د

غازۂ رُوئے حسیناں ہے سجاوٹ اسکی

رونقِ مہرِ درخشاں ہے بناوٹ اسکی

یہ وُہ معشوقہ ہے جسکی کہ فصاحت ہے کنیز | اس کی ہم مثل زمانہ میں نہیں ہے کو

نقدِ معنے ہے پرکھ لیتے ہیں ارباب تمیز | مثلِ یوسف ہے زلیخائے فصاحت

یہی گل زینتِ دامانِ سخندانی ہے

گو غبار اس میں ہو تو بھی خطِ ریحانی ہے

یہ وُہ بلبل ہے اُگلتا ہے جو گلہائے مراد | اس کی خواہش میں بنے ہیں سخن

یہ وُہ ہے جس نے کیا دیدۂ مردم پر صاد | یہ وُہ ہے جس نے ہر اک سرو بنا

اس نے مشہورِ زمانہ کیا عشقِ بلبل

یہ وُہ ہے جس نے فسانہ کیا عشقِ بلبل

ہے بیاضِ ... رُخِ رعنائے سخن | غازۂ رُوئے سحر چہرۂ زیبائے

غیرتِ مشکِ ختن زلفِ دل آرائے سخن | دلبرِ شام ادا گیسوئے لیلائے

یہ وُہ شاہد ہے کہ جو طاق ہے محبوبی میں

ہر ادا شہرۂ آفاق ہے اسلوبی میں

فیض اس باغ کا جاری ہے جہاں میں یکسر | یہاں سے لیجاتے ہیں گلچیں ہزاروں

کوئی لیجاتا ہے گل اور کوئی گلبن کوئی زر | کم نہیں ہوتے ہیں اس باغ کے غنچے

نہیں آئی ہے خزاں جس پہ یہ گلشن ہے

حشر تک اس پہ اسی طرح نیا جوبن ہے

... سنا ہیں ہے اسی گل کا وطن | اس کا دنیائے ملاحت میں بلاغت کا

دمبدم بڑھتی ہے زینت ... کی چمن | اس کی منظر کی ہے عالم میں فصاحت چا

یہ چمن بادِ فصاحت سے ہرا رہتا ہے
نونہالانِ مضامیں سے بھرا رہتا ہے

اِسکے سر پر ہے زمانہ میں عجب فیض کا تاج
تاجدارانِ بلاغت سے بھی لیتا ہے باج

جس پہ ہے اُس کا کرم ہو گئی گویا معراج
اس کے الطاف کا دُنیا میں ہر اک ہے محتاج

مملکتِ ذہن کی - کی زیرِ حکومت دم میں
حکمراں ملکِ ذہن کا ہے یہ ہی عالم میں

...کر تخت زباں پہ ہے بصد کر و فر
وزرا اس کے ہیں نطق و خرد نیک سیر

چھپ...ل اور طبع محافظ ہیں ایدھر اودھر
فکر و اندیشہ و ادراک ہیں اس کا لشکر

فہم ہے اس کا علمدارِ قلم رایت ہے
خلق ہیں جس کے پھریرے بندھی نصرت ہے

(سید حسن ضیا امروہوی)

کچکول

...ودے میں اُونچ نیچ نہ سوجھی جہان کی
پُوچھے زمین کی تو کہے آسمان کی"

(حامد علیخاں ملقب بیرسٹرایٹ لا) —— (نواب احسان علیخاں الملقب ظفر یاب الدولہ)

...شت دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
سیکڑوں کوس نہیں صورتِ انساں پیدا

(اسد) —— (آتش)

...قدر آنکھیں میری محوِ تجلی ہو گئیں
پتلیاں پتھرا کے آخر سنگِ موسیٰ ہو گئیں

(...) —— (...)

یہ ...تحہ پڑھنے بھی آئے قبرِ آتش پر نہ یار
دم ہی من میں ہاے الفت اس قدر جاتا رہا

(...) (...)

پڑھ ... دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

(ر) (ر)

سلامت رہو کیا لگائی ہے ٹھوکر بنا ہی نہ تھا جیسے مدفن کسی کا

(جہانگیر) (امیر)

یہ درمیاں جو مہینوں بگاڑ رہتا ہے وہی کشش ہے نہیں کچھ شریر ہم بھی ہیں

(ر) (مصحفی)

سمجھتا ہی نہیں کیا درد ہے بسمل کے پہلو میں دل اپنا کس طرح رکھدے کوئی قاتل کے پہلو میں

(ر) (ر)

جسے کام پڑتا ہے آکر بتوں سے وہ ہوجاتا ہے اک خدائی سے واقف

اجی توبہ! رندوں کا استاد سمجھو جہانگیر اور پارسائی سے واقف

(ر)

اس جوانی پہ لڑکپن کی ادا باقی ہے اتنی آنکھوں میں وہی شرم و حیا باقی ہے

خوب تحقیق کیا ہمنے تو پایا آخر جو ہے فانی ہے بس اک ذاتِ خدا باقی ہے

تب ہی تب دل میں جہانگیر بھرے ہیں پرکر ایک گوشہ سا بس اب بہر خدا باقی ہے

(ر)

کسی نے وعدہ کیا ہے شب کا یقین بھی ہمکو آگیا ہے الٰہی کس وقت شام ہوگی الٰہی کب دن تمام ہوگا

(حضرت خیر دربھنگوی) (شاہ اکبر داناپوری)

عہد پیری نے بھلایا دو چلینا کودنا ہائے طفلی کھیلنا کھانا اچھلنا کودنا

(ر) (ر)

جنوں پسند ہمیں چلیاؤں ہی ہو لونگی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

(ر) (ر)

ذکر ہے سب کو چار سو تیری
بحر و بر ... ہے گفتگو تیری

دل میں رہتی ہے آرزو تیری
صورت آنکھوں کے روبرو تیری

برچھیاں سی جگر پہ چلتی ہیں
کس غضب کی ہے گفتگو تیری

کیوں بگولا نہ بنتی خاک مری
بعد مردن تھی جستجو تیری

کیوں نہ دل کو لگاؤں سینے سے
اس میں رہتی ہے آرزو تیری

میری آنکھوں میں میرے دل میں ہے تو
مجھ کو پھر کیوں ہو جستجو تیری

لاکھ ڈھونڈا نہ تجھ کو پایا مگر
خبریں ملتی ہیں کو بکو تیری

(نور الدین عنبر۔ از کشمیر)

راز اُس کے عشق کا عالم میں افشا ہو گیا
میں تو رسوا ہو چکا تھا وُہ بھی رسوا ہو گیا

قامت موزوں کی مدت میں کمی میں نے جو کی
لیکے برچھی سرو بستاں مجھ پہ سیدھا ہو گیا

وہ چلے جس دم قیامت نے لئے بڑھ کر قدم
فتنے اُٹھ اُٹھ کر پکارے حشر برپا ہو گیا

مر گیا عاشق تمہارا پائی منہ مانگی مُراد
دل میں خوش ہو تم تمہارا ابتو چاہا ہو گیا

مانع دیدار تھا اُس روئے روشن پر نقاب
جب وُہ بے پردہ ہوئے آنکھوں کا پردہ ہو گیا

کیا نوید جانفزا تھی تیرے آنیکی خبر
یک بیک حال مریض عشق اچھا ہو گیا

ہو گئی غم کھانے کی عادت ہوئی مرتے اے فلک
کوئی غم کھانا بھی کیا منہ کا نوالا ہو گیا

کان دھر کر وُہ مری فریاد کو سننے لگے
بخت اتنا تو رسا اپنا نصیبا ہو گیا

فیض حاصل ہے جناب رُوح سے اُستاد کا
بخت تیری نظم کا رتبہ دو بالا ہو گیا

(سید امیر حیدر بخت)

نہیں خاطر میں لاتا وہ میرے آزردہ ہونے کو
اُسے رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کم نکلتا ہے

شہیدی سے نہیں واقف ہیں ہم ہاں اتنا واقف ہیں
کوئی راتوں کو یاں کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

(سید بشیر احمد) (شہیدؔ)

عرضِ احوال کر گیا نہ سمجھے — کیا کہا میں نے آپ کا کیا سمجھے
وعدہ کرنا بھی اس خوشی کے ساتھ — ہم تو انکار کو بھی اک ادا سمجھے
ان کنایوں کو اپنے تم سمجھو — بات وہ ہے جو دوسرا سمجھے
تو پرائی سمجھ پہ کام نہ کر — رمزِ اُلفت کو غیر کیا سمجھے

(شاہ محمد نذیر غازی پوری) — (داغ)

تیرے جور و ستم اُٹھائیں ہم — یہ کلیجا کہاں سے لائیں ہم
جی میں ہے اب وہاں نہ جائیں ہم — دل کی طاقت بھی آزمائیں ہم
نالے کرتے نہیں یہ اُلفت میں — باندھتے ہیں تیری ہوائیں ہم
اے لبِ یار کیا ترے ہوتے — لبِ ساغر کو منہ لگائیں ہم
دل میں تم دل ہے سینہ سے خود گم — کوئی پوچھے تو کیا بتائیں ہم

(محمد عبدالرحمٰن) — (امیر)

غزل نعتیہ

ہر چند کہ ہم نے آج تک نعتیہ کلام درجِ مخزن نہیں کیا۔ مگر غزل مندرجہ ذیل کے حق میں استثنا کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ ایک معزز خاتون کا کلام ہے۔ شیخ غلام قادر صاحب گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن کی اہلیہ اقبال بیگم صاحبہ ترک بذریعہ حضرت گرامی کے یہ غزل ارسال فرماتے ہیں:—

لے چل اے آہ رسا اب تو مدینے مجھ کو — اپنے روضے پہ بلایا ہے نبی نے مجھ کو
میرے ہر مو سے نکلتی ہے صدائے لبیک — کوئی کیا جانے پکارا ہے کسی نے مجھ کو
غمِ حسنین میں روتی ہوں زہے میرے نصیب — دونوں آنکھوں سے بینگے دو سفینے مجھ کو
جلوہ دکھلایا مجھے آتشِ موسیٰ کی قسم — سیدِ ہاشمی و مطلبی نے مجھ کو
خواب میں اپنے ہیں قرباں کہ دو قرآن دیے — ہاتھ سے اپنے رسولِ عربی نے مجھ کو
میں بناؤں گی اسی نعت کو تعویذِ کفن — زندگی بخشی ہے مرنے کی خوشی نے مجھ کو
سرخرو ہوں گی محشر میں بڑی اے ترک — اُمتی کہہ کے رسولِ عربی نے مجھ کو

[تین] نقشے

[ا]یک روپیہ میں

[ح]جاز ریلوے کے متعلق اخبارات میں بہت [چھپ ر]ہا ہے اور اس لین کی تیاری کی خبریں [ر]وز مشتہر ہوتی رہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناظرین [کو خ]اص دلچسپی اس ریلوے کے حالات اور [ان] بستیوں سے جن میں ہو کر وہ ریل گذرے گی پیدا [ہو گئی] ہے۔ اور مسلمانوں کو خصوصاً بسبب مذہبی [تعلق ک]ے اور بھی زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے [پیسہ ا]یجنسی لاہور نے تین نقشے اپنے [پر]یس میں بہ نہایت کوشش اور صفائی [چھپو]ائے ہیں۔ ایک میں یورپی روم کی تمام [ر]یلیں دکھائی گئی ہیں۔ اور ساتھ ہی [م]قامات جو ان پر واقع ہیں۔ دوسرے [ا]یشیائی روم کی ریلیں۔ اور تیسرے میں [حج]از ریلوے۔ اچھے کاغذ پر چھپے ہیں اور [ا]صل بھی تینوں کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ [...]ن ایک سٹ منگوائیں۔ اور دیکھیں اور اگر [...]و تو احباب تک بھی پہنچائیں۔

[المشتہر]

[کا]رخانہ ملک محمد دین پیسہ ایجنسی مالک و ایڈیٹر لاہور

بچوں کا اخبار

کارخانہ پیسہ اخبار سے یہ نیا ماہوار رسالہ بچوں کے خاص مطالعہ کے لئے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پہلا نمبر ماہ مئی میں شائع ہو چکا ہے۔ معزز ہمعصروں نے پہلے پرچہ کو نگاہ پسندیدگی سے دیکھا ہے۔ اور متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ کہ بچوں کے اخبار کی ملک میں بہت ضرورت تھی۔ کوشش کی جائیگی کہ اسے ہر پہلو سے بچوں کے لئے دلچسپ بنایا جائے اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ تعلیمی فائدہ بھی حاصل ہو۔ افسران محکمہ تعلیم نے بھی اس ارادہ سے بہت ہمدردی ظاہر فرمائی ہے۔ مگر اس کی پوری کامیابی ملک اور اہل ملک کی قدردانی پر منحصر ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی کی عمدگی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحہ کا (۱۸×۲۲) کی تقطیع پر ہے۔ اور اس کی قیمت سالانہ پیشگی عہ معہ محصول ڈاک ہے۔ درخواستیں بنام مشتہر آنی چاہئیں +

المشتہر

مینیجر

[illegible] — لاہور

شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کو حکام کی زبان میں حکام وقت تک پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ یوروپین افسر اس کے خریداروں میں ہیں اور جو باتیں اس اخبار میں درج ہوں یقیناً حکام کی نظر سے گذرتی ہیں۔ ترتیب مضامین یہ ہے صفحہ اول (تار کی خبریں) کوئی دلچسپ مختصر کہانی یا مضمون جو عموماً یوروپین نامہ نگاروں کے قلم سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ اردو اخبارات کے ضروری مضامین کے ترجمے۔ معاصرین کی رائے کے خلاصے صفحہ دوم (لیڈنگ آرٹیکل) صفحہ سوم (ایڈیٹوریل نوٹ) صفحہ چہارم (ضروری ملکی خبریں خطوط وغیرہ) صفحہ پنجم اسلامی دنیا کی خبریں۔ ممالک مغربی و شمالی کی خبریں وغیرہ) صفحہ ششم (انتخاب) قیمت سالانہ [illegible]

غلام رسول بی۔ اے منیجر

دیوان حبیب

جناب سید کاظم صاحب حبیب کنتوری یادگار [illegible] کے کلام معجز نظام کے منجملہ صرف پہلا دیوان [illegible] کے مطبع شمسی میں طبع ہوکر ہاتھوں ہاتھ بک [illegible] اس قابل ہے کہ شائقین سخن اسے حرز جان اور اپنے کتب خانہ کی رونق اس دیوان سے [illegible] اس میں غزل کا رنگ بدل دیا گیا ہے اور غزل [illegible] وہ کام لیا گیا ہے جس کی ضروریات زمانہ دکھلا [illegible] متقاضی ہیں۔ اس پر زبان ٹکسالی اور بندش [illegible] بدیع و بیان کی پابندیوں کا ملتزمانہ پہلو لئے [illegible] استادان لکھنؤ کو یاد دلاتی ہیں۔ قیمت فی جلد [illegible] مصنف سے معرفت مشتہران طلب کیا جائے

المشتہران

سید محمد ضامن و سید محمد [illegible]

حیدرآباد دکن۔ کنٹہ گوشہ محل۔ بنگلہ جناب مولوی محمد کاظم صاحب کنتوری

کالستھ سماچار — یہ ماہواری میگزین انگریزی میں الہ آباد سے زیر ایڈیٹری مسٹر [illegible] [illegible] آب و تاب اور قابلیت سے شائع ہوتا ہے۔ ملک بھر کے اخبارات نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ [illegible] ہوتا ہے جو عام پسند ہوں اور ہر قوم کے لائق مضمون نگار اپنے انگریزی مضمو[ن] [illegible] اس پر خوبی یہ کہ قیمت [illegible] اس ہر گز [illegible] — **منیجر کالستھ [illegible]**